سرما ۱۹۹۵

آج

ترتیب: اجمل کمال

خصوصی شمارہ: ہندی کہانیاں

امرکانت — رام کمار — اُشا پریم ودا — راجیندر یادو

کاشی ناتھ سنگھ — موہن راکیش — بھیشم ساہنی

نرمل ورما — شانی — اصغر وجاہت — منّو بھنڈاری

راجی سیٹھ — سودیش دیپک — گووند مِشر — عبدل بسم اللہ

شری لال شُکل — گیان رنجن — اُدے پرکاش

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

آج

شمارہ ۱۸: سرما ۱۹۹۵

جنوری- مارچ ۱۹۹۵

مینیجنگ ایڈیٹر

زینت حسام

اہتمام

آج کی کتابیں

بی ۱۴۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

طباعت

ریجو کیشنل پریس

پاکستان چوک، کراچی

رابطے کے لیے پتا

اے ۱۶، سفاری پارکس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

فون: ۸۱۱۳۴۷۴

بیرونِ ملک خریداری کے لیے پتا

محمد عمر میمن

۵۴۱۷، ریجنٹ اسٹریٹ، میڈیسن، وسکانسن ۵۳۷۰۵، یو ایس اے

Scanned with CamScanner

"آج" کے شمارہ ۱۳ (بہار ۱۹۹۳) میں عربی کہانیوں کے انتخاب کی پہلی جلد اور شمارہ ۱۵ (سرما/ بہار ۱۹۹۴) میں فارسی کہانیوں کے انتخاب کا پہلا حصہ پیش کیا گیا تھا۔ موجودہ شمارہ ہندی کہانیوں کے انتخاب کی پہلی جلد ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے اس منصوبے کا پہلا مرحلہ مکمل ہو جاتا ہے جس کا مقصد اردو سے لسانی قربت رکھنے والی زبانوں میں مختصر کہانی کے ارتقا کا جائزہ لینا اور "آج" کے پڑھنے والوں کے لیے ان زبانوں میں لکھی گئی کہانیوں کا ایک کم و بیش نمائندہ انتخاب تیار کرنا ہے۔ اس منصوبے کے اگلے مراحل آئندہ شماروں میں آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔

اردو سے لسانی قربت کی بات ہندی کے سلسلے میں ایک منفرد اہمیت رکھتی ہے۔ یوں تو یہ بات لسانیات کے دائرے تک محدود نہیں رہتی، بہت سے اور مسئلوں تک جا پہنچتی ہے، لیکن یہاں ان مسئلوں سے بحث نہیں۔ جس پہلو کی طرف اشارہ مقصود ہے وہ یہ ہے کہ، مروّج رسم خط کو چھوڑ کر، اردو اور ہندی آپس میں اتنا کچھ مشترک رکھتی ہیں کہ ہندی کے کسی متن کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے ترجمے کا لفظ استعمال کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس شمارے میں شامل کہانیوں کو اردو میں منتقل کرنے میں اوسطاً پانچ فیصد الفاظ تبدیل کیے گئے ہیں۔ یہ عمل بڑی حد تک محض رسمِ خط کی تبدیلی پر مشتمل ہے، جس کے لیے اردو میں اگر کوئی لفظ ہے تو وہ میرے علم میں نہیں، اس لیے اسے ترجمہ کہے بغیر چارہ نہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو اس انتخاب میں شامل ہندی کہانیوں کا مطالعہ ادبی ہی نہیں، لسانی تجربہ بھی ہے۔ اردو اور ہندی دونوں کی قواعد کی بنیاد کھڑی بولی کی قواعد پر ہے؛ اور بہت سے الفاظ کے علاوہ اردو کے بنیادی افعال تمام کے تمام وہی ہیں جو ہندی میں بھی موجود ہیں۔ البتہ جب نئی اصطلاحات وضع کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو ہندی کو سنسکرت کی مدد لینی پڑتی ہے اور اردو کو فارسی اور عربی کی۔

اردو اور ہندی فکشن اپنے درمیان ایک اور بھی قدر مشترک رکھتے ہیں: دونوں کا آغاز پریم چند کی تحریروں سے ہوا تھا۔ اگرچہ ہندی میں بھی اُن سے پہلے کی لکھی ہوئی چند کہانیاں تلاش کر لی گئی ہیں اور اردو میں بھی پریم چند کو اُن کے مقام سے محروم کرنے کی سرکاری اور غیر سرکاری کوششیں جاری رہی ہیں، لیکن اس تمام جستجو سے جس بات پر ذرا بھی فرق نہیں پڑا وہ یہ ہے کہ پریم چند اب بھی اردو اور ہندی کے پہلے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ اور ہر بڑے ادیب کی طرح انھوں نے دونوں زبانوں میں فکشن کی روایت کے خدوخال متعیّن کیے ہیں۔

ہندی کہانیوں کا مطالعہ، اور اُن کا اردو فکشن سے موازنہ، اس نقطۂ نظر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہ روایت ہندی میں کس طرح پھلی پھولی اور اُن کے بعد آنے والے افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے تخلیقی جوہر کو کام میں لا کر اس روایت میں کیسے اضافے کیے۔

اس شمارے کے لیے ہندی کہانیوں کے متن حاصل کرنے میں ڈاکٹر نریندر ناتھ کالیا، ڈاکٹر شمیم حنفی، عبدالمغنی، عبدل بسم اللہ اور زیبا علوی کا تعاون ہمیں حاصل رہا جس کے لیے ان کا شکریہ واجب ہے۔

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

ترتیب

امر کانت

۹

ڈپٹی کلکٹری

رام کمار

۲۸

چیری کے پیڑ

اُشا پریم وَدا

۳۶

واپسی

راجیندر یادَو

۴۴

جہاں لکشمی قید ہے

کاشی ناتھ سنگھ

۶۲

صدی کا سب سے بڑا آدمی

Scanned with CamScanner

موہن راکیش

۷۴

ملبے کا مالک

بھیشم ساہنی

۸۳

وانگ چُو

۱۰۱

امرتسر آ گیا ہے

نرمل ورما

۱۱۳

ایک دن کا مہمان

شانی

۱۳۱

دوزخی

اصغر وجاہت

۱۴۳

کیک

Scanned with CamScanner

منو بھنڈاری

۱۵۷

ترشنکو

راجی سیٹھ

۱۷۱

آمنے سامنے

سودیش دیپک

۱۷۹

تماشا

گووند مشر

۱۸۹

پھانس

عبدل بسم اللہ

۱۹۵

ربائی

۲۴۱

آدھا پھول آدھا شو

Scanned with CamScanner

شری لال شکل

۲۰۸

فساد

گیان رنجن

۲۱۶

کھٹنا

اُدے پرکاش

۲۲۵

رام سجیون کی پریم کہانی

۲۴۱

ترنچہ

***

۲۵۸

لکھنے والوں کا تعارف

Scanned with CamScanner

امر کانت

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

ڈپٹی کلکٹری

شکل دیپ بابو لگ بھگ ایک گھنٹے بعد واپس لوٹے۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے انھوں نے بیٹھک میں جھانکا۔ کوئی مؤکل نہیں تھا، اور محرّر صاحب بھی غائب تھے۔ وہ اپنے کمرے کے سامنے بیٹھک میں کھڑے ہو کر بندر کی طرح آنکھیں مٹکا مٹکا کر دیکھنے لگے۔ ان کی بیوی جمنا چوکے کے پاس پیڑھی پر بیٹھی ہونٹ پر ہونٹ دبائے ترکاری کاٹ رہی تھی۔ وہ دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے اپنی بیوی کے پاس چلے گئے۔ اُن کے چہرے پر ایک غیر معمولی اطمینان، اعتماد اور ایک قسم کے جوش کے آثار غالب تھے۔ گھنٹا بھر پہلے ایسی بات نہیں تھی۔

بات اس طرح شروع ہوئی۔ صبح شکل دیپ بابو دتون کلی کر کے اپنے کمرے میں بیٹھے ہی تھے کہ جمنا نے ایک طشتری میں دو جلیبیاں ناشتے کے لیے لا کر رکھ دیں۔ وہ بغیر کچھ بولے ناشتا کرنے لگے۔

جمنا پہلے تو ایک آدھ منٹ چپ رہی۔ پھر شوہر کی طرف اُچٹتی نظر سے دیکھتے ہوئے اس نے بات چھیڑی۔ "دو تین دن سے ببوا بہت اُداس رہتے ہیں۔"

"کیا؟" سر اُٹھا کر شکل دیپ بابو نے پوچھا اور اُن کی بھنویں تن گئیں۔ جمنا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، "کل بولے اِس سالی ڈپٹی کلکٹری کی بہت سی جگہیں ہیں، مگر بابوجی سے کہتے ڈر لگ رہا ہے۔ کہہ رہے تھے دو چار دن میں فیس بھیجنے کی تاریخ نکل جائے گی۔"

شکل دیپ بابو کا بڑا لڑکا نارائن گھر میں ببوا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اُس کی عمر لگ بھگ چوبیس سال تھی۔ پچھلے تین چار سال سے بہت سے امتحانوں میں بیٹھنے، ایم ایل اے لوگوں کے دروازوں کے چکر لگانے، اور اَور بھی اُلٹے سیدھے فن استعمال کرنے کے باوجود اُس کو اب تک کوئی نوکری نہیں ملی تھی۔

Scanned with CamScanner

دو مرتبہ ڈپٹی کلکٹری کے امتحان میں بھی وہ بیٹھ چکا تھا، پر بد قسمتی! اب ایک موقع اُسے اَور ملنا تھا جس کو وہ گنوانا نہیں چاہتا تھا، اور اسے یقین تھا کہ چوں کہ جگہیں کافی ہیں اور اِس مرتبہ وہ جی جان لگا کر محنت کرے گا، اس لیے بہت ممکن ہے کہ وہ لے لیا جائے۔

شکل دیپ بابو مختار تھے، لیکن اِدھر ڈیڑھ دو سال سے مختاری کی گاڑی اُن سے چلائے نہیں چل رہی تھی۔ بڑھاپے کی وجہ سے نہ ان کی آواز میں وہ زور رہا تھا نہ جسم میں وہ طاقت اور نہ چال میں وہ اکڑ، اس لیے وکل ان کے یہاں کم ہی پہنچتے تھے۔ کچھ تو آ کر بھڑک جاتے تھے۔ اس حالت میں وہ رام کا نام لے کر کچہری جاتے، کبھی کبھار کچھ پا جاتے جس سے دو وقت کی روٹی چل جاتی۔

جمنا کی بات سن کر وہ ایک دم بگڑ گئے۔ غصے سے ان کا منھ بن گیا اور وہ سر کو جھٹکتے ہوئے، کھسکھنے کتے کی طرح بولے، "تو میں کیا کروں؟ میں تو حیران ہو گیا ہوں۔ تم لوگ میری جان لینے پر تُلے ہوئے ہو۔ صاف صاف سن لو۔ میں تین بار کہتا ہوں، مجھ سے نہیں ہو گا، مجھ سے نہیں ہو گا، مجھ سے نہیں ہو گا!"

جمنا کچھ نہ بولی، کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ شوہر کا غصے میں آنا قدرتی بات ہے۔

شکل دیپ بابو ایک دو لمحے خاموش رہے، پھر داہنے ہاتھ کو اوپر نیچے نچاتے ہوئے بولے، "پھر اس کی گارنٹی کیا ہے کہ بابو صاحب اس مرتبہ لے ہی لیے جائیں گے؟ معمولی اے جی آفس کی کلرکی میں تو پوچھے نہیں گئے، ڈپٹی کلکٹری میں کون پوچھے گا؟ آپ میں کیا خوبی ہے صاحب، کہ آپ ڈپٹی کلکٹر ہو ہی جائیں گے؟ تھرڈ کلاس بی اے آپ ہیں، چوبیس گھنٹے مٹر گشتی آپ کرتے ہیں، دن رات سگریٹ آپ پھونکتے ہیں، آپ میں کون سے سُرخاب کے پر لگے ہیں؟ بڑے بڑے بہے جائیں، گڑیا پوچھے کتنی تھاہ! پھر مقدر مقدر کی بات ہوتی ہے۔ بھائی سمجھ لو تمہارے مقدر میں نوکری لکھی ہی نہیں۔ ارے ہاں، اگر کتے کاشی جانے لگے تو بانڈیاں کون چاٹے گا؟ ڈپٹی کلکٹری، ڈپٹی کلکٹری! سچ پوچھو تو ڈپٹی کلکٹری کے نام سے مجھے نفرت ہو گئی ہے۔" اور ہونٹ لٹک گئے۔

جمنا نے اب دھیمے لہجے میں ان کی بات رد کی۔ "ایسی بدفال منھ سے نہیں نکالتے ہیں۔ ہمارے لڑکے میں کون سی ایسی خرابی ہے؟ لاکھوں میں ایک ہے۔ صبر کی سَودھار! میرا تو دل کہتا ہے بہو ضرور لے لیے جائیں گے۔ پھر پہلے ہی بھوک پیاس میں پلا ہے۔ ماں باپ کا سکھ تو اُس نے جانا ہی نہیں۔ اگر یہ بھی نہ ہوا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ یوں ہی نہ معلوم کیوں اداس رہتا ہے۔ ٹھیک سے کھاتا پیتا نہیں، ٹھیک سے بولتا نہیں۔ پہلے کی طرح گاتا گنگناتا بھی نہیں۔ نہ معلوم میرے لڑکے کو کیا ہو گیا ہے!" وہ دوسری طرف منھ کر کے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

جمنا کو روتا ہوا دیکھ کر شکل دیپ بابو آپے سے باہر ہو گئے۔ غصے اور طنز سے منھ چڑاتے ہوئے بولے، "لڑکا ہے تو لے کر چاٹو! ساری خرافات کی جڑ تم ہی ہو، اَور کوئی نہیں! تم مجھے زندہ رہنے دینا نہیں چاہتیں۔ جس دن میری جان نکلے گی اُسی دن تمہارا کلیجا ٹھنڈا ہو گا۔" وہ ہانپنے لگے۔

انھوں نے اتنی بے رحمی سے جمنا پر جو الزام لگایا اُسے وہ سہہ نہ سکی۔ روتی ہوئی بولی، "اچھا ٹھیک

ہے، اگر میں ساری خرافات کی جڑ ہوں تو میں کمینی کی بچی جو آج سے کوئی بات۔۔۔" رونے کی وجہ سے وہ آگے نہ بول سکی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

شکل دیپ بابو کچھ نہیں بولے۔ وہیں بیٹھے رہے۔ منہ اُن کا تنا ہوا تھا اور گردن ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ ایک آدھ منٹ تک اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد وہ زمین پر سے اخبار کے ایک پھٹے پرانے ٹکڑے کو اٹھا کر اس محویت سے پڑھنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

کوئی پندرہ بیس منٹ تک وہ ایسے ہی پڑھتے رہے۔ پھر اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے لنگی کی طرح لپٹی دھوتی کو کھول کر ٹھیک سے پہن لیا اور اوپر سے اپنا پارسی کوٹ ڈال لیا جو کچھ میلا ہو گیا تھا اور جس میں دو پیوند بھی لگے تھے، اور پرانا پمپ شُو پہن، ہاتھ چھڑی لے، ایک دو بار کھانس کر باہر نکل گئے۔

شوہر کی باتوں سے جمنا کے دل کو گہری چوٹ پہنچی تھی۔ شکل دیپ بابو کو باہر جاتے اس نے دیکھا، پر کچھ نہ بولی۔ وہ منہ پھُلائے گھر کے اُلٹے سیدھے کام کرتی رہی۔ اور ایک گھنٹے بعد جب شکل دیپ بابو باہر سے لوٹ کر اس کے پاس آ کھڑے ہوئے تب بھی وہ کچھ نہ بولی، چپ چاپ ترکاری کاٹتی رہی۔

شکل دیپ بابو نے کھانس کر کہا، "سنتی ہو، یہ ڈیڑھ سو روپے رکھ لو۔ قریب سو روپے ببوا کی فیس میں لگیں گے، اور پچاس روپے الگ رکھ دینا، شاید کوئی اَور کام آ پڑے۔"

جمنا نے ہاتھ بڑھا کر روپے تو ضرور لے لیے، پر اَب بھی وہ کچھ نہیں بولی۔

لیکن شکل دیپ بابو بہت خوش تھے، اور انھوں نے جوشیلی آواز میں کہا، "سو روپے ببوا کو دے دینا۔ آج ہی فیس بھیج دیں۔ ہوں گے، ضرور ہوں گے۔ ببوا ڈپٹی کلکٹر ضرور ہوں گے۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ نہ لیے جائیں۔ لڑکے کے ذہن میں کوئی خرابی تھوڑے ہی ہے۔ رام رام! کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ نارائن جی اِس بار بھگوان کی کرپا سے ڈپٹی کلکٹر ضرور بنیں گے۔"

جمنا اب بھی چپ رہی اور روپوں کو ٹرنک میں رکھنے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شکل دیپ بابو اپنے کمرے کی طرف لَوٹ پڑے۔ مگر کچھ دور جا کر پھر پلٹے اور جس کمرے میں جمنا گئی تھی اُس کے دروازے کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے اور جمنا کو ٹرنک میں روپے رکھتے دیکھتے رہے۔ پھر بولے، "غلطی کسی کی نہیں، سارا دوش تو میرا ہے۔ دیکھو نا، میں باپ ہو کر کہتا ہوں کہ بیٹا نکما ہے! نہیں نہیں، ساری خرافات کی جڑیں ہی ہوں، اَور کوئی نہیں۔"

ایک دو پل وہ کھڑے رہے لیکن پھر بھی جمنا نے کوئی جواب نہیں دیا تو کمرے میں جا کر کپڑے بدلنے لگے۔

نارائن نے اسی دن ڈپٹی کلکٹری کی فیس اور فارم بھیج دیے۔

دوسرے دن عادت کے خلاف صبح صبح شکل دیپ بابو کی نیند اُچٹ گئی۔ وہ ہڑبڑا کر آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر آ کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ گھر کے سبھی لوگ نیند میں ڈوبے تھے۔ سوئے ہوئے لوگوں کی سانسوں کی آواز اور مچھروں کی بھُن بھُن سنائی دے رہی تھی۔ ابھی چاروں طرف

Scanned with CamScanner

اندھیرا تھا لیکن باہر کے کمرے سے دھیمی روشنی آ رہی تھی۔ شکل دیپ بابو چونک پڑے اور دبے پیروں کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔

ان کی عمر پچاس سے اوپر ہو گی۔ گورے، ناٹے اور دبلے پتلے آدمی تھے۔ ان کے چہرے پر ان گنت جھریوں کا جال بچھا ہوا تھا اور بانہوں اور گردن کی کھال جھول گئی تھی۔

دروازے کے پاس پہنچ کر انھوں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر، ہونٹ دبا کر، کمرے کے اندر جھانکا۔ ان کا لڑکا نارائن میز پر رکھی لالٹین کے سامنے سر جھکائے پڑھنے میں محو تھا۔

شکل دیپ بابو کچھ دیر تک حیرانی سے اپنے بیٹے کو دیکھتے رہے جیسے کوئی خوش کن راز انھوں نے اچانک پا لیا ہو۔ پھر وہ چپ چاپ، دھیرے سے پیچھے ہٹ گئے۔ وہ وہیں کھڑے ہو کر ذرا مسکرائے، پھر دبے پاؤں دھیرے دھیرے واپس لوٹے اور اپنے کمرے کے سامنے، کنارے کھڑے ہو کر خوشی سے آسمان کو دیکھنے لگے۔

ان کی عادت چھ ساڑھے چھ بجے سے پہلے اٹھنے کی نہیں تھی، لیکن آج اٹھ گئے تھے تو دل اندر سے ناخوش نہیں تھا۔ آسمان پر تارے اب بھی چمکے ہوئے تھے اور باہر کے پیڑوں کو چھوتی ہوئی، آنگن میں نہ معلوم کس طرف سے آتی ہوئی ہوا فرحت بخش لگ رہی تھی۔ وہ دوبارہ مسکرا پڑے اور دھیرے سے پھسپھسائے، "چلو، اچھا ہی ہے۔"

اور اچانک اُن میں نہ معلوم کہاں کا جوش بھر گیا۔ انھوں نے اسی وقت منھ ہاتھ دھویا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد بھی اندھیرا ہی رہا تو بالٹی میں پانی بھر کر غسل خانے لے جا کر نہانے لگے۔ نہا کر جب وہ باہر نکلے تو ان کے جسم میں ایک عجیب سی چستی اور ایک ناقابلِ بیان، اندر سے پیدا ہونے والا جوش تھا۔

اگرچہ انھوں نے اپنے سبھی کام چپ چاپ کرنے کی کوشش کی تھی، پھر بھی تھوڑی جسمانی کمزوری کی وجہ سے کچھ کھٹ پٹ ہو ہی گئی جس سے ان کی بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ جمنا کو پہلے تو چور وور کا شک ہوا، لیکن اس نے جھٹ پٹ جب آ کر دیکھا تو اسے تعجب ہوا۔ شکل دیپ بابو آنگن میں کھڑے آسمان کو تاک رہے تھے۔

جمنا نے فکر مندی کے لہجے میں کہا، "اتنی جلدی نہانے کی کیا ضرورت تھی؟ اتنے سویرے تو کبھی نہیں اٹھا جاتا تھا۔ کچھ ہوا ہوا گیا تو؟"

شکل دیپ بابو جھینپ گئے۔ جھوٹی ہنسی ہنستے ہوئے بولے، "دھیرے دھیرے بولو بھئی، ببوا پڑھ رہے ہیں۔"

جمنا بگڑ گئی۔ "دھیرے دھیرے کیوں بولوں؟ اسی لچھن سے پچھلے سال بیمار پڑ جایا گیا تھا۔"

شکل دیپ بابو کو گمان ہوا کہ اس طرح بات چیت جاری رکھنے سے تکرار بڑھ جائے گی، شور شرابا ہو گا، اس لیے انھوں نے بیوی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پیچھے گھوم گئے اور چپ چاپ اپنے کمرے

Scanned with CamScanner

میں آ کر رامائن کا پاٹھ کرنے لگے۔

پوجا ختم کر کے جب وہ اٹھے تو اُجالا ہو گیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئے۔ گھر کے بڑے لوگ تو جاگ گئے تھے پر بچے ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔

جمنا رسوئی میں کچھ کھٹر پٹر کر رہی تھی۔ شکل دیپ بابو تاڑ گئے۔ وہ رسوئی کے دروازے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر بیوی کو تسلے میں چاول نکالتے ہوئے دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد انھوں نے سوال کیا، "نارائن کی اماں، آج کل تمھارا پوجا پاٹھ نہیں ہوتا کیا؟" اور جھینپ کر مسکرائے۔

شکل دیپ بابو پریاگ میں بسنے والے ایک سادھو بابا سے، جو ایک بار گھومتے گھامتے یہاں آ پہنچے تھے، مرید ہو گئے تھے۔ امید ان کو یہ تھی کہ گھر کی عورتیں بھی انھیں کی مرید ہو جائیں گی، لیکن جیسا کہا جاتا ہے، عورت ذات کا کوئی بھروسا نہیں۔ انھوں نے دور کے رشتے کی ایک بوڑھی چاچی کے کہنے سے متاثر ہو کر چپکے سے رادھاسوامی دھرم کی چاکری قبول کر لی۔

شکل دیپ بابو اس سے پہلے رادھاسوامی دھرمیوں سے نہ صرف خفا رہتے تھے بلکہ ان پر وقت بے وقت تنقید بھی کرتے رہتے تھے۔ ان باتوں پر عورتیں کبھی کبھی واویلا بھی کرتی تھیں۔ اس لیے آج جب شکل دیپ بابو نے پوجا پاٹھ کی بات کی تو جمنا نے خیال کیا کہ وہ طنز کر رہے ہیں۔ اس نے بھی جواباً کہا، "ہم لوگوں کو پوجا پاٹھ سے کیا مطلب، ہم کو تو نرک میں جانا ہے۔ جن کو سورگ میں جانا ہو وہ کریں!"

"لو بگڑ گئیں،" شکل دیپ بابو دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے جھٹ سے بولے۔ "ارے، میں مذاق تھوڑے ہی کر رہا تھا۔ میں بڑی غلطی پر تھا۔ رادھاسوامی تو بڑے پہنچے ہوئے دیوتا ہیں۔"

جمنا کو رادھاسوامی کو دیوتا کہا جانا بہت برا لگا اور وہ تنک کر بولی، "رادھاسوامی کو دیوتا کہتے ہیں؟ وہ تو پرم پتا پرمیشور ہیں۔ اُن کا لوک سب سے اوپر ہے، اس سے نیچے ہی برھما، وشنو اور مہیش کے لوک ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، لیکن کچھ پوجا پاٹھ بھی کرو گی؟ سنتے ہیں سچے دل سے رادھاسوامی کی پوجا کرنے سے سبھی دعائیں پوری ہوتی ہیں۔" شکل دیپ بابو جواب دے کر کانپتے ہونٹوں سے مسکرانے لگے۔

جمنا نے دوبارہ ان کو ٹوکا۔ "اس میں دکھاوا تھوڑے ہی ہوتا ہے۔ دل میں نام لے لیا جاتا ہے، سبھی کام بن جاتے ہیں اور مرنے کے بعد آتما پرم پتا سے جا ملتی ہے۔ پھر چوراسی نہیں بھگتنا پڑتا۔"

شکل دیپ بابو نے بڑے جوش سے کہا، "ٹھیک ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔ ذرا اور سویرے اٹھ کر نام لے لیا کرو۔ صبح نہانے سے طبیعت دن بھر صاف رہتی ہے۔ کل سے تم بھی شروع کر دو۔ میں تو بد قسمت تھا، میری آنکھیں آج تک بند رہیں۔ خیر کوئی بات نہیں، اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ کل سے تم بھی صبح چار بجے اٹھ جانا۔"

Scanned with CamScanner

ان کو ڈر تھا کہ جمنا کہیں ان کی تجویز کی مخالفت نہ کرے، اس لیے اتنا کہنے کے بعد وہ مڑے اور وہاں سے چل دیے۔ لیکن اچانک کچھ یاد کر کے وہ لوٹ پڑے۔

پاس آ کر انھوں نے بیوی سے مسکراتے ہوئے پوچھا، "ببوا کے لیے ناشتے کا کیا انتظام کرو گی؟"

"جو روز ہوتا ہے وہی ہو گا، اور کیا ہو گا!" جمنا نے انتہائی مایوس کن انداز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، لیکن آج حلوا کیوں نہیں بنا لیتیں؟ گھر کا بنا سامان اچھا ہوتا ہے۔ اور کچھ میوے منگا لو۔"

"حلوے کے لیے گھی نہیں ہے۔ پھر اتنے پیسے کہاں ہیں؟" جمنا نے مجبوری ظاہر کی۔

"وہ پچاس روپے تو بچے ہیں نا؟ اسی میں سے خرچ کرو۔ یہ اَن پانی کا جنم! لڑکے کو پینے کھانے کو نہیں ملے گا تو وہ امتحان کیا دے گا؟ روپے کی فکر مت کرو۔ ابھی میں زندہ ہوں!" اتنا کہہ کر شکل دیپ بابو قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ وہاں سے ہٹتے ہوئے وہ بیوی کو یہ بھی ہدایت کرتے گئے، "ایک بات اَور کرو، تم لڑکے لوگوں کو ڈانٹ کر کہہ دینا کہ باہر کے کمرے میں بازار نہ لگائیں، نہیں تو مار پڑے گی۔ ہاں، پڑھنے میں حرج ہو گا۔ دوسری بات یہ کہ ببوا سے کہہ دینا، وہ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطمینان سے پڑھیں۔ میں باہر صحن میں بیٹھا کروں گا۔"

شکل دیپ بابو سویرے ایک ڈیڑھ گھنٹے باہر کے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ وہاں وہ موکلوں کا انتظار کرتے اور انھیں سمجھاتے بجھاتے۔

اس دن سے وہ سچ مچ ہی مکان کے باہر پیپل کے پیڑ کے نیچے، جہاں کافی سایہ رہتا تھا، ایک میز اور کرسیاں لگا کر بیٹھ گئے۔ جان پہچان کے لوگ وہاں سے گزرے تو انھیں وہاں دیکھ کر حیران ہوئے۔ جب سڑک سے گزرتے ہوئے بہن لال پیش کار نے ان سے پوچھا، "بھائی صاحب، آج کیا بات ہے؟" تو انھوں نے زور سے چلّا کر کہا، "بھئی اندر بڑی گرمی ہے۔" انھوں نے جوکر کی طرح اپنا منھ بنا لیا اور آخر میں قہقہہ مار کر ہنس پڑے جیسے کوئی بڑا مذاق کیا ہو۔

شام کو جہاں روز وہ پہلے ہی سے کچہری سے آ جاتے تھے، اس دن دیر سے لوٹے۔ انھوں نے بیوی کے ہاتھ میں چار روپے تو دیے ہی، ساتھ دو سیب اور پانچ قینچی سگریٹ کے پیکٹ بھی بڑھا دیے۔

"سگریٹ کیا ہو گی؟" جمنا نے تعجب سے پوچھا۔

"تمھارے لیے ہیں،" شکل دیپ بابو نے دھیرے سے کہا اور دوسری طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ لیکن ان کا چہرہ شرم سے کچھ تمتما گیا۔

جمنا نے ماتھے پر کی ساڑی کو نیچے کھینچتے ہوئے کہا، "کبھی سگریٹ پی بھی ہے کہ آج ہی پیوں گی؟ اس عمر میں مذاق کرتے شرم نہیں آتی؟"

شکل دیپ بابو کچھ بولے نہیں اور تھوڑا مسکرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ پھر کچھ سنجیدہ ہو کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا، "ببوا کو دے دینا،" اور فوراً وہاں سے چلتے بنے۔

Scanned with CamScanner

جمنا بھونچکی ہو کر کچھ دیر ان کو دیکھتی رہی، کیوں کہ آج سے پہلے تو وہ یہی دیکھتی آ رہی تھی کہ نارائن کی سگریٹ نوشی کے وہ سخت خلاف رہے ہیں اور اس معاملے پر اُسے کئی بار ڈانٹ پھٹکار بھی چکے ہیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ یہ کہہ کر مسکرا دی کہ "عقل ماری گئی ہے۔"

نارائن دن بھر پڑھنے لکھنے کے بعد ٹہلنے گیا ہوا تھا۔

شکل دیپ بابو جلدی سے کپڑے بدل کر، ہاتھ میں جھاڑو لے، باہر کے کمرے میں جا پہنچے۔ انھوں نے جلدی جلدی اچھی طرح کمرے کو جھاڑا بُہارا، اس کے بعد نارائن کی میز کو صاف کیا اور میز پوش کو زور زور سے کئی بار جھاڑ کر صفائی کے ساتھ اس پر بچھا دیا۔ آخر میں نارائن کی چارپائی پر پڑے بستر کو کھول کر اس کی ایک ایک چیز کو ٹھیک سے تہ کر کر کے رکھنے لگے۔

اتنے میں جمنا نے آ کر دیکھا تو دھیمے لہجے میں بولی، "کچہری سے آنے پر یہی کام رہ گیا ہے کیا؟ بچھونا روز بچھ ہی جاتا ہے اور کمرے کی صفائی بھی مہرن کر ہی دیتی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں اپنی خوشی سے کر رہا ہوں۔ کوئی زبردستی تھوڑے ہی ہے۔"

شکل دیپ بابو کے چہرے پر ہلکی سی جھینپ کے آثار اُبھر آئے اور وہ اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے ایسی آواز میں بولے جیسے انھوں نے اچانک ہی یہ کام شروع کر دیا تھا، اور جب اتنا کر ہی لیا ہے تو بیچ میں چھوڑنے سے کیا فائدہ، پورا ہی کر لیں۔

کچہری سے واپسی پر ان کا یہ معمول تھا کہ تھوڑا بہت کچھ کھا پی کر پلنگ پر لیٹ جاتے تھے۔ اکثر ان کو نیند آ جاتی تھی اور وہ تقریباً آٹھ بجے تک سوتے رہتے تھے۔ اگر نیند نہ آتی تو بھی وہ اسی طرح چپ چاپ پڑے رہتے تھے۔

"ناشتا تیار ہے،" یہ کہہ کر جمنا وہاں سے چلی گئی۔

شکل دیپ بابو کمرے کو جما جم کرنے، بچھونے لگانے اور کرسیوں کو ترتیب سے سجانے کے بعد آنگن میں آ کر کھڑے ہو گئے اور بلاوجہ ہنستے ہوئے بولے، "اپنا کام سدا اپنے ہاتھ سے کرنا چاہیے۔ نوکروں کا کیا ٹھیک۔" لیکن ان کی بات کا نہ تو کسی نے کوئی نوٹس لیا اور نہ کسی نے کوئی جواب دیا۔

دھیرے دھیرے دن بیتتے گئے اور نارائن سخت محنت کرتا رہا۔

کچھ دنوں سے شکل دیپ بابو روز شام کو گھر سے کوئی ایک میل دور شوجی کے مندر بھی جانے لگے تھے۔ وہ بہت چلتا ہوا مندر تھا۔ اس میں عقیدت مندوں کی بہت بھیڑ ہوتی تھی۔ کچہری سے لوٹنے کے بعد وہ نارائن کے کمرے کو جھاڑتے بُہارتے، آخر میں ناشتا کر کے مندر کے لیے روانہ ہو جاتے۔ مندر میں ایک ڈیڑھ گھنٹا رہتے اور تقریباً دس بجے گھر لوٹتے۔

ایک دن جب وہ مندر سے لوٹے تو ساڑھے دس بج گئے تھے۔ انھوں نے دبے پاؤں نارائن کے کمرے میں جھانک کر دیکھا، اور اسے پڑھتے دیکھ کر دبی دبی مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔

Scanned with CamScanner

پھر وہ اندر اپنے کمرے میں آ کر، چھڑی دیوار سے ٹکا، ہاتھ منہ دھو، چوکے میں کھانے کے لیے جا کر بیٹھ گئے۔

بیوی نے کھانا سامنے دھر دیا۔ شکل دیپ بابو نے نوالہ چباتے ہوئے پوچھا، "ببوا کو میوے دے دیے تھے؟"

وہ آج شام جب کچہری سے لوٹے تھے تو میوے لیتے آئے تھے۔ انھوں نے میوے کو بیوی کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسے صرف نارائن ہی کو دینا، اور کسی کو نہیں۔

جمنا کو جھپکی آ رہی تھی مگر اس نے شوہر کی بات سن لی۔ چونک کر بولی، "ہاں! میوہ ٹرنک میں رکھ دیا تھا کہ ببوا گھوم کر آئیں گے تو دے دوں گی۔ پر لڑکے تو بھوت بنے ہوئے ہیں، کونا کونا، آتر آتر، سبھی جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ ٹُن ٹُن نے کہیں سے دیکھ لیا اور اس نے سارا کا سارا کھا ڈالا۔"

ٹُن ٹُن شکل دیپ بابو کا سب سے چھوٹا، لگ بھگ بارہ تیرہ سال کا، بے حد شریر لڑکا تھا۔

"کیوں؟" شکل دیپ بابو چلا پڑے۔ ان کا منہ کھُل گیا تھا اور زبان پر روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔

جمنا کچھ نہ بولی۔

اب شکل دیپ بابو نے غصّے سے بیوی کا منہ چڑاتے ہوئے کہا، "کھا گیا! تم کو کیوں نہیں کھا گیا؟ تم لوگوں کے کھانے کے لیے لایا تھا کیا؟ کھا گیا! کھا گیا!"

جمنا بھی تنک اٹھی۔ "تو کیا ہو گیا؟ کبھی پھل پھول، میوہ مصری تو ان کو نصیب ہوتی نہیں ہے۔ بچارے بھُوسا چوٹی جو کچھ بھی انھیں میسّر ہے اسی پر صبر کرتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے خرید کر کبھی کچھ دیا بھی تو نہیں گیا۔ بچہ ہی تو ہے، دل مچل گیا ہو گا سو کھا لیا۔ پھر میں نے اُسے بہت مارا بھی۔ اب جان تو نہیں لے لیں گے۔"

"اچھا تو کھاؤ تم اور تمھارے لڑکے! خوب مزے میں کھاؤ! ایسے کھانے پر لعنت!" وہ غصّے سے تھر تھر کانپتے ہوئے چلا پڑے اور پھر چوکے سے اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔

جمنا خوف، غصّے اور ذلّت سے رونے لگی۔ اس نے بھی کھانا نہیں کھایا اور چارپائی پر منہ ڈھانپ کر پڑ رہی۔

دوسرے دن صبح بھی شکل دیپ بابو کا غصّہ ٹھنڈا نہیں ہوا اور انھوں نے نہانے دھونے اور پوجا کرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جب ٹُن ٹُن جاگا تو اسے اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا کہ اس نے میوہ کیوں کھایا۔ جب اس کو کوئی جواب نہ سُوجھا اور وہ سہم کر اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا تو شکل دیپ بابو نے کئی تمانچے اسے جڑ دیے۔

ڈپٹی کلکٹری کا امتحان الہ آباد میں ہونے والا تھا اور وہاں روانہ ہونے کے دن آ گئے تھے۔ اس بیچ نارائن نے اتنی کڑی محنت کی تھی کہ سبھی لوگ حیران تھے۔ وہ اٹھارہ انیس گھنٹے تک پڑھتا رہتا۔ اس کی

Scanned with CamScanner

پڑھائی میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہونے پائی۔ اسے بس پڑھنا تھا۔ اس کو کمرہ صاف ملتا، بچھونا بچھا ملتا، دونوں وقت گاؤں کے اصلی گھی کے ساتھ دال بھات، سبزی روٹی ملتی۔ جسم کی طاقت اور دماغ کی تازگی کو بنائے رکھنے کے لیے ناشتے میں سویرے حلوا، دودھ، اور شام کو میوے یا پھل۔ اَور تو اَور لڑکے کی طبیعت اُچاٹ نہ ہو، اس لیے سگریٹ کا بھی اچھا بھلا انتظام۔ جب سگریٹ کے پیکٹ ختم ہوتے تو جمنا اس کے پاس اَور پیکٹ رکھ جاتی۔

جس دن نارائن کو الہ آباد جانا تھا، شکل دیپ بابو کی چھٹی تھی اور وہ سویرے ہی گھومنے نکل گئے۔ وہ کچھ دیر تک کمپنی باغ میں گھومتے رہے، پھر وہاں طبیعت نہ لگی تو ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں بھی دل نہ لگا تو اپنے قریبی دوست کیلاش بہاری، مختار، کے گھر چلے گئے۔ وہاں بہت دیر تک گپیں لڑاتے رہے، اور جب گاڑی کا وقت قریب آیا تو جلدی جلدی گھر کی طرف چل دیے۔

گاڑی نو بجے نکلتی تھی۔ جمنا اور نارائن کی بیوی نے تڑکے اٹھ کر کھانا پکا لیا تھا۔ نارائن نے کھانا کھایا اور سب کو پرنام کر کے اسٹیشن کے لیے چل پڑا۔ شکل دیپ بابو بھی ساتھ گئے۔

نارائن کو رخصت کرنے کے لیے اس کے چار پانچ دوست بھی اسٹیشن پہنچے تھے۔ جب تک گاڑی نہیں آئی، نارائن پلیٹ فارم پر ان دوستوں سے باتیں کرتا رہا۔ شکل دیپ بابو الگ کھڑے ادھر اُدھر اس طرح دیکھتے رہے جیسے نارائن سے ان کا تعارف ہی نہ ہو۔ اور جب گاڑی آئی اور نارائن اپنے دوستوں اور باپ کی مدد سے سامان کے ساتھ گاڑی پر چڑھ گیا تو شکل دیپ بابو وہاں سے دھیرے دھیرے کھسک گئے اور وھیلر کے بک اسٹال پر جا کر کھڑے ہو گئے۔

بک اسٹال کا آدمی جان پہچان کا تھا۔ اس نے سلام کر کے پوچھا، "کہیے مختار صاحب، آج کیسے آنا ہوا؟"

شکل دیپ بابو نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے جواب دیا، "لڑکا الہ آباد جا رہا ہے ڈپٹی کلکٹری کا امتحان دینے۔ شام تک پہنچ جائے گا۔ ڈیوڑھے درجے کے پاس جو ڈبّا ہے نا، اسی میں ہے۔ نیچے جو چار پانچ لڑکے کھڑے ہیں وہ اس کے دوست ہیں۔ سوچا، بھئی ہم لوگ بوڑھے ٹھہرے، لڑکے امتحان وِمتحان کی بات کر رہے ہوں گے، اس لیے اِدھر چلا آیا۔" ان کی آنکھیں کچھ خوشی اور ایک عجیب مزاحیہ انداز سے سکڑ گئیں۔

وہاں وہ تھوڑی دیر تک رہے۔ اس کے بعد جا کر گھڑی میں وقت دیکھا، کچھ دیر تار گھر کے باہر تار بابو کو کھٹر پٹر کرتے دیکھتے رہے اور پھر وہاں سے ہٹ کر ریل گاڑیوں کے آنے جانے کا ٹائم ٹیبل پڑھنے لگے۔ لیکن ان کا دھیان گاڑی ہی کی طرف لگا ہوا تھا، کیوں کہ جب ٹرین چھوٹنے کی گھنٹی بجی تو وہ وہاں سے بھاگ کر نارائن کے دوستوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔

نارائن نے جب ان کو دیکھا تو اس نے جھٹ پٹ نیچے اتر کر ان کے پیر چھوئے۔

"خوش رہو بیٹا، بھگوان تمھیں کامیاب کرے!" انھوں نے لڑکے سے بُدبُدا کر کہا اور دوسری

Scanned with CamScanner

طرف دیکھنے لگے۔

نارائن بیٹھ گیا اور اب گاڑی کھلنے ہی والی تھی۔ اچانک شکل دیپ بابو کا داہنا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں گیا۔ انھوں نے جیب سے کوئی چیز باہر نکال لی، اور وہ کچھ آگے بھی بڑھے، لیکن پھر نہ معلوم کیا سوچ کر رک گئے۔ ان کا چہرہ کچھ تمتما سا گیا اور گھبراہٹ میں وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

گاڑی نے آخری سیٹی دی تو شکل دیپ بابو چونک پڑے۔ انھوں نے جیب سے وہ چیز نکال کر مٹھی میں باندھ لی اور اسے نارائن کو دینے دوڑ پڑے۔

وہ کم زور اور بوڑھے آدمی تھے، اس لیے ان سے تیز تو کیا دوڑا جاتا، وہ پیروں میں پھرتی لانے کے لیے اپنے ہاتھوں کو اس طرح بھینچ رہے تھے جیسے کوئی روگی، مریل لڑکا اپنے ساتھیوں کے بیچ کھیل کود کے دوران کوئی ہلکی پھلکی شرارت کرنے کے بعد تیزی سے دوڑنے کے لیے گردن جھکا کر ہاتھوں کو چکر دیتا ہوا بھاگ رہا ہو۔ ان کے پیر تھپ تھپ کی آواز کے ساتھ پلیٹ فارم پر گر رہے تھے اور ان کی ان حرکات کا ان کے چہرے پر کوئی خاص قسم کا اثر نہیں تھا، بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہیں۔ پلیٹ فارم پر جمع لوگوں کی توجہ ان کی طرف ہوئی۔ کچھ لوگوں نے موج میں آ کر زور سے للکارا، کچھ لوگوں نے کلکاریاں ماریں اور کچھ نے ان کے اس مضحکہ خیز انداز کو دیکھ کر زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ لیکن ان کی خوش قسمتی ہی کہی جائے کہ گاڑی ابھی کھلی ہی تھی اور زیادہ اسپیڈ میں نہیں آئی تھی۔ وہ اپنی اس مضحکہ خیز کوشش میں کامیاب ہو گئے اور انھوں نے ڈبے کے سامنے پہنچ کر بے چینی اور فکرمندی کے آثار لیے ہوئے ڈبے سے سر نکال کر جھانکتے ہوئے نارائن کے ہاتھ میں ایک پُڑیا دیتے ہوئے کہا، "بیٹا، اسے عقیدت کے ساتھ کھا لینا۔ بھگوان شنکر کا پرساد ہے۔"

پُڑیا میں کچھ بتاشے تھے جو انھوں نے کل شام کو شوجی کو چڑھائے تھے، اور اسے پتا نہیں کیوں نارائن کو دینا بھول گئے تھے۔

نارائن کے دوست یہ منظر دیکھ کر مسکرانے لگے، اور جب وہ قریب آئے تو ایک لڑکے نے پوچھا، "بابوجی، کیا بات تھی؟ ہم سے کہہ دیتے۔"

شکل دیپ بابو یہ کہہ کر کہ "کوئی بات نہیں، کچھ روپے تھے، سوچا میں خود ہی دے دوں"، تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

امتحان ختم ہونے کے بعد نارائن گھر واپس آ گیا۔ اس نے سچ مچ پرچے اچھے کیے تھے، اور اس نے گھر والوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر کوئی بے ایمانی نہیں ہوئی تو وہ انٹرویو میں ضرور بلایا جائے گا۔ گھر والوں کی بات تو خیر دوسری تھی، لیکن جب محلے اور شہر کے لوگوں نے یہ بات سنی تو انھوں نے یقین نہیں کیا۔ لوگ طنزاً کہنے لگے، "ہر سال تو یہی کہتے ہیں بچو! وہ کوئی دوسرے ہوتے ہیں جو انٹرویو میں بلائے جاتے ہیں!"

Scanned with CamScanner

لیکن بات نارائن نے جھوٹ نہیں کہی تھی، کیوں کہ ایک دن اس کو خبر ملی کہ پبلک سروس کمیشن الہ آباد کے سامنے اسے انٹرویو کے لیے حاضر ہونا ہے۔

یہ خبر سارے شہر میں بجلی کی طرح پھیل گئی۔ بہت برسوں بعد کوئی لڑکا اس شہر سے ڈپٹی کلکٹری کے لیے بلایا گیا تھا۔ لوگوں کے تعجب کا ٹھکانا نہ رہا۔

شام کچہری سے واپسی پر شکل دیپ بابو سیدھے آنگن میں جا کر کھڑے ہو گئے اور زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ پھر کمرے میں جا کر کپڑے بدلنے لگے۔

شکل دیپ بابو نے کوٹ کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے، لپک کر آتی ہوئی جمنا سے کہا، "اب کرو ناراج! ہمیشہ شور مچائے رہتی ہیں کہ یہ نہیں ہے، وہ نہیں ہے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے کہ ببوا انٹرویو میں بلائے گئے ہیں۔ بس آیا ہی سمجھو!"

"جب آجائیں تبھی نا!" جمنا نے کنجوسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

شکل دیپ بابو تھوڑا ہنستے ہوئے بولے، "تم کو اب بھی شک ہے؟ لو میں کہتا ہوں کہ ببوا ضرور آئیں گے، ضرور آئیں گے! نہیں تو میں اپنی مونچھ مونڈ دوں گا۔ اور کوئی کہے نہ کہے، میں تو اس بات کو پہلے ہی سے جانتا ہوں۔ ارے میں کیا، سارا شہر یہی کہتا ہے! ابیکا بابو وکیل مجھے بدھائی دیتے ہوئے بولے: انٹرویو میں بلائے جانے کا مطلب ہے کہ اگر انٹرویو تھوڑا بھی اچھا ہو گیا تو انتخاب یقینی ہے! میرا ناک میں دم تھا۔ جو بھی سنتا، بدھائی دینے چلا آتا۔"

"محلے کے لڑکے مجھے بھی بدھائی دے گئے ہیں۔ جانکی، کمل اور گوری تو ابھی ابھی گئے ہیں،" جمنا نے خواب ناک آنکھوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے خبر دی۔

"تو تمہاری کوئی معمولی ہستی ہے! ارے تم ڈپٹی کلکٹر کی ماں ہو نا، جی!" اتنا کہہ کر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

جمنا کچھ نہیں بولی، بلکہ اس نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ ساڑی کا پلّو سر تک کھینچ لیا اور منہ ٹیڑھا کر لیا۔

شکل دیپ بابو نے جوتے اتار کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا، "ارے بھائی، ہم کو تم کو کیا لینا، ایک کونے میں پڑ کر رام رام جپا کریں گے۔ لیکن میں تو ابھی یہ سوچ رہا ہوں کچھ سال اور مختاری کروں گا۔ نہیں، یہی ٹھیک رہے گا!" انھوں نے گال پھُلا کر دو ایک مرتبہ مونچھوں پر تاؤ دیا۔

جمنا نے ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا، "لڑکا مانے گا تھوڑے ہی۔ کھینچ لے جائے گا۔ ہمیشہ یہ دیکھ کر اس کا دل دکھتا ہے کہ بابو جی اتنی محنت کرتے ہیں اور وہ کچھ بھی مدد نہیں کر پاتا۔"

"کچھ کہہ رہا تھا کیا؟" شکل دیپ بابو نے دھیرے سے پوچھا اور بیوی کی طرف دیکھ کر دروازے کے باہر دیکھنے لگے۔

جمنا نے یقین کے ساتھ کہا، "میں جانتی نہیں کیا؟ اس کا چہرہ بتاتا ہے۔ باپ کو اتنا کام کرتے

Scanned with CamScanner

دیکھ کر اس کو کوئی اچھا تھوڑے ہی لگتا ہے۔" آخر میں اس نے ناک سُڑک لی۔

نارائن پندرہ دن بعد انٹرویو دینے گیا، اور اس نے انٹرویو بھی کافی اچھا کیا۔ وہ گھر واپس آیا تو اس کا دل جوش اور ولولے سے بھرا ہوا تھا، اور جب اس نے یہ بتایا کہ جہاں اور لڑکوں کا انٹرویو پندرہ منٹ کا ہوا وہاں اُس کا پورے پچاس منٹ تک انٹرویو ہوتا رہا اور اس نے سبھی سوالوں کے جواب کافی اطمینان بخش دیے، تو اب یہ سبھی نے مان لیا کہ نارائن کا لیا جانا یقینی ہے۔

دوسرے دن کچہری میں پھر وکیلوں اور مختاروں نے شکل دیپ بابو کو مبارک باد دی اور یہ یقین ظاہر کیا کہ نارائن ضرور لیا جائے گا۔ شکل دیپ بابو مسکرا مسکرا کر لوگوں کی مبارک باد کا شکریہ ادا کرتے اور لگے ہاتھوں نارائن کی ذاتی زندگی کی دو ایک باتیں سنا دیتے اور آخر میں سر جھکا کر سرگوشی میں دل کا راز ظاہر کرتے، "آپ سے کہتا ہوں، پہلے مجھے بھی شک تھا، سولہ آنے شک تھا، لیکن آپ لوگوں کی دعا سے اب وہ دور ہو گیا ہے۔"

جب وہ گھر لوٹے تو نارائن، گوری اور کمل دروازے پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ نارائن انٹرویو کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کو آتا دیکھ کر دھیرے دھیرے بولنے لگا۔ شکل دیپ بابو چپ چاپ وہاں سے گزر گئے، لیکن دو تین ہی گز آگے گئے ہوں گے کہ گوری کی آواز ان کو سنائی پڑی: "اے تمہارا ہو گیا، اب تم موج کرو!"

اتنا سنتے ہی شکل دیپ بابو گھوم پڑے اور لڑکوں کے پاس آ کر انھوں نے پوچھا، "کیا؟" ان کی آنکھیں سکڑ گئیں اور چہرے پر ایسے آثار دکھائی دیے جیسے وہ کسی محفل میں زبردستی گھس آئے ہوں۔

لڑکے ایک دوسرے کو دیکھ کر بڑے مہذب انداز میں مسکرائے۔ پھر گوری نے جو کہا تھا اسے اور واضح انداز میں کہا، "میں کہہ رہا تھا کہ نارائن کا لیا جانا یقینی ہے۔"

شکل دیپ بابو نے سڑک سے گزرتی ہوئی ایک موٹر کو غور سے دیکھنے کے بعد دھیرے دھیرے کہا، "ہاں، دیکھیے نا! جہاں ایک سے ایک دُھرندھر لڑکے پہنچتے ہیں وہاں سب سے تو بیس منٹ ہی کا انٹرویو ہوتا ہے پر ان سے پورے پچاس منٹ کا! اگر نہیں لینا ہوتا تو پچاس منٹ تک تنگ کرنے کی کیا ضرورت تھی، پانچ دس منٹ پوچھ تاچھ کر کے۔۔۔"

گوری نے سر ہلا کر ان کی بات کی تائید کی، اور کمل نے کہا، "پہلے کا زمانہ ہوتا تو کہا بھی نہیں جا سکتا تھا، لیکن اب تو بے ایمانی وے ایمانی اتنی نہیں ہوتی ہو گی۔"

شکل دیپ بابو نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے دھیمی دھیمی آواز میں پوچھا، "بے ایمانی تو نہیں ہوتی ہے نا؟"

"ہاں، اَب اتنی نہیں ہوتی۔ پہلے بات دوسری تھی۔ وہ زمانہ اب لد گیا،" گوری نے جواب دیا۔

شکل دیپ بابو اچانک اپنی آواز پر زور دیتے ہوئے بولے، "ارے اَب کیسی بے ایمانی صاحب؟ گولی ماریے، اگر بے ایمانی ہی کرنی ہوتی تو اتنی دیر تک ان کا انٹرویو ہوتا؟ انٹرویو میں بلایا ہی نہیں ہوتا۔

Scanned with CamScanner

اور بلاتے بھی تو پانچ دس منٹ پوچھ تاچھ کر کے رخصت کر دیتے۔"

اس کا کسی نے جواب نہیں دیا تو وہ مسکراتے ہوئے مڑ کر گھر میں چلے گئے۔

گھر پہنچنے پر جمنا سے بولے، "بھوا آبھی سے کسی افسر کی طرح لگتے ہیں۔ دروازے پر بھوا، گوری اور کمل باتیں کر رہے تھے۔ میں نے دور ہی سے غور کیا، جب نارائن بابو بولتے ہیں اور ہاتھ ہلاتے ہیں تو ان کے بولنے اور ہاتھ ہلانے سے ایک۔۔۔ عجب سی ایک شان ٹپکتی ہے۔ ان کے دوستوں میں وہ بات کہاں!"

"آج دوپہر میں مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تجھے موٹر میں گھماؤں گا،" جمنا نے خوش خبری سنائی۔

شکل دیپ بابو خوش ہو کر ناک سُڑکتے ہوئے بولے، "ارے تو اس کو موٹر کی کمی ہو گی؟ گھومنا نا، جتنا چاہنا!" وہ اچانک چپ ہو گئے اور کھوئے کھوئے اس طرح مسکرانے لگے جیسے کوئی لذیذ چیز کھانے کے بعد اس کے مزے سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔"

کچھ دیر بعد انھوں نے بیوی سے سوال کیا، "کیا کہہ رہا تھا؟ موٹر میں گھماؤں گا؟"

جمنا نے پھر وہی بات دُہرا دی۔

شکل دیپ بابو نے دھیرے سے دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتے ہوئے مسکرا کر کہا، "چلو اچھا ہے۔" ان کے چہرے پر گہرے اطمینان کے آثار نمایاں تھے۔

سات آٹھ دن بعد نتیجہ نکلنے کا اندازہ تھا۔ سبھی کو یقین ہو گیا تھا کہ نارائن لے لیا جائے گا، اور سبھی بے چینی سے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔

اب شکل دیپ بابو اور بھی مصروف ہو گئے۔ پوجا پاٹھ کا ان کا معمول یوں ہی جاری رہا پہلے کی طرح۔ لوگوں سے بات چیت کرنے میں ان کو مزہ آنے لگا، اور وہ بات چیت کے دوران ایسے حالات پیدا کر دیتے کہ لوگوں کو کہنا پڑتا کہ نارائن ضرور لے لیا جائے گا۔ وہ اپنے گھر پر جمع نارائن اور اس کے دوستوں کی باتیں چھپ چھپ کر سنتے اور کبھی کبھی اچانک ان کے جھنڈ میں گھس کر زبردستی بات کرنے لگتے۔ کبھی نارائن کو یہ بات بُری بھی لگتی اور وہ غصّے میں دوسری طرف دیکھنے لگتا۔ رات میں شکل دیپ بابو چونک کر اٹھ بیٹھتے اور باہر آ کر کمرے میں سوتے ہوئے نارائن کو دیکھنے لگتے یا کبھی آنگن میں آ کر آسمان کو تکا کرتے۔

ایک دن انھوں نے سویرے ہی سب کو سنانے والے انداز میں زور سے کہا، "نارائن کی ماں، میں نے آج سپنا دیکھا ہے کہ نارائن بابو ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔"

جمنا رسوئی کے برآمدے میں بیٹھی چاول چُن رہی تھی اور اسی کے پاس نارائن کی بیوی نرملا گھونگھٹ کاڑھے دال بین رہی تھی۔

جمنا نے سر اُٹھا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا، "سپنا سویرے دکھائی پڑا تھا کیا؟"

Scanned with CamScanner

"سویرے کے نہیں تو کیا شام کے سپنے کے بارے میں تم سے کہنے آؤں گا؟ ارے، ایک دم برہم مُہورت میں دیکھا تھا! دیکھتا ہوں کہ اخبار میں نتیجہ نکل گیا ہے اور اس میں نارائن بابو کا بھی نام ہے۔ اب یہ یاد نہیں کہ کون نمبر تھا، پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ نام کافی اوپر تھا۔"

"اماں جی، سویرے کا سپنا تو بالکل سچا ہوتا ہے نا؟" نارائن کی بیوی نرملا نے دھیرے سے جمنا سے پوچھا۔

معلوم ہوتا ہے نرملا کی آواز شکل دیپ بابو نے سن لی، کیوں کہ انھوں نے ہنس کر سوال کیا، "کون بول رہا ہے؟ ڈپٹیائن ہیں کیا؟" آخر میں وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"ہاں، کہہ رہی ہیں کہ سویرے کا سپنا سچا ہوتا ہے! سچا تو ہوتا ہی ہے!" جمنا نے مسکرا کر کہا۔

نرملا شرم سے سمٹ گئی۔ اس نے اپنے بدن کو سکوڑ لیا اور پیٹھ کو نیچے جھکا کر اپنا منہ اپنے دونوں گھٹنوں کے بیچ چھپا لیا۔

اگلے دن بھی صبح شکل دیپ بابو نے اپنے گھر والوں کو خبر دی کہ انھوں نے ہو بہو وہی خواب دیکھا ہے۔

جمنا نے کہا، "سویرے کا خواب تو ہمیشہ ہی سچا ہوتا ہے۔ جب بہو کو لڑکا ہونے والا تھا، میں نے سویرے سویرے سپنا دیکھا کہ کوئی سورگ کی دیوی ہاتھ میں لڑکا لیے آسمان سے ہمارے آنگن میں اُتر رہی ہے۔ بس میں نے سمجھ لیا کہ لڑکا ہی ہے۔ اور لڑکا ہی ہوا۔"

شکل دیپ بابو نے جوش میں آ کر کہا، "اور مان لو کہ جھوٹ ہے تو یہ خواب ایک ہی دن دکھائی پڑتا، دوسرے دن بھی ہو بہو ویسا ہی سپنا کیوں دکھائی دیتا، اور وہ بھی برہم مہورت میں؟"

"بہو نے بھی آج ویسا ہی سپنا سویرے دیکھا ہے!"

"ڈپٹیائن نے بھی؟" شکل دیپ بابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ڈپٹیائن نے ہی! ٹھیک سویرے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک بنگلے میں ہم لوگ رہ رہے ہیں اور ہمارے دروازے پر موٹر کھڑی ہے،" جمنا نے جواب دیا۔

شکل دیپ بابو کھوئے کھوئے مسکراتے رہے، پھر بولے، "اچھی بات ہے! اچھی بات ہے!"

ایک دن رات کو تقریباً ایک بجے شکل دیپ بابو نے اٹھ کر بیوی کو جگایا اور اس کو الگ لے جاتے ہوئے بے شرم مہابراہمن کی طرح ہنستے ہوئے پوچھا، "کہو بھئی، کچھ کھانے کو ہوگا؟ بہت دیر سے نیند نہیں آ رہی ہے، جیسے پیٹ کچھ مانگ رہا ہے۔ پہلے میں نے سوچا، جانے بھی دو، یہ کوئی کھانے کا وقت ہے، پر اس سے کام بنتے نہیں دیکھا تو تمھیں جگایا۔ شام کو کھایا تھا، سب ہضم ہو گیا۔"

جمنا حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے شوہر کو دیکھتی رہی۔ شادی شدہ زندگی کے اتنے لمبے عرصے میں کبھی بھی، یہاں تک کہ شادی کے شروع کے دنوں میں بھی، انھوں نے رات کو یوں جگا کر کچھ کھانے کو نہیں مانگا تھا۔ وہ جھنجھلا پڑی اور بولی، "ایسا پیٹ تو کبھی نہیں تھا۔ نہ معلوم اس وقت رسوئی میں

کچھ ہے کہ نہیں۔"

شکل دیپ بابو جھینپ کر مسکرانے لگے۔

ایک دو لمحے بعد جمنا نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا، "بوا کے میوے میں سے تھوڑا سا دوں کیا؟"

شکل دیپ بابو جھٹ سے بولے، "ارے رام رام! میوہ تو تم جانتی ہو مجھے بالکل پسند نہیں۔ جاؤ تم سوؤ۔ بھوک ووک تھوڑے ہی ہے، مذاق کیا تھا۔"

یہ کہہ کر وہ دھیرے سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ لیکن وہ لیٹے ہی تھے کہ جمنا کمرے میں ایک ڈھکنی میں ایک روٹی اور گڑ لے کر آئی۔ شکل دیپ بابو ہنستے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

شکل دیپ بابو پوجا پاٹھ کرتے، کچہری جاتے، دنیا بھر کے لوگوں سے دنیا بھر کی باتیں کرتے، اور جب خالی رہتے تو کچھ نہ کچھ کھانے کو مانگ بیٹھتے۔ وہ چٹورے ہو گئے اور ان کو جب دیکھو تب بھوک لگ آتی۔ اس طرح کبھی روٹی گڑ کھا لیتے، کبھی آلو بھنوا کر کھا لیتے اور کبھی ہاتھ پر چینی ہی لے کر پھانک جاتے۔ کھانے میں بھی تبدیلی چاہنے لگے۔ کبھی کھچڑی کی فرمائش کر دیتے، کبھی ستوپیاز کی، کبھی صرف روٹی دال کی، اور کبھی صرف دال چاول کی۔ ان کا وقت کٹتا ہی نہ تھا، اور وہ وقت کاٹنا چاہتے تھے۔

اس بدپرہیزی اور ذہنی تناؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیمار پڑ گئے۔ انھیں بخار رہنے لگا، دست بھی آنے لگے۔

ان کی بیماری سے گھر کے لوگوں کو بڑی فکر لاحق ہوئی۔ جمنا نے روہانسی آواز میں کہا، "بار بار کہتی تھی، اتنی محنت نہ کیجیے، پر سنتا ہی کون ہے! اب بھگتنا پڑا نا؟"

پر شکل دیپ بابو پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ انھوں نے بات مذاق میں اڑا دی۔ "ارے میں تو کچہری جانے والا تھا، پر یہ سوچ کر رک گیا کہ اب مختاری تو چھوڑنی ہی ہے، تھوڑا آرام کر لیا جائے۔"

"مختاری جب چھوڑنی ہو گی، ہو گی۔ اِس وقت تو دو وقت کی دال روٹی کا انتظام کرنا ہے،" جمنا نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے تم کیسی باتیں کرتی ہو! بیماری دکھی تو سب کو لگی رہتی ہے۔ میں مٹی کا ڈھیلا تو ہوں نہیں کہ گل جاؤں گا۔ بس ایک آدھ دن کی بات ہے۔ اگر بیماری سخت ہوتی تو میں اس قدر ٹنا ٹن بولتا؟" شکل دیپ بابو نے سمجھایا، اور آخر میں ان کے ہونٹوں پر ایک کمزور مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ دن بھر بے چین رہے۔ کبھی ٹہلتے، کبھی بیٹھتے اور کبھی باہر نکل کر ٹہلنے لگتے۔ لیکن کمزور اس قدر ہو گئے تھے کہ پانچ دس قدم ہی چل کر تھک جاتے اور دن بھر کمرے میں آ کر لیٹ رہتے۔

کرتے کرتے شام ہوئی اور جب شکل دیپ بابو کو یہ بتایا گیا کہ کیلاش بہاری مختار ان کی خیریت پوچھنے کے لیے آئے ہیں تو وہ اٹھ بیٹھے اور جھٹ پٹ چادر اوڑھ، ہاتھ میں چھڑی لے، بیوی کے لاکھ منع کرنے پر بھی باہر نکل گئے۔ دست تو بند ہو گئے تھے، پر بخار ابھی تھا اور اس عرصے میں یہ بھی ہوا کہ وہ انتہائی چڑچڑے ہو گئے تھے۔

Scanned with CamScanner

کیلاش بہاری نے انھیں دیکھتے ہی فکرمندی سے کہا، "ارے تم کہاں باہر آ گئے؟ مجھے اندر بُلوا لیا ہوتا۔"

شکل دیپ بابو چارپائی پر بیٹھ گئے اور کمزور ہنسی ہنستے ہوئے بولے، "ارے مجھے کچھ ہوا تھوڑے ہی ہے۔ سوچا آرام کرنے کی عادت ہی ڈالوں۔" یہ کہہ کر وہ بہت معنی خیز نظر سے اپنے دوست کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائے۔

سب حال چال پوچھنے کے بعد کیلاش بہاری نے سوال کیا، "نارائن بابو کہیں دکھائی نہیں دے رہے ہیں، کہیں گھومنے گئے ہیں کیا؟"

شکل دیپ بابو نے بناوٹی مایوسی کے انداز میں کہا، "ہاں، گئے ہوں گے کہیں۔ لڑکے ان کو چھوڑتے بھی تو نہیں ہیں۔ آ کر لے جاتے ہیں کہیں نہ کہیں۔"

کیلاش بہاری نے تعریف کرتے ہوئے کہا، "خوب ہوا صاحب! میں بھی جب اس لڑکے کو دیکھتا تھا، سوچتا تھا کہ یہ لڑکا آگے چل کر کچھ نہ کچھ ضرور بنے گا۔ وہ تو صاحب، دیکھنے ہی سے پتا چل جاتا ہے۔ چال میں اور بولنے چالنے کے طریقے میں کچھ ایسا ہے ہی کہ--- چلیے، ہم سب اس معنی میں بہت خوش قسمت ہیں۔"

شکل دیپ بابو ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد سر کو آگے بڑھا کر صلاح مشورے کی آواز میں بولے، "ارے بھائی صاحب، کہاں تک بتاؤں! اپنے منھ سے کیا کہنا، پر ایسا سیدھا سادھا لڑکا تو میں نے دیکھا نہیں۔ پڑھنے لکھنے کا اتنا شوق کہ چوبیس گھنٹے لکھتا پڑھتا رہے۔ منھ کھول کر کسی سے کوئی بھی چیز مانگتا نہیں۔"

کیلاش بہاری نے بھی اپنے لڑکے کی تعریف میں کچھ باتیں پیش کر دیں۔ "لڑکے تو میرے بھی سیدھے ہیں، پر منجھلا لڑکا وشوناتھ جتنا گئو ہے اتنا کوئی نہیں۔ ٹھیک نارائن بابو ہی کی طرح ہے۔"

"نارائن تو اس یُگ کا کوئی رشی مُنی دکھائی پڑتا ہے،" شکل دیپ بابو نے گمبھیرتا سے کہا۔ "بس اس کی ایک ہی عادت ہے۔ میں اس کی ماں کو میوہ دے دیتا ہوں، اور نارائن رات کو اپنی ماں کو جگا کر کھاتا ہے۔ بھلی بُری بس اس کی یہی ایک عادت ہے۔ ارے بھیّا، تم سے بتاتا ہوں، بچپن میں ہم نے اس کا نام پنّالال رکھا تھا۔ پر ایک دن ایک مہاتما گھومتے ہوئے ہمارے گھر آئے۔ انھوں نے نارائن کا ہاتھ دیکھا اور بولے: اس کا نام پنّالال سنّالال رکھنے کی ضرورت نہیں، بس آج سے اسے نارائن کہا کرو، اس کے کرم میں راجا ہونا لکھا ہے۔ پہلے زمانے کی بات دوسری تھی، لیکن آج کل راجا کا مطلب کیا ہے؟ ڈپٹی کلکٹر تو ایک معنی میں راجا ہی ہوا!" آخر میں آنکھیں مٹکا کر انھوں نے مسکرانے کی کوشش کی، مگر ہانپنے لگے۔

دونوں دوست بہت دیر تک بات چیت کرتے رہے اور زیادہ تر وقت دونوں اپنے اپنے لڑکوں کا گن گان گانے میں لگے رہے۔

Scanned with CamScanner

شکل دیپ بابو کی بڑھتی ہوئی بیماری سب کے لیے فکرمندی کا باعث بنی رہی جسے وہ ہنسی ہنسی میں ٹال جاتے۔ "ارے کسی معمولی وَید کی سستی دوا کھا کر ٹھیک ہو جائیں گے!" دو ایک دن بعد وہ کچھ ٹھیک بھی ہو جاتے، لیکن جسم لاغر ہوتا چلا گیا۔

جس دن ڈپٹی کلکٹری کا نتیجہ نکلا، اتوار کا دن تھا۔ شکل دیپ بابو صبح رامائن کا پاٹھ کرنے اور ناشتا کرنے کے بعد مندر چلے گئے۔ چھٹی کے دن وہ مندر جلدی چلے جاتے اور وہاں دو تین گھنٹے بِتانا ان کا معمول بن گیا تھا، اور کبھی کبھی تو چار پانچ گھنٹے بھی ہو جاتے۔

وہ آٹھ بجے مندر پہنچ گئے۔ جس گاڑی سے نتیجہ آنے والا تھا، وہ دس بجے آتی تھی۔

شکل دیپ بابو پہلے تو مندر کی سیڑھی پر بہت دیر ستاتے رہے۔ وہاں سے اٹھ کر اوپر آئے تو نندلال پانڈے نے، جو چندن ماتھے پر رگڑ رہا تھا، نارائن کے رزلٹ کے بارے میں پوچھ تاچھ کی۔ شکل دیپ بابو وہاں کھڑے ہو کر غیر معمولی تفصیل کے ساتھ سب کچھ بتانے لگے۔ وہاں سے جب ان کو چھٹی ملی تو دھوپ کافی بڑھ چکی تھی۔ انھوں نے مندر کے اندر جا کر بھگوان شِو کے سامنے اپنا ماتھا ٹیک دیا۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح پڑے رہے، پھر اٹھ کر، چاروں طرف گھوم کر، انھوں نے مندر کے گھنٹے بجاتے ہوئے منتر پڑھا اور شنکھ بجایا۔ آخر میں بھگوان کے سامنے دوبارہ جھک کر نکلے ہی تھے کہ جنگ بہادر سنگھ ماسٹر مندر میں داخل ہوئے اور شکل دیپ بابو کو مندر میں دیکھ کر انھیں تعجب ہوا۔ "ارے مختار صاحب، گھر نہیں گئے۔ ڈپٹی کلکٹری کا نتیجہ تو نکل آیا۔"

شکل دیپ بابو کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ انھوں نے اپنے سوکھے ہونٹوں کو زبان سے تر کیا، ان کے ہونٹ کانپنے لگے اور انھوں نے بڑی مشکل سے مسکرا کر پوچھا، "اچھا، کب آیا؟"

جنگ بہادر نے بتایا، "ارے دس بجے کی گاڑی سے آیا۔ نارائن بابو کا نام تو ضرور ہے لیکن---" وہ کچھ آگے نہ بول سکے۔

شکل دیپ بابو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے انھوں نے پوچھا، "کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ ان کا نام تو ہے ہی۔ یہ ہے کہ ذرا نیچے ہے۔ دس لڑکے لیے جائیں گے، لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا نام سولھواں سترھواں پڑے گا۔ لیکن کوئی فکر کی بات نہیں۔ کچھ لڑکے تو کلکٹری میں چلے جاتے ہیں، کچھ میڈیکل ہی میں نہیں آتے، اور اس طرح پوری پوری امید ہے کہ نارائن بابو لے لیے جائیں گے۔"

شکل دیپ بابو کا چہرہ فق ہو گیا۔ ان کے پیروں میں زور نہیں تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گر جائیں گے۔ جنگ بہادر سنگھ تو مندر سے چلے گئے، لیکن وہ کچھ دیر سر جھکائے یوں کھڑے رہے جیسے کوئی بھولی بات یاد کر رہے ہوں۔ پھر وہ چونک پڑے اور اچانک انھوں نے تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔ ان کے منھ

Scanned with CamScanner

سے دھیمی آواز میں جلدی جلدی "شو! شو!" نکل رہا تھا۔ آٹھ دس گز آگے بڑھنے پر انھوں نے چال اور تیز کر دی، پر جلدی ہی وہ تھک گئے اور ایک نیم کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر ہانپنے لگے۔

چار پانچ منٹ ستانے کے بعد انھوں نے پھر چلنا شروع کیا۔ وہ چھڑی کو اٹھاتے گراتے، سینے پر سر لٹکائے، شو شو کا وظیفہ پڑھتے، ہوا کے ہلکے جھونکے سے، دھیرے دھیرے، ٹیڑھے ترچھے، اڑنے والے سوکھے پتے کی طرح ڈگ مگ ڈگ مگ چلے جا رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے ان کو نمستے کیا تو انھوں نے دیکھا نہیں، اور کچھ لوگوں نے ان کو دیکھ کر مسکرا کر آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں تب بھی انھوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ لوگوں نے اطمینان سے، افسوس سے اور ہمدردی سے دیکھا، پر انھوں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ ان کو بس ایک ہی دھن تھی کہ وہ کسی طرح گھر پہنچ جائیں۔

گھر پہنچ کر وہ اپنی چارپائی پر دھم سے بیٹھ گئے۔ ان کے منھ سے صرف اتنا ہی نکلا: "نارائن کی اماں!"

سارے گھر میں مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے آنگن میں گندا پانی، مٹی، باہر سے آئے ہوئے سوکھے پتے اور گندے کاغذ پڑے تھے، اور نابدان سے بدبو آ رہی تھی۔ آنگن میں پڑے پرانے بنس کتھے پر بہت سے میلے کپڑے پڑے تھے اور رسوئی سے اس وقت بھی دھواں اٹھ کر سارے گھر کی سانس کو گھونٹ رہا تھا۔ کہیں کوئی کھٹر پٹر نہیں ہو رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ گھر میں کوئی ہے ہی نہیں۔

جلدی ہی جمنا نہ معلوم کدھر سے نکل کر کمرے میں آئی اور شوہر کو دیکھ کر گھبرا کر اس نے پوچھا، "طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

شکل دیپ بابو نے جھنجھلا کر کہا، "مجھے کیا ہوا جی؟ پہلے یہ بتاؤ نارائن بابو کہاں ہیں؟"

جمنا نے باہر کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا، "اسی میں پڑے ہیں۔ نہ کچھ بولتے ہیں نہ ہنستے ہیں۔ میں پاس گئی تو گم سم پڑے رہے۔ میں تو ڈر گئی ہوں۔"

شکل دیپ بابو نے مسکراتے ہوئے دلاسا دیا۔ "ارے کچھ نہیں! سب اچھا ہو گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ، ببوا کو تم نے کبھی یہ تو نہیں بتایا تھا کہ ان کی فیس اور کھانے پینے کے لیے چھ سو روپے میں نے قرض لیے تھے۔ میں نے تم کو منع کر دیا تھا کہ ایسا کسی صورت میں بھی نہ کرنا۔"

جمنا نے کہا، "میں ایسی بےوقوف تھوڑے ہی ہوں۔ لڑکے نے دو ایک بار کرید کرید کر پوچھا بھی تھا کہ اتنے روپے آتے کہاں سے ہیں۔ ایک بار تو اس نے یہاں تک کہا تھا کہ یہ پھل میوہ دودھ بند کر دو، بابوجی فضول میں اتنا خرچ بڑھا رہے ہیں۔ پر میں نے کہہ دیا کہ تمھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں، تم بےفکر ہو کر محنت کرو۔ بابوجی کو ادھر بہت مقدمے مل رہے ہیں۔"

شکل دیپ بابو بچے کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولے، "بہت اچھا! کوئی فکر کی بات نہیں۔ بھگوان سب ٹھیک کریں گے۔ ببوا کمرے ہی میں ہیں نا؟"

جمنا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

Scanned with CamScanner

شکل دیپ بابو مسکراتے ہوئے اٹھے۔ ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا، آنکھیں دھنس گئی تھیں اور منہ پر مونچھیں جھاڑو کی طرح پھڑک رہی تھیں۔ جمنا سے یہ کہہ کر کہ "تم اپنا کام دیکھو، میں ابھی آیا!"، دبے قدموں سے باہر کے کمرے کی طرف بڑھے۔ ان کے پیر کانپ رہے تھے، سارا جسم کانپ رہا تھا، اور سانس گلے میں اٹکی جا رہی تھی۔

انھوں نے پہلے برآمدے کی کھڑکی ہی سے کمرے کے اندر جھانکا۔ باہر والا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں، جس کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا تھا۔ پہلے تو کچھ نہ دکھائی دیا، ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیکن انھوں نے تھوڑا اور آگے بڑھ کر غور سے دیکھا تو پلنگ پر کوئی شخص سینے پر ہاتھ باندھے چت پڑا تھا۔ وہ نارائن ہی تھا۔

وہ دھیرے سے چور کی طرح بنا چاپ کیے کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر ایک غیر معمولی اور کسی یقین سے بھری مسکراہٹ تھرک رہی تھی۔ وہ میز کے پاس پہنچ کر چپ چاپ کھڑے ہو گئے اور اندھیرے ہی میں ایک کتاب الٹنے پلٹنے لگے۔ کوئی ڈیڑھ دو منٹ وہ وہیں، اسی طرح، کھڑے رہنے کے بعد بڑی پھرتی سے گھوم کر نیچے بیٹھ گئے اور کھسک کر چارپائی کے پاس چلے گئے اور چارپائی کے نیچے جھانک جھانک کر دیکھنے لگے جیسے کوئی چیز کھوج رہے ہوں۔ اس کے بعد پاس میں رکھی ہوئی نارائن کی چپّل کو اٹھا لیا اور ایک دو پل اس کو بھی الٹنے پلٹنے کے بعد دھیرے سے وہیں رکھ دیا۔ آخر وہ سانس روک کر اس طرح اٹھنے لگے جیسے وہ کوئی چیز ڈھونڈھنے آئے تھے اور اس میں کامیاب ہو کر چپ چاپ واپس لوٹ رہے ہوں۔ کھڑے ہوتے وقت وہ اپنا سر نارائن کے منہ کے پاس لے گئے اور انھوں نے نارائن کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ چپ چاپ پڑا ہوا تھا، لیکن کسی طرح کی کوئی آہٹ، کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شکل دیپ بابو ڈر گئے اور انھوں نے سہمے اور دھڑکتے دل سے اپنا بایاں کان نارائن کے منہ کے بالکل نزدیک کر دیا، اور اس وقت ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا جب انھوں نے اپنے لڑکے کی سانس کو باقاعدگی سے چلتے پایا۔

وہ چپ چاپ جس طرح آئے تھے اسی طرح باہر نکل گئے۔ پتا نہیں کب سے جمنا فکرمند، دروازے سے لگی کھڑی اندر جھانک رہی تھی۔

اس نے شوہر کا منہ دیکھا اور گھبرا کر پوچھا، "کیا بات ہے، آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

شکل دیپ بابو نے اشارے سے اسے بولنے سے منع کیا اور پھر اشارے ہی سے اس کو بلاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

جمنا نے کمرے میں پہنچ کر شوہر کو بے چینی اور فکرمندی کی نظر سے دیکھا۔

شکل دیپ بابو نے بے تحاشا خوشی بھرے لہجے میں کہا، "ببوا سو رہے ہیں!"

وہ آگے کچھ نہ بول سکے۔ ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگے۔

**

Scanned with CamScanner

رام کمار

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

چیری کے پیڑ

پھاٹک پار کرتے ہی جس طرف سب سے پہلے ہمارا دھیان گیا وہ تھے آلوچوں سے ملتے جلتے پیڑوں پر لٹکتے کسی پھل کے گچھے۔ مکان کے اندر گھومنے کے بجائے ہم اس طرف دوڑے۔ کئی پیڑ تھے جن پر وہ لٹک رہے تھے۔ لیکن اچک اچک کر توڑنے پر بھی کسی کے ہاتھ میں ایک دانہ نہیں آیا۔ میں سب سے لمبا تھا لیکن میرا ہاتھ بھی انہیں چھوتے چھوتے رہ جاتا۔ ہمارا شور سن کر بڑی بہن اندر سے آئیں۔

"یہ توڑ دیجیے نا، نہ جانے کون سا پھل ہے! شاید آلوچے، آلوبخارے، خوبانی۔۔۔" ہم سب چلانے لگے۔

بہن دھیمی چال سے ہماری طرف آنے لگیں۔ ہمیں غصہ آیا کہ وہ ایسے موقعے پر بھاگ کے کیوں نہیں آتیں۔ لیکن ڈر تھا کہ ان سے جلدی آنے کے لیے کہا تو وہ کہیں واپس نہ چلی جائیں۔

"کیا ہیں یہ؟" انھوں نے اوپر پیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شاید آلوچے ہیں۔ توڑ دیجیے، جلدی۔"

"کوئی جنگلی پھل ہے شاید،" وہ بولیں۔

"نہیں، نہیں، جنگلی نہیں ہے۔" ہم چلائے۔ "ایک توڑ کر مجھے دیجیے۔۔۔"

ہماری طرف دھیان دیے بغیر وہ اوپر لٹکتے ہوئے گچھوں کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر ایک دانہ توڑا اور اسے گھما پھرا کر دیکھتی رہیں۔ "پتا نہیں کیا ہے۔ ایسا پھل کبھی کسی پہاڑ پر تو دیکھا نہیں۔"

ہم ان کے آس پاس ایک دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے تھے اور اب اس ایک دانے کو لینے کے لیے چھینا جھپٹی کرنے لگے تھے۔

Scanned with CamScanner

"نہیں- یہ کھانا نہیں- کون جانے اس میں زہر ہو! پہلے مامی سے پوچھیں گے-" پھر میری طرف دیکھ کر بولیں، "سنو! کوئی نہیں توڑے گا انھیں-" یہ کہہ کر دھیمی چال سے وہ پھر مکان کے اندر چلی گئیں-

ان کے حکم کی کوئی خلاف ورزی نہیں کر سکتا، یہ سوچ کر ہم سب دل مسوس کر رہ گئے- لیکن اس شام سارے باغ میں گھوم گھوم کر ہم نے پیڑوں کو گنا- دوسرے پیڑ بھی تھے لیکن اُن کی اہمیت نہیں کے برابر تھی- یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی پہاڑ پر اپنے ہی باغ میں کسی پھل کے اتنے پیڑ ملے ہوں- کبھی ایک آدھ آلوچے، خوبانی یا سیب کا پیڑ مل جاتا تھا، یا پھر قریب ہی کسی دوسرے مکان میں ان پیڑوں کو دیکھ کر چپکے سے کچھ توڑ لیتے، لیکن اس بار اپنے ہی باغ میں اتنے پیڑ! ہماری خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا-

اندر بہن نے وہ دانہ پتا کے سامنے رکھ کر کہا، "پتا نہیں کون سا پھل ہے! باغ میں لگا ہے-"

پتا اسے دیکھتے ہی بولے، "یہ چیری ہے- ابھی پکی نہیں ہے-" چیری کا نام سنتے ہی ہماری خوشی اور بڑھ گئی- ہم نے آج تک چیری کا پیڑ نہیں دیکھا تھا، اور اب اپنے ہی باغ میں پندرہ بیس چیری کے پیڑ ہیں جنھیں توڑنے سے کوئی نہیں روکے گا، جن پر ہمارا پورا حق ہو گا-

ہم اس ایک خوشی میں اس قدر ڈوب گئے تھے کہ اس سال کمروں پر جھگڑا نہیں ہوا- ہر سال پہلے دن جب یہ مسئلہ پیش آتا کہ کون سا کمرہ کس کا ہو گا، تو ہم آپس میں جھگڑتے تھے، ہاتھا پائی بھی ہوتی تھی اور غصے میں پتا ایک آدھ کو پیٹ بھی دیتے تھے- لیکن اس بار بہن نے جہاں جس کا سامان رکھ دیا اس کی مخالفت کسی نے نہیں کی-

رات کو بہن ہمارے کمرے میں آئیں- میں ایک کتاب کی تصویریں دیکھ رہا تھا-

"سویا نہیں؟"

"نیند نہیں آ رہی،" میں بولا- چھوٹے بھائی بہن سو گئے تھے-

"مجھے بھی نئے گھر میں پہلی رات نیند نہیں آتی-"

وہ کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں- کھڑکی بند تھی لیکن ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا جس میں سے وہ باہر جھانکنے لگیں- دو مہینے پہلے جب سے اُن کی سگائی ہوئی تھی، وہ تب سے بہت چپ چپ رہنے لگی تھیں- اگلے جاڑوں میں ان کا بیاہ ہو جائے گا- ان سے چھٹکارا پانے کے تصور سے ہم لوگوں کا جوش بڑھ جاتا، لیکن بیاہ کے بعد وہ اس گھر میں نہیں رہیں گی، یہ سوچ کر دکھ بھی ہوتا-

"یہ دیکھو،" انھوں نے دھیمے لہجے میں کہا-

"کیا ہے؟"

"اِدھر آؤ---" وہ کھڑکی سے اپنا چہرہ ہٹاتے ہوئے بولیں-

میں ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا- کھڑکی کے دوسرے شیشے سے باہر دیکھا، لیکن اندھیرے میں سامنے والے پہاڑ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا-

Scanned with CamScanner

انھوں نے دھیرے سے کھڑکی کی چٹخنی کھولی اور اپنا سر باہر نکال لیا۔

"کیا ہے؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"وہ دیکھو، کتنے تارے چھٹکے ہیں۔"

مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ انھوں نے کوئی جنگلی جانور دیکھ لیا ہوگا۔ "تارے تو سب جگہ دکھائی دیتے ہیں،" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"تارے اتنے پاس سے کبھی نہیں دکھائی دیتے۔ لگتا ہے جیسے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہی ہم انھیں چھو لیں گے۔"

میں نے پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ مجھے بھی لگا کہ جیسے تارے بہت نیچے اُتر آئے ہیں۔

"پہاڑوں پر تارے نزدیک دکھائی دیتے ہیں۔ ہم اونچائی پر آجاتے ہیں نا، اس لیے۔"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ پچھلے سال وہ مسوری میں اتنے پاس کبھی دکھائی نہیں دیے۔ نینی تال میں۔۔۔"

مجھے ان باتوں سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ یہاں تارے بہت پاس دکھائی دیتے ہیں،" وہ بولیں۔

کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا اندر آرہی تھی۔ میں اپنی چارپائی پر آگیا اور لحاف سے اپنا جسم ڈھانک لیا۔ وہ کچھ دیر تک کھڑکی پر جھکی رہیں، پھر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں پھر تصویریں دیکھنے لگا۔

اگلے دن ہم اٹھتے ہی صبح سویرے چیری کے پیڑوں کے پاس پہنچ گئے۔ کوئی کسی پیڑ کے پاس پہنچ کر دوسروں کو آواز دیتا: دیکھو اوپر کی ڈال پر چیری کتنی پیلی ہو گئی ہے! کس پیڑ کی چیری کتنی بڑی ہے، کس کی چھوٹی، ان سب کی جانچ پڑتال ہم نے فوراً کر ڈالی۔ ایک پیڑ کی کچھ ٹہنیاں نیچے کی طرف جھکی ہوئی تھیں، لیکن بہت اُچھلنے کے باوجود بھی ہاتھ اُن تک نہ پہنچ سکا۔ پھر چھوٹا بھائی گھٹنوں کے بل بیٹھا اور میں اس کی پیٹھ پر چڑھ کر چیری توڑنے لگا۔ صرف چار دانے ہاتھ آئے۔ ایک ایک سب کو دیا لیکن چھوٹی بہن کے لیے نہیں بچی۔ وہ رونے لگی۔ میں نے اسے اپنی آدھی چیری دینے کا وعدہ کیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ بڑی بہن سے شکایت کرے گی، یہ دھمکی دیتی وہ روتی ہوئی گھر کی طرف بھاگی۔

کچھ دیر بعد بہن ہمارے پاس آئیں۔ "یہ کچی چیریاں کیوں توڑیں؟ انھیں کھا کر کیا بیمار پڑنا ہے؟" پھر میری طرف دیکھ کر بولیں، "اگر کسی نے اب ایک بھی چیری کھائی تو اسے سخت سزا ملے گی۔ کچا پھل توڑنے پر پاپ چڑھتا ہے۔"

وہ لوٹ گئیں۔ اب بہن کے منع کر دینے کے بعد کسی کی ہمت چیری کھانے کی نہیں ہوئی۔ اگر چھپ کر ایسا کیا اور بہن کو پتا چل گیا تو کیا انجام ہوگا، اس خیال ہی سے ڈر لگنے لگا۔ وہ کبھی کسی کو پیٹتی نہیں تھیں، زیادہ غصہ آنے پر ڈانٹیں بھی نہیں۔ ان کی سزا ہوتی تھی، قصوروار سے بول چال بند۔ یہ سزا

Scanned with CamScanner

ناقابلِ برداشت بن جاتی تھی، مارپیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ سے بھی زیادہ، جس سے ہم سب گھبراتے تھے۔

کھاتے وقت جب ہم ساتھ بیٹھتے تو یہی ایک موضوع ہوتا۔

"اب تو گلابی ہونے لگی ہے۔"

"اوپر کی ڈالیوں پر تو لال ہو گئی ہے۔"

"اب دو ہفتوں تک تیار ہو جائے گی، پھر جی بھر کر کھانا،" پتا کہتے۔

بہن کہتیں، "ان کا بس چلے تو کچی ہی کھا جائیں۔ اس بار تو یہ گھر سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ بس چیری، چیری، چیری، اور کوئی بات ہی نہیں۔"

ماں کو بہن کے بیاہ کی فکر لگی ہوئی تھی۔ جب گھر کا کوئی کام نہ ہوتا تو پتا سے اس موضوع پر وہ نہ جانے کتنی باتیں کرتیں۔ پتا ایک کاپی میں ماں کی بتائی ہوئی لسٹ لکھا کرتے۔ کیا سامان منگوانا ہو گا، کتنا زیور گھنا بنے گا، کتنی ساڑیاں، برات کہاں ٹھہرے گی۔

اس ذکر سے بہن کا چہرہ اور بھی گمبھیر ہو جاتا۔

ہر چیری کے پیڑ کے تنے پر چاقو کی نوک سے میں نے سب کے نام لکھ دیے تھے۔ پیڑ پر جس کا نام ہو گا وہی اس کی چیری توڑے گا اور کھائے گا۔ سب اپنے اپنے پیڑوں کے نیچے کھڑے ہو کر اپنی چیریوں کی تعریف کرتے اور دوسروں کے پیڑوں کی برائی۔ ہر ایک کا دعویٰ ہوتا کہ اس کے پیڑ کی چیری تیزی سے پک رہی ہے۔

اُس دن ایک شخص ہمارے باغ میں آیا اور چیری کے پیڑوں کا چکر لگانے لگا۔ ہر پیڑ کے پاس جاتا اور شاخوں کو اِدھر اُدھر ہٹا کر اوپری سرے تک دیکھتا، کبھی ایک پیڑ کی چیری توڑ کر کھاتا کبھی دوسرے پیڑ کی۔ اتنا بے دھڑک ہو کر وہ باغ میں گھوم رہا تھا جیسے یہ اس کا گھر ہو۔ ہم جھنڈ بنا کر اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کے رویّے پر ہمیں غصہ آ رہا تھا، لیکن اس سے کچھ کہنے کی ہمت ہم میں سے کسی کی نہ تھی۔ اپنا کام ختم کر کے اس کی نظر ہماری طرف گئی اور وہ مسکرانے لگا، جس سے ہمیں اس کے اوپر کے دو بڑے بڑے پیلے دانت دکھائی دینے لگے۔

"آپ لوگ اس بنگلے میں رہتے ہیں؟"

"ہاں یہ ہمارا مکان ہے،" میں نے ہمت سے جواب دیا۔

پتا سے ملنے کی خواہش ظاہر کرنے پر ہم اسے پتا کے کمرے میں لے گئے۔ ہمیں اس کے چہرے سے نفرت محسوس ہو رہی تھی اور یہ جاننے کی بے چینی بھی ہو رہی تھی کہ آخر وہ ہے کون۔ اس کے واپس چلے جانے کے بعد ہم پتا کے پاس گئے۔

"ٹھیکے دار تھا جس نے چیری کے پیڑ مالک مکان سے خرید لیے ہیں۔ کل سے اس کا آدمی ان پیڑوں کی رکھوالی کرے گا،" پتا بولے۔

"ہم تو سمجھ رہے تھے کہ یہ ہمارے پیڑ ہیں۔ ہمارے باغ کے اندر ہیں، کوئی دوسرا انہیں کیسے

Scanned with CamScanner

خرید سکتا ہے؟" میں بولا۔

پتا ہنسنے لگے۔ "ہم نے مکان کرائے پر لیا ہے۔ پیڑوں پر تو مالک مکان ہی کا حق ہوتا ہے۔"

"اب ہم چیری نہیں توڑ سکتے؟"

اُس رات ہم میں سے کسی نے بھی چیری کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ کسی نے بھولے سے کچھ کہا تو سب کو چپ دیکھ کر اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ مجھے بہت رات تک نیند نہیں آئی۔ کھڑکی سے باہر باغ کی طرف دیکھا، چیری کے چھوٹے چھوٹے پیڑ بہار سے نیچے تک جھکے دکھائی دے رہے تھے۔ میں بہن سے اس موضوع پر کئی اور باتیں بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ اس رات ہمارے کمرے میں نہیں آئیں۔

اگلے دن صبح ٹھیکے دار کے ساتھ ایک بوڑھا بھی آیا۔ وہ اپنے ساتھ رسیوں کے ڈھیر، ٹوٹے ہوئے پرانے کنستر اور بانس کی چٹائیاں لائے۔ باغ کے دوسرے سرے پر چٹائیوں سے انھوں نے ایک جھونپڑی تیار کی، جھونپڑی کے اندر ایک دری بچھائی، ایک کونے میں بوڑھے نے اپنا حقہ رکھ دیا۔ ہم تھوڑی دور سے سب کچھ دیکھتے رہے۔ دو چٹائیوں کو ملا کر جتنی جلدی جھونپڑی تیار ہو گئی اس سے ہم کو بہت تعجب ہوا۔ وہ دونوں کبھی کبھی ہماری طرف دیکھ کر مسکرانے لگتے، لیکن ہم نے ان کی مسکراہٹ کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چھوٹے بھائی نے کہا کہ وہ ہمارے دشمن ہیں اور ہماری ہی زمین پر اپنے خیمے گاڑ رہے ہیں۔

کنستروں میں چھوٹے چھوٹے پتھر بھرے گئے اور رسیوں کی مدد سے انھیں کچھ پیڑوں پر باندھ دیا گیا۔ بوڑھا ان رسیوں کے سرے جھٹکے کے ساتھ ہلاتا تو کنستر میں پڑے پتھر بجنے لگتے اور ایک کرخت سی آواز سارے جنگل میں گونج اٹھتی۔ ہماری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد سارا انتظام کر کے ٹھیکے دار چلا گیا۔ رہ گیا وہ بوڑھا جو جھونپڑی کے پاس ایک پتھر پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ ہمیں ٹھیکے دار کے مقابلے میں اس بوڑھے کے چہرے پر زیادہ دوستی کے آثار دکھائی دیے۔ ہم دھیرے دھیرے اس کے پاس پہنچے۔ اس نے بڑے پیار سے ہم لوگوں کو پاس بٹھایا۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ پتھر پرندوں کو بھگانے کے لیے ہیں۔ بہت سے پرندے، خاص کر بلبل، چیریوں پر چونچ مارتے ہیں جس سے وہ سڑ جاتی ہیں۔ اگر انھیں بھگایا نہ جائے تو پیڑ کے پیڑ ختم ہو سکتے ہیں۔

"لیکن کنستر سب چیری کے پیڑوں پر کیوں نہیں باندھے جاتے ہیں؟"

"چار پانچ پیڑوں کے لیے ایک کنستر کی آواز کافی ہے،" وہ بولا۔

"کیا تم رات کو بھی یہیں رہو گے؟"

"ہاں، رات کو بھی ڈر رہتا ہے کوئی آدمی چیری نہ توڑ لے۔"

سب سے چھوٹی بہن کا دھیان حقے کی طرف تھا۔ اس نے پوچھا، "یہ کیا ہے؟"

Scanned with CamScanner

ہم ہنس پڑے۔ "یہ ان کی سگریٹ ہے،" چھوٹا بھائی بولا۔

دھیرے دھیرے بوڑھے کی موجودگی کے سب عادی ہو گئے۔ رسی کھینچ کر کنستروں کا بجانا یا "باہو۔۔۔باہو" کی آواز نکال کر یا سیٹی بجا کر پرندوں کو اڑانا، ان سب آوازوں کی عادت پڑ گئی تھی۔ چیریوں کے بوجھ سے ڈالیاں اتنی جھک گئی تھیں کہ اُچھل کر میں آسانی سے دو چار دانے توڑ سکتا تھا، لیکن بوڑھے کی نظریں ہر وقت چوکنی ہو کر چاروں طرف گھومتی رہتیں، اس لیے ہمت نہیں ہوتی تھی۔

ماں دوسرے تیسرے دن بوڑھے کو چائے کا گلاس بھجوا دیتیں۔ وہ بھی کبھی کچھ پکی ہوئی چیریاں توڑ کر ہمیں دے دیتا۔ لیکن پیڑ پر چڑھ کر توڑنا، پھر کھانا، جس کا ہم نے شروع میں تصور باندھا تھا، وہ خواہش تو دل ہی میں رہ گئی۔ جب کبھی کوئی پرندہ ریت پر چیری کھا رہا ہوتا اور بوڑھے کو پتا نہ چلتا تو ہمیں بہت خوشی ہوتی۔ ہمارا بس چلتا تو سارے پیڑ پرندوں کو کھلا دیتے، لیکن پرندے چپ چاپ چیریاں نہیں کھاتے تھے، ایک دو دانے کھا کر جب کسی دوسری ڈال پر بیٹھتے تو بوڑھے کو پتا چل جاتا اور وہ رسی کھینچ کر کنستر بجا دیتا۔

بہن دن بھر کسی پیڑ کے نیچے کرسی بچھا کر ہم میں سے کسی کا پُل اوور بُنا کرتیں۔ اس سال گرمیوں کی چھٹیوں میں انھوں نے کسی کتاب کو ہاتھ تک نہیں لگایا، نہیں تو ہر بار وہ اپنے کورس کی کوئی کتاب پڑھتی رہتیں۔ کچھ دن پہلے ان کا انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ نکلا تھا اور وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی تھیں۔ وہ اور پڑھنا چاہتی تھیں لیکن ماں کو ان کی شادی کی جلدی تھی۔

ہمارے گھر سے تھوڑی دور ایک چشمہ بہتا تھا جہاں ہم دوسرے تیسرے دن نہانے چلے جاتے تھے۔ کبھی بازار، کبھی سنیما، کبھی پارک، دھیرے دھیرے ہمارے روز کے پروگرام میں اب دوسری دلچسپیاں شامل ہو گئی تھیں۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ بڑی بہن نے کسی چیز میں حصہ نہیں لیا۔ پہاڑوں میں وہ ہمارے بہت قریب آ جاتی تھیں۔ رات کو کھانے کے بعد چارپائیوں میں دبکے ہم ان سے کہانیاں سنا کرتے تھے، شام کو اپنے ساتھ گھمانے لے جاتی تھیں، اور پکنک کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔ اس مرتبہ وہ بہت کم گھر سے نکلیں، اور جب باہر جاتی بھی تھیں تو اکیلی ہی جاتیں۔

ایک دن صبح آنکھ کھلتے ہی باہر باغ میں کئی لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں چارپائی پر لیٹا لیٹا کچھ دیر تک تو تعجب سے اس شور و غل کے بارے میں سوچتا رہا۔ کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھنے ہی والا تھا جب بہن کسی کام سے کمرے میں آئیں۔

"یہ شور کیسا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ لوگ آ گئے۔"

"کون لوگ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہی ٹھیکے دار کے آدمی۔ چیری توڑنے کے لیے،" وہ بولیں۔

میں جھٹ سے باہر دوڑا۔ پیڑوں پر ٹوکریاں لیے ٹھیکے دار کے آدمی چڑھے ہوئے تھے۔ دونوں

Scanned with CamScanner

ہاتھوں سے اوپر نیچے کی چیریاں توڑ کر بھرتے جا رہے تھے۔ کسی دور کی شاخ کو پکڑ کر اپنے پاس گھسیٹنے پر چرر چرر کی آوازیں گونجنے لگتیں۔ سارے باغ میں شوروغل تھا۔

ہم دھیرے دھیرے باغ کے چکر لگانے لگے۔ ہر پیڑ کے پاس کچھ دیر کھڑے رہ کر اوپر چڑھے آدمی کو دیکھتے۔ لگ رہا تھا جیسے آج ہماری شکست کا آخری دن ہو گا۔

ہر پیڑ کے نیچے بہت سی چیریاں گری پڑی تھیں۔ چھوٹی بہن نے ایک گچھا اٹھایا تو بھائی نے اس کے ہاتھ سے چھین کر پھینک دیا۔ "جانتی نہیں کہ بہن نے کیا کہا ہے؟ کوئی ایک بھی چیری منہ میں نہیں رکھے گا۔"

جھونپڑی کے پاس ٹھیکے دار چار پانچ لوگوں کے ساتھ چیریاں چُن چُن کر پیٹیوں میں رکھ رہا تھا۔ اس کے پاس ہی کئی خالی پیٹیاں پڑی تھیں اور دری پر توڑی ہوئی چیریوں کا ایک ڈھیر۔ وہ سب بہت تیزی سے کام کر رہے تھے۔ ہمیں کھڑے دیکھ کر ٹھیکے دار نے ایک ایک مٹھی چیری ہم سب کو دینی چاہی، لیکن ہم نے انکار کر دیا۔

ہم لوگ باغ ہی میں گھومتے رہے۔ گھر سے باہر کہیں جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ چیری کے پیڑ دھیرے دھیرے خالی ہوتے جا رہے تھے۔ اس دن کنستر بجانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بلبل اور دوسرے پرندے پیڑوں کے اوپر ہی چکر لگاتے رہے، کسی کو پیڑ پر بیٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

"یہ دیکھو، اس پیڑ کے نیچے کیا پڑا ہے؟" چھوٹی بہن نے ایک پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔

ہم نے اُس طرف دیکھا لیکن پتا نہیں چلا کہ کیا ہے۔ پاس جانے پر پیڑ کے نیچے ایک مَری ہوئی بلبل دکھائی دی۔ اس کی گردن پر خون جما ہوا تھا۔ ہم کچھ دیر تک چپ چاپ دیکھتے رہے۔ میں نے اس کا پاؤں پکڑ کر ہلایا لیکن اس میں جان باقی نہیں بچی تھی۔

"یہ کیسے مر گئی؟"

"کسی نے اس کی گردن پر پتھر مارا ہے۔"

"انھیں لوگوں نے مارا ہو گا۔"

"تبھی کوئی بلبل پیڑ پر نہیں بیٹھ رہی۔"

ہم نے ٹھیکے دار اور اس کے آدمیوں کو جی بھر کر گالیاں دیں۔ ان لوگوں پر پہلے ہی بہت غصہ آ رہا تھا، اب بلبل کی بتیا دیکھ کر تو ان سے بدلہ لینے کا جذبہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ کتنے ہی منصوبے بنائے لیکن ہر بار اس میں کوئی کمی نظر آ جاتی جس سے اسے ادھورا چھوڑ دینا پڑتا۔ پھر یہ سوچ کر کہ اگر یہ بلبل یہیں پڑی رہی تو بلّی یا کتّا اسے کھا جائے گا، ہم نے پاس ہی ایک گڈھا کھود کر اس میں بلبل کو لٹایا اور اوپر سے مٹّی ڈال دی۔

اُس دن بڑی بہن نے باغ میں پیر تک نہیں رکھا۔ انھوں نے نہ مری ہوئی بلبل دیکھی، نہ پیڑوں سے چیریوں کا ٹوٹنا۔ انھیں پیڑوں سے پھل توڑنا اچھا نہیں لگتا۔ "پودوں، پھلوں اور پھولوں میں بھی جان

Scanned with CamScanner

ہوتی ہے۔ انھیں توڑنا بھی اتنا ہی بُرا ہے جتنا کسی جان دار کو مارنا،" وہ ہم سے کہا کرتی تھیں۔

وہ لوگ شام کو بہت دیر تک چیریاں توڑتے رہے۔ پھر ایک لاری آ کر رکی جس میں وہ سب پیٹیاں لادی گئیں، اور وہ سب چلے گئے۔ باغ میں اچانک سناٹا ہو گیا۔ رہ گئے صرف چیری کے ننگے پیڑ جن پر ایک بھی چیری دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہوا تیز تھی اور رہ رہ کر پیڑوں کی شاخیں ہل اٹھتی تھیں جیسے آخری سانسیں لے رہی ہوں۔ نیچے بکھری ہوئی تھیں بہت پتّیاں اور کچھ ڈالیاں جو چیری توڑتے وقت نیچے گر گئی تھیں۔ شام ہمیں بہت سُونی سُونی سی لگی اور پیڑوں سے ڈر سا لگنے لگا۔

کھاتے وقت ہم دن بھر کے واقعات کا ذکر کرتے رہے۔ مری ہوئی بلبل کا قصہ بھی سنایا، لیکن بڑی بہن نے ذرا بھی دل چسپی نہیں دکھائی۔ ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ لگا جیسے وہ ہماری باتیں سن ہی نہ رہی ہوں۔ کھانا بھی انھوں نے بہت کم کھایا۔

رات کو دیر تک نیند نہیں آئی، نہ کوئی کتاب پڑھنے میں دل لگا۔ چھوٹے بھائی بہن دن بھر کی تکان سے چارپائی پر لیٹتے ہی سو گئے۔ تھکن سے میرا بھی بدن ٹوٹ رہا تھا لیکن بہت کوشش کرنے پر بھی نیند نہیں آئی۔

کچھ دیر بعد میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک آسمان میں بہت سے تارے ایک ساتھ چمک اٹھے۔ تارے یہاں سچ مچ بہت قریب دکھائی دیتے ہیں، کیوں؟ صرف چھ ہزار فٹ ہی تو اونچی ہے یہ جگہ، اور تارے تو ہزاروں میل دور ہیں۔ پھر اتنے پاس کیسے دکھائی دیتے ہیں؟ میں سوچنے لگا۔ تبھی باغ میں پیڑوں کے نیچے کسی کی پرچھائیں دکھائی دی۔ مجھے ڈر سا لگا۔ لیکن کچھ دیر بعد پتا چلا کہ وہ بہن ہیں۔ وہ ابھی تک سوئیں نہیں۔۔۔

میں بھی دبے پاؤں باہر آ گیا۔ وہ چیری کے پیڑوں کے نیچے ٹہل رہی تھیں۔ اُن کی ساڑی کا آنچل نیچے تک جھول رہا تھا۔

"ابھی تک سوئے نہیں؟" بغیر میری طرف دیکھے انھوں نے پوچھا۔

ان کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ میرا اندازہ تھا کہ شاید انھیں میرے باہر آنے کا پتا نہیں چل پایا ہو گا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا، "نہیں! ابھی نیند نہیں آئی۔" ان کے پیروں کے نیچے پتّے دبتے تو سَرر سَرر کی آواز رات کے سناٹے میں گونج جاتی۔ ہوا اور تیز ہو گئی تھی۔

"آج بہت اندھیرا ہے،" میں بولا۔

"آج کل اندھیری راتیں ہیں۔"

کبھی کبھی اپنی نظریں اٹھا کر وہ کسی کسی پیڑ کو دیکھتیں جن کی شاخوں کے بیچ سے آسمان میں چمکتے تارے دکھائی دیتے۔

"آج تارے بہت قریب دکھائی دے رہے ہیں،" میں نے کہا۔

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

Scanned with CamScanner

اُشا پریسم وَدا

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

واپسی

گجادھر بابو نے کمرے میں جمے سامان پر ایک نظر دوڑائی۔ دو بکس، ڈولچی، بالٹی۔ "یہ ڈبا کیسا ہے گنیشی؟" انھوں نے پوچھا۔ گنیشی بستر باندھتا ہوا کچھ گھمنڈ، کچھ دکھ، کچھ شرم سے بولا، "گھر والی نے ساتھ کے لیے کچھ بیسن کے لڈو رکھ دیے ہیں۔ کہا، بابو جی کو پسند تھے۔ اب کہاں ہم غریب لوگ آپ کی کچھ خاطر کر پائیں گے۔" گھر جانے کی خوشی میں گجادھر بابو کو ایک دکھ کا احساس ہوا، جیسے ایک جانی پہچانی، باعزت اور پرکشش دنیا سے ان کا ناتا ٹوٹ رہا ہو۔

کبھی کبھی ہم لوگوں کی بھی خبر لیتے رہیے گا،" گنیشی بستر میں رسّی باندھتے ہوئے بولا۔

"کبھی کچھ ضرورت ہو تو لکھنا گنیشی۔ اس اگھن تک بٹیا کی شادی کر دو۔"

گنیشی نے انگوچھے کے کنارے سے آنکھیں پونچھیں۔ "اب آپ لوگ سہارا نہ دیں گے تو کون دے گا۔ آپ یہاں رہتے تو بیاہ میں کچھ حوصلہ رہتا۔"

گجادھر بابو چلنے کو تیار بیٹھے تھے۔ ریلوے کوارٹر کا یہ کمرہ جس میں انھوں نے کتنے سال بتائے تھے، بدصورت اور ننگا لگ رہا تھا سامان کے سمٹ جانے سے۔ آنگن میں بوئے پودے بھی جان پہچان کے لوگ لے گئے تھے، اور جگہ جگہ مٹی بکھری پڑی تھی۔ مگر بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کے خیال سے یہ دکھ کی ایک کم زور لہر اُٹھ کر گم ہو جاتی تھی۔

گجادھر بابو خوش تھے، بہت خوش۔ پینتیس سال کی نوکری کے بعد وہ ریٹائر ہو کر جا رہے تھے۔ ان برسوں میں زیادہ تر وقت انھوں نے اکیلے رہ کر کاٹا تھا۔ ان اکیلے لمحوں میں وہ اسی وقت کا تصور کرتے رہے تھے جب وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ رہ سکیں گے۔ اسی امید کے سہارے وہ اپنی محرومیوں کا بوجھ ڈھوتے

رہے تھے۔ دنیا کی نظر میں ان کی زندگی کامیاب کہی جا سکتی تھی۔ انھوں نے شہر میں ایک مکان بنوا لیا تھا، بڑے لڑکے آمر اور بڑی لڑکی کانتی کی شادیاں کر دی تھیں، دو بچے بڑی کلاسوں میں پڑھ رہے تھے۔ گجادھر بابو نوکری کی وجہ سے اکثر اسٹیشنوں پر رہے اور ان کے بیوی بچے شہر میں، تاکہ پڑھائی میں رکاوٹ نہ رہے۔ گجادھر بابو سبھاو میں بڑے بامحبت آدمی تھے اور محبت کے بھوکے بھی۔ جب بیوی بچے ساتھ تھے تو ڈیوٹی سے لوٹ کر بچوں سے ہنستے بولتے، بیوی سے کچھ ہنسی مذاق کرتے۔ ان کے چلے جانے سے گجادھر بابو کی زندگی میں بڑا سُونا پن آ گیا تھا۔ خالی وقت میں ان سے گھر میں ٹکا نہ جاتا۔ شاعری کا مذاق نہ رکھنے پر بھی انھیں بیوی کی پیار بھری باتیں یاد آتی رہتیں۔ دوپہر میں گرمی ہونے پر بھی وہ دو بجے تک آگ جلائے رکھتی اور ان کے اسٹیشن سے لوٹنے پر گرم گرم روٹیاں سینکتی۔ ان کے کھا چکنے کے بعد بھی منع کرنے کے باوجود ان کی تھالی میں اَور کھانا ڈالتی اور ان سے بڑے پیار سے اصرار کرتی۔ جب وہ تھکے ہارے باہر سے آتے تو ان کی آہٹ پا کر وہ رسوئی کے دروازے پر آ کھڑی ہوتی اور اس کی شرمیلی آنکھیں مسکرا اٹھتیں۔ گجادھر بابو کو تب ہر چھوٹی بات بھی یاد آتی اور وہ اُداس ہو جاتے۔ اب کتنے برس بعد وہ موقع آ رہا تھا کہ وہ اس پیار بھرے ماحول میں رہنے جا رہے تھے۔

ٹوپی اتار کر گجادھر بابو نے چارپائی پر رکھ دی، جوتے کھول کر نیچے کھسکا دیے۔ اندر سے رہ رہ کر قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ اتوار کا دن تھا اور ان کے سب بچے اکٹھے ہو کر ناشتا کر رہے تھے۔ گجادھر بابو کے خشک چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اسی طرح مسکراتے ہوئے وہ بغیر کھنکھارے اندر چلے گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ نرسندر پچھلی رات کو دیکھی کسی فلم کے ناچ کی نقل کمر پر ہاتھ رکھے کر رہا ہے اور بسنتی ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی ہے۔ امر کی دلھن کو اپنے تن بدن، گھونگھٹ، کسی چیز کا ہوش نہیں تھا اور وہ بھی بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ گجادھر بابو کو دیکھتے ہی نرسندر دھپ سے بیٹھ گیا اور چائے کا پیالہ اٹھا کر منھ سے لگا لیا۔ بہو کو ہوش آیا اور اس نے جھٹ سے ماتھا ڈھانک لیا۔ صرف بسنتی کا جسم رہ رہ کر ہنسی دبانے کی کوشش میں ہل رہا تھا۔

گجادھر بابو نے مسکراتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھا، پھر کہا، "کیوں نرسندر، کیا نقل ہو رہی تھی؟"

"کچھ نہیں بابوجی،" نرسندر نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔ گجادھر بابو نے چاہا تھا کہ وہ بھی اس ہنسی مذاق میں شامل ہوتے مگر ان کے آتے ہی سب چپ ہو گئے۔ اس سے ان کے دل میں تھوڑی مایوسی آ گئی۔ بیٹھتے ہوئے بولے، "بسنتی، مجھے بھی چائے دینا۔ تمھاری اماں کی پوجا ابھی چل رہی ہے کیا؟"

بسنتی نے ماں کی کوٹھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "ابھی آتی ہی ہوں گی۔" اور پیالے میں ان کے لیے چائے بنانے لگی۔ بہو چپ چاپ پہلے ہی چلی گئی تھی، اب نرسندر بھی چائے کا آخری گھونٹ پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔ صرف بسنتی، باپ کے لحاظ میں، چوکے میں بیٹھی ماں کی راہ دیکھنے لگی۔ گجادھر بابو نے ایک گھونٹ چائے پی، پھر کہا، "بٹی، چائے تو پھیکی ہے۔"

"لائیے، چینی اور ڈال دوں،" بسنتی بولی۔

"رہنے دو۔ تمہاری اماں جب آئے گی تبھی پی لوں گا۔"

تھوڑی دیر میں ان کی بیوی ایک لٹیا میں پانی لیے نکلی اور پوجا کرتے ہوئے اسے تلسی کے پودے میں ڈال دیا۔ انہیں دیکھتے ہی بسنتی بھی اٹھ گئی۔ بیوی نے آ کر گجادھر بابو کو دیکھا اور کہا، "ارے، آپ اکیلے بیٹھے ہیں! یہ سب کہاں گئے؟"

گجادھر بابو کے دل میں پھانس سی چبھی۔ "اپنے اپنے کام میں لگ گئے ہیں۔ آخر بچے ہی ہیں۔"

بیوی آ کر چوکے میں بیٹھ گئیں۔ انھوں نے ناک بھوں چڑھا کر چاروں طرف بکھرے جوٹھے برتنوں کو دیکھا، پھر بولیں، "سارے میں جوٹھے برتن پڑے ہیں۔ اس گھر میں کرم دھرم کچھ نہیں ہے۔ یہ سب گئے کہاں؟ پوجا کر کے سیدھے چوکے میں گھسو۔" پھر انھوں نے نوکر کو پکارا۔ جب جواب نہ ملا تو ایک بار اور زور سے آواز دی۔ پھر شوہر کی طرف دیکھ کر بولیں، "بہو نے بھیجا ہو گا بازار۔" اور ایک لمبی سانس لے کر چپ ہو رہیں۔

گجادھر بابو بیٹھ کر چائے اور ناشتے کا انتظار کرنے لگے۔ انہیں اچانک گنیشی کی یاد آ گئی۔ روز صبح پسنجر آنے سے پہلے وہ گرم گرم پوریاں اور جلیبی بناتا تھا۔ گجادھر بابو جب تک اٹھ کر تیار ہوتے، ان کے لیے جلیبیاں اور چائے لا کر رکھ دیتا تھا۔ چائے بھی کتنی بڑھیا، کانچ کے گلاس میں اوپر تک لبالب بھری، پورے ڈھائی چمچ چینی اور گاڑھی ملائی۔ ٹرین چلتے ہی رانی پور لیٹ پہنچے، گنیشی نے چائے پہنچانے میں کبھی دیر نہیں کی۔ کیا مجال کہ اس سے کبھی کچھ کہنا پڑے۔

بیوی کی شکایت بھری آواز سن کر انہیں دھکا سا لگا۔ وہ کہہ رہی تھی، "سارا دن اسی کھچ کھچ میں نکل جاتا ہے۔ اس گرہستی کا دھندا پیٹتے پیٹتے عمر بیت گئی۔ کوئی ذرا ہاتھ بھی نہیں بٹاتا۔"

"بہو کیا کیا کرتی ہے؟" گجادھر بابو نے پوچھا۔

"پڑی رہتی ہے۔ بسنتی کو تو پھر کھو کالج جانا ہوتا ہے۔"

گجادھر بابو نے جوش میں آ کر بسنتی کو آواز دی۔ بسنتی بھابھی کے کمرے سے نکلی تو گجادھر بابو نے کہا، "بسنتی، آج سے شام کا کھانا بنانے کی ذمے داری تمہاری ہے۔ صبح کا کھانا تمہاری بھابھی بنائے گی۔"

بسنتی منہ لٹکا کر بولی، "بابوجی، پڑھنا بھی تو ہوتا ہے۔"

گجادھر بابو نے پیار سے سمجھایا۔ "تم صبح پڑھ لیا کرو۔ تمہاری ماں بوڑھی ہوئی، اس کے جسم میں اب طاقت نہیں ہے۔ تم ہو، تمہاری بھابھی ہے، دونوں کام میں ہاتھ بٹایا کرو۔"

بسنتی چپ رہی۔ اس کے جانے کے بعد اس کی ماں نے دھیرے سے کہا، "پڑھنے کا تو بہانہ ہے۔ کبھی جی ہی نہیں لگتا۔ لگے کیسے؟ شیلا ہی سے فرصت نہیں۔ بڑے بڑے لڑکے ہیں ان کے گھر میں۔ ہر وقت وہاں گھسے رہنا مجھے نہیں بھاتا۔ منع کرو تو سنتی ہی نہیں۔"

Scanned with CamScanner

ناشتا کر کے گجادھر بابو بیٹھک میں چلے گئے۔ گھر چھوٹا تھا اور سیٹنگ کچھ ایسی ہو چکی تھی کہ اس میں گجادھر بابو کے لیے کوئی جگہ نہ بچی تھی۔ جیسے کسی مہمان کے لیے وقتی طور پر کوئی بندوبست کر دیا جاتا ہے، اسی طرح بیٹھک میں کرسیوں کو دیوار سے ٹکا کر ان کے لیے پتلی سی چارپائی ڈال دی گئی تھی۔

گجادھر بابو اس کمرے میں پڑے پڑے کبھی اپنے آپ ہی اس وقتی بندوبست پر غور کرتے۔ انھیں یاد آتی اُن گاڑیوں کی جو آتیں اور تھوڑی دیر رک کر کسی اَور مقام کی طرف بڑھ جاتیں۔ گھر چھوٹا ہونے کی وجہ سے بیٹھک ہی میں اپنا انتظام کیا تھا۔ ان کی بیوی کے پاس ضرور ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، پر وہ ایک طرف اچار کے مرتبانوں، دال چاول کے کنستروں اور گھی کے ڈبوں سے گھرا ہوا تھا۔ دوسری طرف پرانی رضائیاں دریوں میں لپٹی اور رسّیوں میں بندھی رکھی تھیں۔ ان کے پاس ایک بڑے سے ٹین کے بکس میں گھر بھر کے گرم کپڑے رکھے تھے۔ بیچ میں ایک الگنی بندھی ہوئی تھی جس پر زیادہ تر بسنتی کے کپڑے بے ترتیبی سے ٹنگے تھے۔ وہ جان بوجھ کر اس کمرے میں جانے سے بچتے تھے۔ گھر کا دوسرا کمرہ اَمر اور اس کی بیوی کے پاس تھا۔ تیسرا کمرہ جو سامنے کی طرف تھا، بیٹھک تھا۔ کرسیوں پر نیلی گدّیاں اور بہو کے ہاتھ کے کاڑھے کشن پڑے تھے۔

جب بھی ان کی بیوی کو کوئی لمبی شکایت کرنی ہوتی تو وہ اپنی چٹائی بیٹھک میں ڈال پڑ جاتی تھیں۔ ایک دن وہ چٹائی لے کر آ گئیں۔ گجادھر بابو نے گھر گرہستی کی باتیں چھیڑیں۔ وہ گھر کا سُبھاؤ دیکھ رہے تھے۔ بہت ہلکے سے انھوں نے کہا، "اب ہاتھ میں پیسا کم رہے گا۔ کچھ خرچ کم ہونا چاہیے۔"

"سبھی خرچ تو واجب واجب ہے۔ کس کا پیٹ کاٹوں؟ یہی جوڑ گانٹھ کرتے کرتے بوڑھی ہو گئی۔ نہ من بھر پہنا نہ اوڑھا۔"

گجادھر بابو نے زخمی اور دکھی نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔ ان سے اپنی حیثیت چھپی نہ تھی۔ ان کی بیوی تنگی کا رونا روتیں، یہ فطری بات تھی، لیکن ان کے لہجے میں چھپے طنز کا احساس گجادھر بابو کو بہت چبھا۔ ان سے اگر اس مسئلے پر بات کی جاتی کہ گھر کا انتظام کیسے چلے، کیسے پورا ہو، تو شاید انھیں کچھ سکون ملتا۔ لیکن ان سے صرف شکایت ہی کی جاتی تھی، جیسے کنبے کی ساری پریشانیوں کے وہی ذمے دار ہوں۔

"تمھیں کس بات کی کمی ہے اَمر کی ماں۔ گھر میں بہو ہے، لڑکے بچے ہیں۔ صرف روپے ہی سے آدمی امیر نہیں ہوتا،" گجادھر بابو نے کہا، اور کہنے کے ساتھ ہی اندازہ لگایا کہ یہ محض ان کی اندر کی سوچ ہے، ایسی کہ ان کی بیوی نہیں سمجھ سکتی۔

"ہاں، بڑا سکھ ہے بہو سے نا۔ آج کھانا بنانے گئی ہے، دیکھو کیا ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر بیوی نے آنکھیں موند لیں اور سو گئی۔ گجادھر بابو بیٹھے بیوی کو دیکھتے رہ گئے۔ کیا یہی تھی ان کی بیوی جس کے نرم ہاتھوں کے لمس، جس کی مسکراہٹ کی یاد میں انھوں نے زندگی کاٹ دی تھی؟ انھیں لگا کہ وہ خوب صورت دوشیزہ زندگی کی راہ میں کہیں کھو گئی ہے اور اس کی جگہ آج جو عورت ہے وہ ان کے دل اور روح کے لیے یکسر اجنبی ہے۔ گہری نیند میں سوئی ہوئی عورت کا جسم ایک دم بے ڈول اور بھدّا لگ رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

چہرہ سُتا ہوا اور بے رونق سا۔ گجادھر بابو ایک پلک بیوی کو دیکھتے رہ گئے اور پھر لیٹ کر چھت کی طرف تاکنے لگے۔

اندر کچھ گرا اور ان کی بیوی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ "لو بلی نے کچھ گرا دیا شاید!" وہ اندر بھاگیں۔ تھوڑی دیر میں لوٹ کر آئیں تو ان کا منہ پھولا ہوا تھا۔ "دیکھا بہو کو، رسوئی کھلی چھوڑ آئی۔ بلی نے دال کی پتیلی گرا دی۔ سبھی تو کھانے کو ہیں، اب کیا کھلاؤں گی۔" وہ سانس لینے کو رکیں اور بولیں، "ایک ترکاری اور چار پراٹھے بنانے میں سارا ڈبا گھی انڈیل کر رکھ دیا۔ ذرا بھی درد نہیں ہے۔ کمانے والا ہڈیاں توڑے اور یہاں چیزیں لٹیں۔ مجھے تو معلوم تھا کہ یہ سب کام کسی کے بس کا نہیں ہے۔"

گجادھر بابو کو لگا کہ بیوی اور کچھ بولے گی تو کان جھنجھنا اٹھیں گے۔ ہونٹ بھینچ کر کروٹ لے انھوں نے پیٹھ بیوی کی طرف کر لی۔

رات کا کھانا تو بسنتی نے جان بوجھ کر ایسا بنایا تھا کہ ایک نوالہ حلق سے نہ اُترے۔ گجادھر بابو چپ چاپ کھا کر اٹھ گئے، پر نریندر تھالی سرکا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا، "میں ایسا کھانا نہیں کھا سکتا۔"

بسنتی تنک کر بولی، "تو نہ کھاؤ۔ کون تمہاری خوشامد کرتا ہے۔"

"تم سے کھانا بنانے کو کہا کس نے تھا؟" نریندر چلایا۔

"بابوجی نے۔"

"بابوجی کو بیٹھے بیٹھے یہی سُوجھتا ہے۔"

بسنتی کو اٹھا کر ماں نے نریندر کو منایا اور اپنے ہاتھ سے اسے کچھ بنا کر کھلایا۔ گجادھر بابو نے بعد میں بیوی سے کہا، "اتنی بڑی لڑکی ہو گئی ہے اور اسے کھانا بنانے کا ڈھنگ نہیں آیا؟"

"ارے آتا تو سب کچھ ہے، کرنا نہیں چاہتی،" بیوی نے جواب دیا۔

اگلی شام ماں کو رسوئی میں دیکھ کر کپڑے بدل کر بسنتی باہر آئی تو بیٹھک سے گجادھر بابو نے ٹوک دیا۔ "کہاں جا رہی ہو؟"

"پڑوس میں، شیلا کے گھر،" بسنتی نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اندر جا کر پڑھو!" گجادھر بابو نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ کچھ دیر تذبذب میں کھڑی رہ کر بسنتی اندر چلی گئی۔

گجادھر بابو روز ٹہلنے چلے جاتے تھے۔ لوٹ کر آئے تو بیوی نے کہا، "کیا کہہ دیا بسنتی سے؟ شام سے منہ لپیٹے پڑی ہے۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔"

گجادھر بابو جھنجھلا اٹھے۔ بیوی کی بات کا انھوں نے جواب نہیں دیا۔ انھوں نے دل میں طے کر لیا کہ بسنتی کی شادی جلد کر دینی ہے۔

اس دن کے بعد سے بسنتی باپ سے کٹی کٹی رہنے لگی۔ جانا ہوتا تو پچھواڑے سے جاتی۔ گجادھر بابو نے دو ایک بار بیوی سے پوچھا تو جواب ملا، "روٹھی ہوئی ہے۔"

Scanned with CamScanner

گجادھر بابو کو غصہ آیا۔ "لڑکی کے اتنے مزاج! جانے سے روک دیا تو باپ سے بولے گی نہیں؟"

پھر ان کی بیوی نے خبر دی، "امر الگ رہنے کی سوچ رہا ہے۔"

"کیوں؟" گجادھر بابو نے حیرت سے پوچھا۔

بیوی نے کوئی صاف جواب نہیں دیا۔ امر اور اس کی بیوی کو بہت شکایتیں تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ گجادھر بابو ہمیشہ بیٹھک میں پڑے رہتے ہیں، کوئی آنے جانے والا ہو تو کہیں بٹھانے کی جگہ نہیں۔ امر کو اب بھی وہ چھوٹا سمجھتے تھے اور موقع بے موقع ٹوک دیتے تھے۔ بہو کو کام کرنا پڑتا تھا اور ساس جب تب پھوہڑپن کے طعنے دیا کرتی تھیں۔

"ہمارے آنے سے پہلے بھی کبھی کوئی ایسی بات ہوئی تھی؟" گجادھر بابو نے بیوی سے پوچھا۔

بیوی نے سر ہلا کر بتایا کہ نہیں۔ پہلے امر گھر کا مالک بن کے رہتا تھا، بہو کو کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ امر کے دوستوں کا اکثر ہی اڈا جمارہتا تھا اور اندر سے ناشتا چائے تیار ہو کر جاتا رہتا تھا۔ بسنتی کو بھی وہی اچھا لگتا تھا۔

گجادھر بابو نے دھیرے سے کہا، "امر سے کہو جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔"

اگلے دن وہ لوٹ کر آئے تو انھوں نے دیکھا کہ بیٹھک میں ان کی چارپائی نہیں ہے۔ اندر جا کر پوچھنے ہی والے تھے کہ ان کی نظر رسوئی میں بیٹھی بیوی پر پڑی۔ انھوں نے یہ پوچھنے کو منہ کھولا کہ بہو کہاں ہے، پھر کچھ یاد کر کے چپ ہو گئے۔ بیوی کی کوٹھری میں جھانکا تو اچار، رضائیوں اور کنستر کے بیچ اپنی چارپائی لگی پائی۔ گجادھر بابو نے کوٹ اتارا اور ٹانگنے کے لیے دیوار پر نظر دوڑائی۔ پھر اسے موڑ کر الگنی کے کچھ کپڑے کھسکا کر ایک کنارے ٹانگ دیا۔ کچھ کھائے بغیر ہی اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ کچھ بھی ہو، تن آخر بوڑھا ہی تھا۔ صبح شام کچھ دیر ٹہلنے ضرور چلے جاتے تھے، پر آتے آتے تھک جاتے تھے۔

گجادھر بابو کو اپنا بڑا سا کھلا کوارٹر یاد آیا۔ بے فکر زندگی۔ صبح پسنجر ٹرین آنے پر اسٹیشن کی چہل پہل، جانے انجانے چہرے، اور پٹری پر ریل کے پہیوں کی کھٹ کھٹ جو ان کے لیے مدھر سنگیت کی طرح تھی۔ طوفان اور ڈاک گاڑی کے انجنوں کی چنگھاڑ ان کی اکیلی راتوں کی ساتھی تھی۔ سیٹھ رامجی مل کی مل کے کچھ لوگ کبھی ان کے پاس آ بیٹھتے۔ وہی ان کا حلقہ تھا، وہی ان کے ساتھی تھے۔ وہ زندگی اب انھیں ایک کھوئی ہوئی دولت معلوم ہوئی۔ انھیں لگا کہ وہ زندگی سے دھوکا کھا گئے، ٹھگے گئے۔ انھوں نے جو کچھ چاہا اس میں سے ایک بوند بھی انھیں نہیں ملا۔

لیٹے ہوئے وہ گھر کے اندر سے آتی ہوئی مختلف آوازیں سنتے رہے۔ بہو اور ساس کی چھوٹی موٹی جھڑپ، بالٹی پر کھلے نل کی آواز، رسوئی کے برتنوں کی کھٹ پٹ، اور اسی میں دو گوریّوں کی بات چیت۔ اور اچانک ہی انھوں نے ارادہ کر لیا کہ اب گھر کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیں گے۔ اگر گھر کے مالک کے لیے پورے گھر میں ایک چارپائی کی جگہ نہیں ہے تو یہیں پڑے رہیں گے۔ اگر کہیں اور ڈال دی گئی

Scanned with CamScanner

تو وہاں چلے جائیں گے۔ اگر بچوں کی نظر میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہے یا اس گھر میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے تو اپنے گھر میں پردیسیوں کی طرح پڑے رہیں گے۔

اور اس دن کے بعد گجادھر بابو سچ مچ کچھ نہیں بولے۔ نریندر روپے مانگنے آیا تو بغیر وجہ پوچھے اسے روپے دے دیے۔ بسنتی کافی اندھیرا ہو جانے کے بعد بھی پڑوس میں رہی تو بھی انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ پر اُنھیں سب سے بڑا غم یہ تھا کہ ان کی بیوی نے بھی ان میں اتنی بڑی تبدیلی ہونے کا کوئی اثر نہیں لیا۔ وہ دل ہی دل میں کتنا بار ڈھور ہے ہیں، اس بات سے وہ بے خبر ہی رہیں۔ بلکہ انھیں شوہر کے گھر کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرنے سے ایک طرح سکون ہی تھا۔ کبھی کبھی کہہ بھی اٹھتیں، "ٹھیک ہی ہے، آپ بیچ میں نہ پڑا کیجیے۔ بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ ہمارا جو فرض ہے وہ پورا کر رہے ہیں۔ پڑھا رہے ہیں، شادی کر دیں گے۔"

گجادھر بابو نے چوٹ کھائی نظر سے بیوی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ وہ بیوی اور بچوں کے لیے روزی کمانے کا ذریعہ بھر ہی تھے۔ جس شخص کے وجود سے ان کی بیوی کو مانگ میں سیندور بھرنے کا حق حاصل ہے، سماج میں اس کی عزت ہے، اس کے سامنے وہ دو وقت کی روٹی رکھ دینے ہی سے سارے فرائض سے چھٹی پا لیتی ہے۔ وہ گھی اور چینی کے ڈبوں میں اس قدر گم ہے کہ وہی اب اس کی پوری دنیا کا مرکز ہیں۔ گجادھر بابو اب اس کی زندگی کا محور نہیں رہ گئے۔ اب ان کا بیٹی کی شادی کا حوصلہ بھی ماند پڑ گیا۔

کسی بھی بات میں دخل نہ دینے کے عہد کے باوجود بھی ان کا وجود اس ماحول کا حصہ نہ بن سکا۔ ان کی موجودگی اس گھر میں اتنی بے جوڑ سی لگنے لگی تھی جیسے سجی ہوئی بیٹھک میں ان کی چارپائی ہو۔ ان کی ساری خوشی ایک گہری مایوسی میں ڈوب گئی۔

اتنے سب ارادوں کے باوجود ایک دن بیچ میں دخل دے بیٹھے۔ بیوی اپنی عادت کے مطابق نوکر کا گلہ شکوہ کر رہی تھیں: کتنا کام چور ہے، سودے میں سے پیسے بھی کاٹتا ہے، کھانے پر بیٹھے تو کھاتا ہی چلا جاتا ہے۔ گجادھر بابو کو برابر یہ محسوس ہوتا کہ ان کے گھر کا خرچ ان کی حیثیت سے کہیں زیادہ ہے۔ بیوی کی بات سن کر بولے، "نوکر کا خرچ بالکل بے کار ہے۔ چھوٹا موٹا کام ہوتا ہے، گھر میں تین مرد ہیں، کوئی نہ کوئی کر ہی دے گا۔" انھوں نے اسی دن نوکر کا حساب کر دیا۔ امر دفتر سے آیا تو نوکر کو پکارنے لگا۔ امر کی بیوی بولی، "بابوجی نے نوکر چھڑا دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"کہتے ہیں خرچ بہت ہے۔"

بات سادہ سی تھی پر جس لہجے میں بہو بولی گجادھر بابو کو کھٹک گیا۔ اس دن طبیعت کچھ بوجھل ہونے کی وجہ سے گجادھر بابو ٹہلنے نہیں گئے۔ کابلی میں اٹھ کر بتی بھی نہیں جلائی تھی۔ اس بات سے بے خبر، نریندر ماں سے کہنے لگا، "اماں، تم بابوجی سے کہتیں کیوں نہیں؟ بیٹھے بٹھائے نوکر چھڑا دیا۔ اگر

Scanned with CamScanner

بابوجی یہ سمجھتے ہیں کہ میں سائیکل پر گیہوں رکھ کر آٹا پسوانے جاؤں گا تو یہ نہیں ہونے کا!"

"ہاں اماں!" یہ بسنتی کی آواز تھی۔ "میں کالج بھی جاؤں اور گھر لوٹ کر جھاڑو بھی لگاؤں، یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

"بوڑھے آدمی ہیں،" امر بھنبھنایا، "چپ چاپ پڑے رہیں۔ ہر چیز میں دخل کیوں دیتے ہیں؟"

بیوی نے بڑے طنز سے کہا، "اور کچھ نہیں تو تمہاری بیوی کو رسوئی میں بھیج دیا۔ وہ گئی تو پندرہ دن کا راشن پانچ دن میں بنا کے رکھ دیا۔" بہو کچھ کہے اس سے پہلے وہ رسوئی میں گھس گئیں۔ کچھ دیر بعد اپنی کوٹھری میں آئیں اور بجلی جلائی تو گجادھر بابو کو لیٹے دیکھ کر سٹپٹا گئیں۔ گجادھر بابو کے چہرے کے اتار چڑھاو کا وہ کچھ اندازہ نہ لگا پائیں۔ وہ چپ آنکھیں بند کیے لیٹے رہے۔

گجادھر بابو چشمی ہاتھ میں لیے اندر آئے اور بیوی کو پکارا۔ وہ بھیگے ہاتھ لیے نکلیں اور آنچل سے ہاتھ پونچھتے ہوئے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ گجادھر بابو نے بغیر کسی تمہید کے کہا، "مجھے سیٹھ رامجی مل کی چینی مل میں نوکری مل گئی ہے۔ خالی بیٹھے رہنے سے تو چار پیسے گھر میں آئیں، یہی اچھا ہے۔ انھوں نے تو پہلے ہی کہا تھا، میں نے ہی انکار کر دیا تھا۔" پھر کچھ رک کر، جیسے بجھی ہوئی آگ میں کوئی چنگاری چمک اٹھے، انھوں نے دھیمے لہجے میں کہا، "میں نے سوچا تھا کہ برسوں تم لوگوں سے الگ رہنے کے بعد ریٹائرمنٹ پا کر کنبے کے ساتھ رہوں گا۔ خیر۔ پرسوں جانا ہے۔ تم بھی چلو گی؟"

"مَیں؟" بیوی نے ہڑبڑا کر کہا۔ "میں چلی جاؤں گی تو یہاں کا کیا ہو گا؟ اتنی بڑی گرہستی، پھر سیانی لڑکی---"

بات بیچ میں کٹ گئی۔ گجادھر بابو نے تھکی ہوئی آواز میں کہا، "ٹھیک ہے، تم یہیں رہو۔ میں نے تو ایسے ہی کہا تھا۔" اور گہری خاموشی میں ڈوب گئے۔

نریندر نے بڑی مستعدی سے بستر باندھا اور رکشا بلا لیا۔ گجادھر بابو کا ٹین کا بکس اور پتلا سا بستر اس پر رکھ دیا۔ ناشتے کے لیے لڈو اور مٹھری کی ڈلیا ہاتھ میں لیے گجادھر بابو رکشا پر بیٹھ گئے۔ ایک نظر انھوں نے اپنے کنبے پر ڈالی، پھر دوسری طرف دیکھنے لگے، اور رکشا چل پڑا۔

ان کے جانے کے بعد سب اندر لوٹ گئے۔ بہو نے امر سے پوچھا، "سنیما لے چلیے گا نا؟" بسنتی نے اُچھل کر کہا، "بھیا ہمیں بھی!"

گجادھر بابو کی بیوی سیدھے رسوئی میں چلی گئیں۔ بچی ہوئی چیزوں کو کٹوردان میں رکھ کر اپنی کوٹھری میں لائیں اور کنستروں کے پاس رکھ دیا۔ پھر باہر آ کر کہا، "ارے نریندر، بابوجی کی چارپائی باہر نکال دے۔ اس میں چلنے تک کی جگہ نہیں ہے۔"

**

Scanned with CamScanner

راجیندر یادَو

ہندی سے ترجمہ: صدیق حسین

جہاں لکشمی قید ہے

ذرا ٹھہریے، یہ کہانی وِشنو کی پتنی لکشمی کے بارے میں نہیں، لکشمی نام کی ایک ایسی لڑکی کے بارے میں ہے جو اپنی قید سے چھُوٹنا چاہتی ہے۔ اِن دو ناموں میں ایسا مغالطہ ہونا فطری بات ہے، جیسا کہ کچھ لمحوں کے لیے گووند کو ہو گیا تھا۔

ایک دم گھبرا کر جب گووند کی آنکھ کھلی تو وہ پسینے سے تر تھا اور اُس کا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ اُسے لگا کہیں اچانک اُس کی دھڑکن بند نہ ہو جائے۔ اُس نے اندھیرے میں پانچ چھ بار پلکیں جھپکائیں۔ پہلی بار تو اُس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے، کیسا ہے۔ وہ سمت اور جگہ کا شعور ایک دم بھول گیا۔ جب پاس کے ہال کی گھڑی نے ایک گھنٹا بجایا تو اُس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ وہ گھڑی کہاں ہے، وہ خود کہاں ہے اور گھنٹا کہاں بج رہا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے اُسے دھیان آیا، اُس نے زور سے اپنے گلے کا پسینا پونچھا اور اُسے لگا کہ اُس کے دماغ میں پھر وہی کھٹ کھٹ گونج اٹھی ہے جو ابھی گونج رہی تھی۔

پتا نہیں سپنے میں یا سچ مچ ہی، گووند کو ایسا لگا تھا جیسے کسی نے کِواڑ پر تین چار بار کھٹ کھٹ کی ہو اور بہت گڑگڑا کر کہا ہو: "مجھے نکالو، مجھے نکالو!" اور وہ آواز کچھ ایسے پُراسرار انداز سے آ کر اُس کے وجود کو کونچنے لگی کہ وہ بوکھلا کر جاگ اٹھا۔ وہ سچ مچ کسی کی آواز تھی یا محض اُس کا وہم؟

پھر اُسے دھیرے دھیرے یاد آیا کہ یہ وہم ہی تھا اور وہ لکشمی کے بارے میں سوچتا ہوا ایسا مغلوب ہو کر سویا تھا کہ وہ سپنے میں بھی چھائی رہی۔ لیکن حقیقت میں یہ آواز کیسی عجیب تھی، کیسی صاف تھی۔ اُس نے کئی بار سُنا تھا کہ کسی فلاں عورت یا مرد سے سپنے میں آ کر کوئی کہتا تھا: "مجھے نکالو، مجھے نکالو!" پھر وہ

Scanned with CamScanner

دھیرے دھیرے جگہ کا پتا بھی بتانے لگتا تھا، اور وہاں کھدوانے پر اُسے کڑاہے یا ہانڈی میں بھرے سونے چاندی کے سکّے یا دولت ملی اور وہ دیکھتے دیکھتے مالامال ہو گیا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی غیر حقدار آدمی نے اس خزانے کو نکلوانا چاہا تو اس میں کوڑیاں اور کوئلے، یا پھر اُس کے کوڑھ پھوٹ آیا یا گھر میں کوئی موت ہو گئی۔ کہیں اسی طرح دھرتی کے نیچے سے اُسے کوئی لکشمی تو نہیں پکار رہی ہے؟ وہ بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ اُس کے دماغ میں پھر لکشمی کا قصّہ مجسم ہونے لگا۔ وہ بے سُدھ سا پڑا رہا۔

دور کہیں دوسرے گھڑیال نے پھر وہی ایک گھنٹا بجایا۔

گووند سے اب نہیں رہا گیا۔ رضائی کو چاروں طرف سے بند رکھے رکھے، بہت سنبھال کر اُس نے کہنی تک ہاتھ نکالا، لیٹے لیٹے الماری کے خانے سے کتابوں کاپیوں کی بغل سے آدھ جلی موم بتّی نکالی، وہیں کہیں سے کھوج کر دیاسلائی نکالی اور آدھا اُٹھ کر، تاکہ جاڑے میں دوسرا ہاتھ پورا نہ نکالنا پڑے، دو تین بار گھِس کر دیاسلائی جلائی، موم بتّی روشن کی اور پگھلے موم کی بوند ٹپکا کر اُسے دوات کے ڈھکن کے اوپر جما دیا۔ دھیرے دھیرے ہلتی روشنی میں اُس نے دیکھ لیا کہ پورے کواڑ بند ہیں اور دروازے کے سامنے والی دیوار میں بنے جالی لگے روشن دان کے اوپر دوسری منزل سے جو ہلکی ہلکی روشنی آتی ہے، وہ بھی بجھ چکی ہے۔ سب کچھ کتنا شانت ہو چکا ہے۔ بجلی کا سوئچ اگرچہ اُس کے تخت کے اوپر ہی لگا تھا، لیکن ایک تو جاڑے میں رضائی سمیت یا رضائی چھوڑ کر کھڑے ہونے کا آلکس، دوسرے لالہ روپارام کا ڈر۔ صبح ہی کہے گا، "گووند بابو، بڑی دیر تک پڑھائی ہو رہی ہے آج کل!" جس کا سیدھا مطلب ہو گا کہ "بڑی بجلی خرچ کرتے ہو!"

پھر اُس نے چپکے سے، جیسے کوئی اُسے دیکھ رہا ہو، تکیے کے نیچے سے رضائی کے اندر ہی اندر ہاتھ بڑھا کر وہ رسالہ نکال لیا اور گردن کے پاس سے ہاتھ نکال کر اُس کے سینتالیسویں صفحے کو بیسویں بار کھول کر بہت دیر تک گھورتا رہا۔ ایک بجے کی پٹھان کوٹ ایکسپریس جب دہاڑتی ہوئی گزر گئی تو اچانک اُسے ہوش آیا۔ جو دو صفحے ۔۔۔ ۴۷ اور ۴۸ ۔۔ اُس کے سامنے کھلے ہوئے تھے، اُن پر جگہ جگہ نیلی روشنائی سے کچھ سطروں کے نیچے لائنیں کھینچی گئی تھیں۔ یہی نہیں، اُس صفحے کا کونا موڑ کر انھیں لائنوں کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی تھی۔ اب تک گووند ان سطروں یا ان کے آس پاس کی سطروں کو بیس سے زیادہ بار گھور چکا تھا۔ اُس نے شک بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک بار پھر اُن سطروں کو پڑھا۔

جتنی بار وہ انھیں پڑھتا، اُس کا دل ایک انجانے آنند کے بوجھ سے دھڑک کر ڈوبنے لگتا اور دماغ اُسی طرح بھنانے لگتا جیسا اُس وقت بھنایا تھا جب یہ رسالہ اُسے ملا تھا۔ اگرچہ اس دوران اُس کی ذہنی کیفیت کئی مشکل مرحلوں سے گزر چکی تھی، پھر بھی وہ بہت دیر تک کالی روشنائی میں چھپے حروف کو ٹھہری ہوئی نگاہوں سے گھورتا رہا۔ دھیرے دھیرے اُسے ایسا لگا کہ حروف کی یہ سطر ایک ایسی کھڑکی کی جالی ہے جس کے پیچھے بکھرے بالوں والی ایک بے پروا لڑکی کا چہرہ جھانک رہا ہے۔ اور پھر اُس کے دماغ میں بچپن میں سُنی ہوئی کہانی اُبھرنے لگی۔ شکار کھیلتے میں ساتھیوں کا ساتھ چھوٹ جانے پر بھٹکتا ہوا راجکمار اپنے تھکے ماندے گھوڑے پر، بالکل ویرانے میں، سمندر کے کنارے بنے ایک بہت بڑے سنسان قلعے کے نیچے جا پہنچا۔

وہاں اوپر کھڑکی میں اُسے ایک نہایت سندر راجکماری بیٹھی دکھائی دی جسے ایک راکھشس نے وہاں لا کر قید کر دیا تھا۔ کھڑکی میں بیٹھی راجکماری کی تصویر، چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے ساتھ، گووند کی آنکھوں کے سامنے واضح اور مجسم ہو گئی۔ اور اُسے لگا جیسے وہی راجکماری چھپی ہوئی سطروں کی ان لکیروں کے پیچھے سے جھانک رہی ہے۔ اُس کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں سوکھ گئی ہیں، ہونٹ پپڑا گئے ہیں، چہرہ مُرجھا گیا ہے اور ریشمی بال مکڑی کے جالے کی طرح لگتے ہیں، جیسے اُس کے پورے بدن سے ایک آواز نکلتی ہو: "مجھے چھڑاؤ، مجھے چھڑاؤ!"

گووند کے دل میں اُس انجان راجکماری کو چھُڑانے کے لیے کوئی جیسے رہ رہ کر کریدنے لگا۔ ایک آدھ بار تو اُسے بڑی زوردار طلب محسوس ہوئی کہ اپنے اندر رہ رہ کر کچھ کرنے کے جوش کو اپنے تخت اور کوٹھری کی دیوار کے بیچ کی دو فٹ چوڑی گلی میں گھوم گھوم کر دور کر دے۔

تو کیا سچ مچ لکشمی نے یہ سب اُسی کے لیے لکھا ہے؟ لیکن اُس نے تو لکشمی کو دیکھا تک نہیں۔ اگر اپنے تصوّر میں کسی جوان لڑکی کا چہرہ لائے بھی تو وہ آخر کیسی ہو؟ کچھ اَور بھی باتیں تھیں کہ وہ لکشمی کے روپ میں کسی سُندر لڑکی کے چہرے کا تصوّر کرتے ڈرتا تھا۔ اُس کی ٹھیک شکل صورت اور عمر بھی تو نہیں معلوم تھی اُسے۔۔۔

گووند اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب اُسی کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ لائنیں کھینچ کر اُسی کو توجہ دلائی گئی ہے۔ پھر بھی وہ اس غیر متوقع بات پر یقین نہیں کر پاتا تھا۔ وہ اپنے کو اس لائق بھی نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی لڑکی اُسے اشارہ کرے گی۔ یوں شہروں کے بارے میں اُس نے بہت کچھ سن رکھا تھا، لیکن یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ گاؤں سے انٹر پاس کر کے شہر آنے کے ایک ہی ہفتے میں ایک ایسی خوش نصیبی اُس کے سامنے آ جائے گی۔

وہ جب جب ان سطروں کو پڑھتا، تب تب اُس کا سر اس طرح چکرانے لگتا جیسے کسی دس منزلہ مکان کے نیچے جھانک رہا ہو۔ جب اُس نے پہلے پہل یہ سطریں دیکھی تھیں تو اس طرح اُچھل پڑا تھا جیسے ہاتھ میں انگارا آ گیا ہو۔

بات یہ ہوئی کہ وہ چکّی والے ہال میں اینٹوں کے تخت جیسے بنے چبوترے پر بڑی پُرانی کاٹھ کی صندوقچی کے اوپر پتلا رجسٹر کھولے دن بھر کا حساب ملا رہا تھا۔ تبھی لالہ روپارام کا سب سے چھوٹا، نو دس سال کا ۔۔ رام سروپ اُس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ یہ لڑکا ایک پھٹے پُرانے چسٹر کی (جو یقیناً کسی بڑے بھائی کے چسٹر کو کٹوا کر بنوایا گیا ہو گا) جیبوں میں دونوں ہاتھ ٹھونسے، پاس کھڑا ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔

گووند جب پہلے ہی دن آیا تھا اور حساب کر رہا تھا، تبھی یہ لڑکا بھی آ کھڑا ہوا تھا۔ اُس دن لالہ روپارام بھی تھے، چناں چہ صرف یہ دکھانے کے لیے کہ وہ ان کے سپوت میں بھی کافی دل چسپی رکھتا ہے، اُس نے اس سے رواج کے مطابق نام، عمر اور اسکول کلاس وغیرہ پوچھے تھے۔ نام رام سروپ، عمر نو سال، چنگی پرائمری اسکول میں چوتھی کلاس میں پڑھتا تھا۔ پھر تو صبح شام گووند اُسے چسٹر کے سائے ہی سے جاننے

Scanned with CamScanner

لگا: شکل دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ چسٹر کے نیچے نیکر پہنے ہونے کے سبب اُس کی پتلی ٹانگیں کھلی رہتیں اور وہ پیروں میں بہت پُرانے کِرمچ کے جوتے پہنے رہتا جن کی پھٹی نکلی زبانوں کو دیکھ کر اُسے ہمیشہ دُم کٹے کتے کی پونچھ کا خیال آجاتا تھا۔

کچھ دیر اس کا لکھنا تاکتے رہ کر لڑکے نے چسٹر کے بٹنوں کے کساو اور چھاتی کے بیچ میں رکھا رسالہ نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا اور بولا: "منشی جی، لکشمی دیدی نے کہا ہے، ہمیں کچھ اَور پڑھنے کو دیجیے۔"

"اچھا، کل دیں گے،" دل ہی دل میں بھنّا کر اُس نے کہا۔

یہاں آکر اُسے جو "منشی جی" کا نیا خطاب ملا، اُسے سن کر اس کی آتما خاک ہو جاتی۔ "منشی" نام کے ساتھ جو ایک کان پر قلم لگائے، گول مَیلی ٹوپی اور پُرانا کوٹ پہنے، مڑے تڑے آدمی کی تصویر سامنے آتی ہے، اُسے بیس بائیس سال کا نوجوان گووند سنبھال نہ پاتا۔

لالہ روپارام اُسی کے گاؤں کے ہیں۔ شاید اُس کے پِتا کے ساتھ دو تین جماعت پڑھے بھی تھے۔ شہر آتے ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر پڑھائی چلا سکنے کے لیے کوئی ٹیوشن یا چھوٹا موٹا پارٹ ٹائم کام حاصل کرنے کی غرض سے جب وہ لالہ روپارام سے بھی ملا تو انھوں نے انتہائی گرم جوشی سے اُس کے مرحوم باپ کو یاد کر کے کہا: "بھیّا، تم تو اپنے ہی بچے ہو۔ ذرا ہماری چکی کا حساب کتاب گھنٹے آدھ گھنٹے دیکھ لیا کرو، اور مزے سے چکی کے پاس جو کوٹھری ہے اُس میں پڑے رہو۔ اپنا پڑھو۔ آٹے کی تو یہاں کمی ہے ہی نہیں۔" اور جب وہ احسان مندی سے گد گد اُن کی کوٹھری میں آگیا تو پہلی رات حساب لکھنے کا طریقہ سمجھاتے ہوئے لالہ روپارام، موتیابند والے چشمے کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے مورپنکھ کے چندوے جیسی دکھتی آنکھوں اور موٹے ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے، اُس کی توقیر بڑھانے کو "منشی جی" کہہ بیٹھے تو وہ چونک گیا۔ لیکن اُس نے تہیہ کر لیا کہ یہاں جم جانے کے بعد سختی سے اس لفظ کی مزاحمت کرے گا۔ رام سروپ سے "منشی جی" کا خطاب سن کر اُس کی بھنویں تن گئیں، اسی لیے اُس نے رُکھائی سے جواب دیا تھا۔

"کل ضرور دیجیے گا،" رام سروپ نے تاکید کی۔

"ہاں بھائی، ضرور دوں گا،" اس نے دانت پیس کر کہنا چاہا، لیکن چپ ہی رہا۔ لکشمی کا نام وہ اکثر سنتا تھا۔ حالاں کہ اُس کی کوٹھری سڑک کی طرف الگ ہی پڑتی تھی، لیکن اُس میں پیچھے کی طرف جو ایک چھوٹا سا جالی دار روشن دان تھا، وہ گھر کے اندر نیچے کی منزل کے صحن میں کھلتا تھا۔ لالہ روپارام کا کنبہ اوپر کی منزل میں رہتا تھا اور نیچے سامنے کی طرف پن چکی تھی۔ پیچھے کئی طرح کی چیزوں کا اسٹور روم تھا۔ اس لکشمی نام کے واسطے اُسے اس لیے بھی بہت تجسس اور دل چسپی تھی کہ چاہے کوٹھری میں ہو یا باہر پن چکی کے ہال میں، ہر پانچویں منٹ اُس کا نام مختلف طریقوں سے سنائی دے جاتا تھا۔ "لکشمی بیوی نے یہ کہا ہے"، "روپے لکشمی بیوی کے پاس ہیں"، "چابی لکشمی بیوی کو دے دینا"--- اور اس کے جواب میں جو ایک باریک، تیکھی سی پُراعتماد آواز سنائی دیتی تھی اُسے گووند پہچاننے لگا تھا۔ اُس نے اندازے سے سمجھ

لیا تھا کہ یہی لکشمی کی آواز ہے۔ لیکن وہ خود کیسی ہے؟ اُس کی ایک جھلک بھر دیکھ پانے کو اُس کا دل کبھی کبھی بُری طرح تڑپ سا اُٹھتا۔ لیکن پہلے کچھ دن اُسے اپنا اثر جمانا تھا، اس لیے وہ آنکھ اٹھا کر بھی اندر دیکھنے کی کوشش نہ کرتا۔ دل ہی دل میں اُس نے سمجھ لیا کہ یہ لکشمی کافی اہم ہستی ہے۔ دقت یہ تھی کہ اندر کچھ دکھائی بھی تو نہیں دیتا تھا۔ سڑک کے کنارے تین چار دروازوں والی اس چکی کے بال کے بعد ایک آٹھ دس فٹ لمبی گلی تھی، تب پھر اندر صحن تھا۔ پہلی منزل کافی اونچی اور مضبوط تھی اور صحن کے اوپر لوہے کا جال پڑا ہوا تھا۔ اُس پر سے اوپر کی منزل کے لوگ جب گزرتے تھے تو، لوہے کی جھنجھناہٹ سے، پہلے تو اُس کا دھیان ہر بار اُدھر چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھی بچے اُچھل اُچھل کر اس پر کودنے لگتے تھے۔ یہاں سے جب تک کسی بہانے سے پوری گلی پار نہ کی جائے، کچھ بھی نظر آنا ناممکن تھا۔ چوں کہ غسل خانہ اور نل وغیرہ اسی صحن میں تھے، جن کی وجہ سے نیچے اکثر سیلن اور کیچڑ رہتی تھی، اس لیے صبح صحن میں جاتے ہوئے وہ نہایت سیدھے لڑکے کی طرح نگاہیں نیچی کیے ہوئے بھی اوپر کے حالات جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھ پانے کی اُس میں ہمت نہ تھی۔ اُس نے اپنی کوٹھری کا واحد دروازہ بند کر کے تخت پر چڑھ کر لکڑی کے جالوں اور دھُول سے بھرے جالی دار روشن دان سے جھانک کر بھی اوپر کے حالات جاننے کی کوشش کی تھی، لیکن یہ کم بخت جالی کچھ ایسے ڈھنگ سے بنی تھی کہ اس کے فوکس میں سامنے والا پورا چھجا اور ایک آدھ فٹ لوہے کا جال ہی آ پاتا تھا۔ وہاں کئی بار اُسے لگا جیسے دو چھوٹے چھوٹے تلوے گزرے۔ بہت کوشش کرنے پر ٹخنے دکھے۔۔۔ ہاں، ہیں تو کسی لڑکی کے پیر ہی، کیوں کہ ساتھ میں دھوتی کا کنارا بھی جھلکا تھا۔۔۔ اُس نے ایک گہری سانس لی اور تخت سے اُترتے ہوئے بڑے اداکارانہ انداز میں چھاتی پر ہاتھ مار کر بُدبُدایا: "ارے لکشمی ظالم، ایک جھلک تو دکھا دیتی!"

"منشی جی، تم تو دیکھ رہے ہو۔ لکھتے کیوں نہیں؟" رام سروپ نے جب دیکھا کہ گووند ہولڈر کا پچھلا سرا دانتوں پر آہستہ آہستہ ٹھونکتے ہوئے، پلکیں جھپکائے بغیر، حساب کی کاپی میں کچھ گھور رہا ہے، تو پتا نہیں کیسے یہ بات اُس کی سمجھ میں آ گئی کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے اُس کا تعلق سامنے رکھے حساب سے نہیں ہے۔

اُس نے چونک کر لڑکے کی طرف دیکھا اور چوری پکڑی جانے پر جھینپ کر مسکرایا۔ تبھی اچانک ایک بات اُس کے دماغ میں کوندی۔ یہ لکشمی رام سروپ کی بہن ہی تو ہے۔ ضرور اُس کا چہرہ اس سے کافی ملتا جلتا ہو گا۔ اس بار اُس نے دھیان سے رام سروپ کا چہرہ دیکھا کہ سُندر ہے یا نہیں۔ پھر اپنی بے وقوفی پر مسکرا کر ایک انگڑائی لی۔ چاروں طرف ڈھیلے ہوتے ہوئے کمبل کو پھر سے کس لیا اور غیر متوقع پیار سے بولا: "اچھا منا، کل دے دیں گے۔" اُس کی خواہش ہوئی کہ لکشمی کے بارے میں کچھ بات کرے، لیکن سامنے ہی چوکیدار اور مستری کام کر رہے تھے۔

اصل میں آج وہ تھک بھی گیا تھا۔ اس نے چونک کر لڑکے کو جواب دیا اور جلدی جلدی حساب کرنے لگا۔ دنیا بھر کی سفارشوں کے بعد اُس کا نام کالج کے نوٹس بورڈ پر آ گیا تھا کہ وہ لے لیے گئے لڑکوں

Scanned with CamScanner

میں سے ہے۔ آتے وقت وہ کچھ کتابیں اور کاپیاں بھی خرید لایا تھا، سو آج چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اپنی کوٹھری میں جا لیٹے اور کچھ آگے پیچھے کی باتیں --دنیا بھر کی باتیں-- سوچتا ہوا سو جائے۔ سوچے، لکشمی کون ہے، کیسی ہے؟ وہ اس کے بارے میں کس سے پوچھے؟ کوئی اس کا ہم عمر اور بھروسے کا آدمی بھی تو نہیں ہے۔ کسی سے پوچھے اور لالہ روپارام کو پتا چل جائے تو؟ لیکن ابھی تیسرا ہی تو دن ہے۔ وہ دل ہی دل میں اپنے پاس رکھے ہوئے رسالوں اور کہانیوں کی کتابوں کی گنتی کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ اس بار اُسے کون سی دینی ہے۔ آگے چل کر، جب کافی دن ہو جائیں گے، تو وہ چپ چاپ اس میں ایک ایسا چھوٹا سا خط رکھ دے گا جو کسی دوست کے نام لکھا گیا ہو گا یا اس کی زبان ایسی ہو گی کہ پکڑ میں نہ آ سکے۔ بھول سے چلا گیا، پکڑے جانے پر وہ آسانی سے کہہ سکے گا، اُسے تو دھیان بھی نہیں تھا کہ وہ پرچا اس میں رکھا ہے! بیس جواب ہیں۔ اپنے چالاک بے وقوفی کے خیالوں پر وہ مسکرانے لگا۔

جس کے بارے میں وہ اتنا سب سوچتا ہے، یہ اُسی لکشمی کے پاس سے آیا ہوا رسالہ ہے۔ اُس نے اِسے اپنے کومل ہاتھوں سے چھُوا ہو گا۔ تکیے کے نیچے، سرھانے بھی یہ رہا ہو گا، لیٹ کر پڑھتے ہوئے ہو سکتا ہے سوچتے سوچتے چھاتی پر رکھ کر ہی سو گئی ہو--- اور اُس کا تن من گدگدا اٹھا۔ کیا لکشمی اُس کے بارے میں بالکل ہی نہ سوچتی ہو گی؟ حساب لکھنے کی مصروفیت میں بھی اُس نے گردن موڑ کر ایک ہاتھ سے رسالے کے ورق پلٹنے شروع کر دیے اور ایک مُڑے ہوئے ورق پر اچانک اُس کا ہاتھ ٹھٹک گیا۔ یہ کس نے موڑا ہے؟ ایک منٹ میں ہزاروں باتیں اُس کے دماغ میں چکر لگا گئیں۔ اُس نے رسالہ اٹھا کر حساب کی کاپی پر رکھ لیا۔ مڑا ہوا ورق پورا کھُلا تھا۔ چھپے ہوئے صفحے پر جگہ جگہ نیلی روشنائی کے نشان دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ یہ کس نے لگائے ہیں؟ اُسے خوب اچھی طرح دھیان ہے، یہ پہلے نہیں تھے۔

"میں تمھیں جان سے بڑھ کر پیار کرتی ہوں---" اُس نے ایک نیلی لائن کے اوپر پڑھا۔

"ایں، یہ کیا چکر ہے؟" وہ ایک دم جیسے بوکھلا اٹھا۔ اُس نے فوراً ہی سامنے بیٹھے مستری سلیم اور دلاور سنگھ کو دیکھا۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھے۔ اُس کی نگاہ اپنے آپ دوسری لائن پر پھسل گئی۔

"مجھے یہاں سے بھگا لے چلو---"

"ارے!"

"میں پھانسی لگا کر مر جاؤں گی---"

اور گووند اتنا گھبرا گیا کہ اس نے پھٹ سے رسالہ بند کر دیا۔ شک بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا -- کسی نے تاڑ تو نہیں لیا۔ اُس کے ماتھے پر پسینا اُبھر آیا اور دل چکّی کی موٹر کی طرح چلنے لگا۔ رسالے کے اُنھیں صفحوں کے بیچ میں انگلی رکھے رکھے اُس نے اسے گھٹنے کے نیچے چھپا لیا۔ کہیں دور سے رنگین کوَر کی تصویر دیکھ کر یہ کم بخت چوکیدار ہی نہ مانگ بیٹھے۔ اُن سطروں کو ایک بار پھر دیکھنے کی اُس کے دل میں شدید خواہش ہو رہی تھی، لیکن جیسے ہمّت نہ پڑتی تھی۔ کیا سچ مچ یہ نشان لکشمی ہی نے لگائے ہیں؟ کہیں کسی نے مذاق تو نہیں کیا؟ لیکن مذاق اُس سے کون کرے گا، کیوں کرے گا؟ ایسا کوئی اُس کا واقف بھی تو

نہیں ہے یہاں کہ تین ہی دن میں ایسی ہمت کر ڈالے۔

اُس نے پھر رسالہ نکال کر پورا اُلٹ پلٹ ڈالا۔ نہیں نشان وہی ہے، بس۔ وہ ان تینوں سطروں کو پھر ایک ساتھ پڑھ گیا اور اُسے ایسا لگا جیسے اُس کے دماغ میں ہوائی جہاز بھنّا اٹھا ہو۔ گووند کا دماغ چکرا رہا تھا، دل دھڑک رہا تھا، اور جو حساب وہ لکھ رہا تھا وہ تو جیسے ایک دم بھول گیا۔ اُس نے قلم کے پچھلے حصّے سے کان کے اوپر کھجلایا، خوب آنکھیں گاڑ کر جمع اور خرچ کے خانوں کو دیکھنے کی کوشش کی، لیکن اُس کی نس نس میں سَن سَن کرتی کوئی چیز دوڑتی جا رہی تھی۔ اُسے لگا اُس کا دل پھٹ جائے گا اور دماغ آتش بازی کے انار کی طرح پھٹ پڑے گا۔ اب وہ کس سے پوچھے، یہ سب نشان کس نے لگائے ہیں؟ کیا سچ مچ لکشمی نے؟

اس خوش کن حقیقت پر یقین نہیں آتا۔ میں چاہے اُسے نہ دیکھ پایا ہوں، اُس نے تو ضرور مجھے دیکھ لیا ہوگا۔ ارے، یہ لڑکیاں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ گووند کی خواہش ہوئی، اگر اُسے اس لمحے آئینہ مل جائے تو وہ لکشمی کی آنکھوں سے خود کو ایک بار دیکھے، کیسا لگتا ہے۔

لیکن یہ لکشمی ہے کون؟ بیوہ، کنواری، بیاہتا، مطلقہ، کیا؟ کتنی بڑی ہے؟ اُس کی نس نس میں ایسی زبردست اینٹھن ہونے لگی کہ وہ ابھی اُٹھے اور دوڑ کر اندر کے آنگن کی سیڑھیوں سے دھڑادھڑ چڑھتا ہوا اوپر جا پہنچے، لکشمی جہاں بھی، جس کمرے میں بھی بیٹھی ہو، اُس کے دونوں کندھے جھنجھوڑ کر پوچھے: "لکشمی، لکشمی، یہ سب تم نے لکھا ہے؟ تم نہیں جانتیں لکشمی، میں کتنا بد نصیب ہوں۔ میں قطعی اس خوش قسمتی کے لائق نہیں ہوں۔" اور سچ مچ اس غیر متوقع خوش قسمتی سے گووند کا دل اس طرح پسیج اٹھا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ڈوری سے لٹکتے بلب کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتا ہوا وہ ماضی اور مستقبل کی گہرائیوں میں اُترتا چلا گیا۔ پھر اُس نے دھیرے سے اپنی کوروں میں بھرے آنسوؤں کو انگلیوں پر لے کر اس طرح جھٹک دیا جیسے دیوتا پر چندن چڑھا رہا ہو۔ اُس کا ڈھیلا پڑا ہاتھ اب بھی رسالے کے ورق کو پکڑے ہوئے تھا۔

اُس نے ایک بار پھر اُن سطروں کو دیکھا۔ مان لو لکشمی اُس کے ساتھ بھاگ جائے۔ کہاں جائیں گے وہ؟ کیسے رہیں گے؟ اُس کی پڑھائی کا کیا ہوگا؟ بعد میں پکڑ لیے گئے تو؟

لیکن آخر یہ لکشمی ہے کون؟

لکشمی کے بارے میں سوالوں کا ایک جھنڈ اُس کے دماغ پر ٹوٹ پڑا، جیسے شکاری کتّوں کا باڑا کھول دیا گیا ہو۔ یا سر پر کوئی متواتر ہتھوڑے سے چوٹیں لگا رہا ہو، بڑی بے رحمی اور کٹھورپن سے۔ جیسے چھت پر سے اچانک گر پڑنے والے آدمی کے سامنے ساری دنیا ایک جھٹکے کے ساتھ لمحے بھر میں چکر لگا جاتی ہے، اُسی طرح اُس کے سامنے سیکڑوں ہزاروں چیزیں ایک ساتھ چمک کر غائب ہو گئیں۔

اینٹوں کے اونچے، چوکور، تخت نما چبوترے پر چھوٹی سی پُرانی صندوقچی کے آگے بیٹھا گووند حساب کر رہا تھا۔ اور حساب نہ ملنے کی وجہ سے جو کچھ پُرزے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے، وہ سب یوں ہی بکھرے رہے۔ اُس نے کھلے ہوئے لیجر رجسٹر پر دونوں کہنیاں ٹکا دیں اور دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں بند

کرلیں۔ کنپٹی کے پاس کی نسیں چٹخ رہی تھیں۔ ایسا تو کبھی دیکھا سُنا نہیں، فلموں ناولوں میں بھی نہیں دیکھا پڑھا۔ سچ مچ اِن نشانوں کا کیا مطلب ہے؟ کیا لکشمی ہی نے یہ لائنیں کھینچی ہیں؟ ہوسکتا ہے کسی بچے نے کھینچ دی ہوں۔۔ اس امکان سے تھوڑا چونک کر گووند نے پھر ورق کھولا۔۔ نہیں، بچہ کیا صرف انہیں سطروں کے نیچے نشان لگاتا؟ اور لکیریں اتنی پختہ اور سیدھی ہیں کہ کسی بچے کی ہو ہی نہیں سکتیں۔ کسی نے اُسے بلاوجہ پریشان کرنے کو تو نشان نہیں لگا دیے؟ ہوسکتا ہے وہ لکشمی بہت چُلبلی باز ہو اور ذرا جھکانے کو اُسی نے یہ سب کیا ہو۔۔۔

گووند اس طرح آنکھیں بند کیے سوچ رہا تھا، لیکن اندر اندر ڈر رہا تھا کہ مستری اور چوکیدار اُسے دیکھ کر کچھ سمجھ نہ جائیں۔ سب سے بڑا ڈر اُسے لالہ روپارام کا تھا۔ ابھی روئی بھری، شکرپاروں والی سلائی کی، میلی سی، پوری بانہوں کی مرزئی پہنے اور اُس پر میلی چیکٹ یگوں پرانی اندھی لپیٹے، دھیرے دھیرے ہانپتے ہوے، بینت ٹیکتے، بڑی دقّت سے سیڑھیاں اُتر کر وہ آ پہنچیں گے۔

اچانک بینت کی کھٹ کھٹ سے چونک کر اُس نے جو آنکھوں کے آگے سے ہاتھ ہٹایا تو دیکھا، سچ مچ لالہ روپارام ہی چلے آرہے ہیں۔ ارے کم بخت، یاد کرتے ہی آ پہنچا! بیٹھے ہوے دیکھ تو نہیں لیا؟ اُس نے جھٹ رسالے کو گھٹنوں کے نیچے اَور بھی سرکا لیا اور سامنے پھیلے پُرزوں پر آنکھیں جما کر مصروف ہو گیا۔ مستری اور چوکیدار کی کھسر پھسر بھی بند ہو گئی۔ گلی پار کر کے لالہ روپارام اندر داخل ہوے۔

موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے اُن کی آنکھیں بڑی ہو کر خوفناک دِکھتی تھیں۔ آنکھوں اور پلکوں کا رنگ مِل کر ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے پیچھے مورپنکھ کے چندوے لگے ہوں۔ سر پر روئی بھرا ہی کنٹوپ تھا۔ کانوں کو ڈھکنے والے، موٹر کے مڈگارڈ جیسے، اس کے کونے اب اوپر کو مڑے ہوے تھے اور قدیم راکھشسوں کے سینگوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ چہرہ اُن کا جھرّیوں بھرا تھا اور چشمے کا فریم ناک کے اوپر سے ٹوٹ گیا تھا۔ اُسے انھوں نے ڈورا لپیٹ کر مضبوط کر لیا تھا۔ دانت اُن کے نقلی تھے، اور شاید ڈھیلے بھی تھے کیوں کہ وہ انہیں ہمیشہ اس طرح منھ چلا چلا کر پیچھے سرکائے رکھتے تھے جیسے چیونگ گم چبا رہے ہوں۔ گووند کو اُن کے اس منھ چلانے اور منھ سے نکلتی طرح طرح کی آوازوں سے بڑی اُبکائی آتی تھی، اور جب وہ اُس سے بات کرتے تو وہ بڑے جتن کر کے اپنا دھیان اس طرف سے ہٹائے رکھتا۔ لالہ روپارام کی گردن ہمیشہ اس طرح ہلتی رہتی جیسے کھلونے والے گڈّے کی گردن کا اسپرنگ ڈھیلا ہو گیا ہو۔ گھٹنوں تک میلی کچیلی دھوتی اور ملٹری کے کباڑی بازار سے لائی گئی موزوں پر باندھنے کی پٹیاں، جو شاید انہیں جوڑوں کے درد سے بھی بچاتی تھیں۔ بنا فیتوں کے کھیسیں نکالے، پھٹے پُرانے بُوٹ، جنہیں دیکھ کر ہمیشہ گووند کو لگتا کہ اس آدمی کا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔

جب لالہ روپارام پاس آگئے تو اُس نے اُن کے اعزاز میں چہرے پر چکنائی والی مسکراہٹ لا کر اُن کی طرف دیکھتے ہوے سواگت کیا۔ اینٹوں کے چبوترے پر لگ بھگ دو سو سیاہی کے داغوں اور چھیدوں والی دری پر رام سروپ کے اُن سے سٹ کر کھڑے ہونے سے ایک موٹی سی سلوٹ پڑ گئی تھی، اُسے ہاتھ سے

ٹھیک کر کے اُس نے کہا: "لالہ جی، یہاں بیٹھیے۔"

لالہ جی نے ہانپتے ہوئے بولے بغیر ہی اشارہ کر دیا کہ نہیں، وہ یہیں ٹھیک ہیں، اور وہ ٹین کی کرسی پر اُس کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے اور ہانپتے رہے۔ اصل میں اُنھیں سانس کی بیماری تھی اور وہ ہر وقت پیاسے کتے کی طرح ہانپتے رہتے تھے۔

اُن کے یہاں آ بیٹھنے سے ایک بار تو گووند کانپ اٹھا۔ کہیں کم بخت کو پتا تو نہیں لگ گیا، کہیں کچھ پوچھنے نہ آیا ہو۔ حالاں کہ لالہ روپارام اس وقت کھاپی کر ایک بار چکّر ضرور لگاتے تھے لیکن اُسے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو بڈھا تاڑ گیا ہے۔ اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ لالہ روپارام ابھی ہانپ رہے تھے۔ گووند سر جھکائے حساب جوڑتا رہا۔ آخر صورتِ حال کو سنبھالنے کی غرض سے وہ بولا: "لالہ جی، آج میرا نام آ گیا کالج میں۔"

"اچھا!" لالہ جی نے کھانسی کے بیچ میں کہا۔ وہ ایک ہاتھ سے ڈنڈے کو زمین پر ٹیکے ہوئے تھے، دوسرے ہاتھ میں کلائی تک گوکھی (مالا جپنے کی تھیلی) بندھی تھی جس کے اندر انگلیاں چلا چلا کر وہ مالا گھما رہے تھے اور اُن کا وہ ہاتھ ٹُنڈا سا لگ رہا تھا۔

ماحول کا بوجھل پن بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ ایک واقعہ ہو گیا۔

اُنھوں نے سانس اکٹھی کر کے کچھ بولنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ اندر آنگن کا ٹٹر (لوہے کا جال) خوفناک آواز میں جھنجھنا اُٹھا جیسے کوئی بہت بھاری چیز اوپر سے پھینک دی گئی ہو، اور پھر زور سے بجتی ہوئی کچھلی جیسی چیز آ گری، اُس کے پیچھے چمٹا، سنڈاسی--- اور پھر تو اُسے ایسا لگا جیسے کوئی بالٹی، کڑھائی، توا وغیرہ نکال نکال کر جال پر پھینک رہا ہے اور پانی اور چھوٹی موٹی چیزیں نیچے گر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اندر کچھ ایسا ہنگامہ اور کہرام سنائی دیا جیسے آگ لگ گئی ہو۔

گووند جھٹک کر سیدھا ہو گیا۔ کہیں سچ مچ آگ واگ تو نہیں لگ گئی؟ اُس نے چونک کر سوالیہ نظروں سے لالہ جی کی طرف دیکھا اور حیرت سے گنگ رہ گیا۔ لالہ جی پریشان تو ضرور دکھائی دیتے تھے لیکن ایسی کوئی بات اُن کے چہرے پر نہیں تھی کہ کوئی بڑا حادثہ ہو گیا ہے اور اُنھیں دوڑ کر جانا چاہیے۔ مستری اور چوکیدار دونوں دبے دبے طنز کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھتے اور مسکراتے ہوئے لالہ جی کی طرف نگاہیں پھینک رہے تھے۔ کسی کو کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ اندر ہنگامہ بڑھ رہا تھا، چیزیں پھینکی جا رہی تھیں اور جال کی کھڑکھڑاہٹ اور جھنجھناہٹ گونجتی جا رہی تھی۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ تجسس سے اُس کی پسلیاں تڑخنے کو آنے لگیں۔ وہ لالہ جی سے پوچھنے ہی والا تھا کہ یہ سب کیا ہے، تبھی بڑی کوشش سے ہاتھ کی لکڑی پر سارا زور دے کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے، اور گھسٹتے ہوئے سے جہاں سے آئے تھے اُسی گلی میں چلے گئے۔ جاتے ہوئے پلٹ کر انھوں نے دھیرے سے کواڑ بند کر دیے۔ مستری اور چوکیدار نے سکون کا سانس لے کر بدن ڈھیلا کیا، ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا، کھنکھارا اور پھر ایک بار کھل کر مسکرائے۔ لالہ جی کا پیچھا کرتی گووند کی نگاہ اب اُن دونوں کی طرف مڑ گئی اور اب اُس سے رہا نہیں گیا۔ وہ

Scanned with CamScanner

کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مرغے کے پروں کی طرح کمبل کو بانہوں پر پھڑپھڑا کر لپیٹا اور اُس رسالے کو دیکھتا ہوا چبوترے سے نیچے اُتر آیا۔ تھوڑی دیر یوں ہی اُدھیڑ بُن میں کھڑا رہا، پھر اُس گلی کے دروازے تک گیا کہ کچھ سنائی دے۔ شور وغل میں چار پانچ آوازیں کواڑ کی جھری میں سے گھٹی گھٹی سنائی دیں اور ان میں سب سے تیز آواز وہی تھی جسے وہ لکشمی کی آواز سمجھتا تھا۔ ہے بھگوان، کیا ہو گیا؟ کہیں سے کوئی گر پڑا، آگ لگ گئی، سانپ بچھو نے کاٹ لیا؟ لیکن جس طرح وہ لوگ بیٹھے دیکھ رہے تھے، اس سے تو ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کم بخت کواڑ کیوں بند کر گیا؟ اس وقت لوہے کا جال اس طرح گھما گھم بج رہا تھا جیسے کوئی اس پر تانڈو نرت کر رہا ہو۔ اُسی اونچی، چیختی مہین آواز میں وہ ناری کنٹھ جسے وہ لکشمی کی آواز سمجھتا تھا، اتنا تیز اور زور سے بول رہا تھا کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔

"پریشان کیوں ہو رہے ہو بابو جی؟" چوکیدار کی آواز سن کر وہ ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا: "آج چنڈی آ رہی ہے!" اُس کی اِس بات پر مستری ہنسا۔

گووند بُری طرح جھنجھلا اٹھا۔ کوئی اتنا بڑا حادثہ ہو رہا ہے اور یہ بدمعاش یوں مزہ لُوٹ رہے ہیں! پھر بھی بے حد فکرمند اور متجسس سا اُدھر مڑا۔

اس بڑے کمرے یا ہال میں ہر چیز پر آٹے کا مہین پاؤڈر چھایا ہوا تھا۔ ایک طرف آٹے نہائی چکّی کالے پتھر کے بنے ہاتھی کی طرح چپ چاپ کھڑی تھی اور اُس کا پیے آٹے کو سنبھالنے والا غلاف سونڈ کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ اُسی کی سیدھ میں دوسری دیوار کے نیچے موٹر لگی تھی جہاں سے ایک چوڑا پٹا چکّی کو چلاتا تھا۔ اتنے حصّے میں حفاظت کے لیے ایک ریلنگ لگا دیا گیا تھا۔ سامنے کی دیوار میں چمکے، لمبے چوڑے لال چوکور تختے پر ایک کھوپڑی اور دو ہڈیوں کے نیچے "خطرہ" اور "ڈینجر" کے الفاظ لکھے تھے۔ اس چبوترے کی بغل میں چھت سے آتی زنجیر میں ایک بڑی لوہے کی ترازو کتھا کلی کی مُدرا میں ایک بانہہ اونچی کیے لٹکی ہوئی تھی، کیوں کہ دوسرے پلڑے میں من سے لے کر چھٹانک تک کے باٹوں کا ڈھیر لگا تھا۔ لالہ روپارام اکثر چوکیدار کو ڈانٹتے تھے کہ رات میں اُتار کر رکھ دیا کر، لیکن کسی کسی دن آدھی رات تک چکی چلتی اور دکان دفتر والے صبح پانچ بجے سے پھر آنے لگتے؛ اُس وقت برف جیسی ٹھنڈی ترازو کو چھُونا دلاور سنگھ کو زیادہ پسند نہیں تھا۔ وہ اسے یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ لڑائی میں صبح ہی صبح ٹھنڈی بندوقیں لے کر کافی مارچ اور پریڈ کر لیا، اب کیا زندگی بھر ٹھنڈا لوہا چھُونا ہی اُس کی قسمت میں بدا ہے؟ اس لیے وہ ترازو کو ٹنگا ہی رہنے دیتا، حالاں کہ ٹھیک بیچ میں ہونے کی وجہ سے وہ جب بھی دروازہ کھولنے اُٹھتا تو خود ہی اس سے ٹکراتا، اُلجھتا اور رات کی تنہائی میں فوجی گالیوں کی استقبالیہ تقریر کرتا۔ پُرانا کیلنڈر، ایک طرف پسائی کے لیے بھرا اناج یا پیے آٹے کے بورے، کنستر اور پوٹلیاں، اور اوپر چڑھ کر اناج ڈالنے کا مضبوط سا اسٹول۔ اس وقت دونوں ٹانگیں، جن میں کیل دار فُل بوٹ ڈٹے ہوئے تھے، زمین پر پھیلائے مزے میں کھاٹ کی پٹّی پر جھکا بیٹھا اپنا پُرانا، پہلی لڑائی کے سپاہی پنے کی یادگار، گریٹ کوٹ چاروں طرف لپیٹے شان سے بیڑی پھونک رہا تھا اور سامنے بیٹھے مستری سلیم سے آہستہ آہستہ باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔

اُس کے اور مستری سلیم کے بیچ میں ایک انگیٹھی جل رہی تھی۔ جب کبھی دھیان آ جاتا تو پاس رکھے کوئلے لکڑی کچھ ڈال دیتا اور کبھی کبھی نہایت بے دلی سے ہاتھ یا پاؤں اُس سمت بڑھا کر گرمی لیتا۔ سلیم سر جھکائے، پانی کی بالٹی میں ٹیوب ڈبو ڈبو کر اُن کے پنکچر دیکھنے میں مصروف تھا۔ اُس کے آس پاس دس بارہ کالے لال ٹیوب، ربر کی کترنیں، قینچی، پیچ، پلاس، سلوشن، چمڑے کی پیٹی اور ایک طرف ٹائر لگے دس بارہ سائیکل کے پہیوں کا ڈھیر تھا۔ اپنے اس سامان سے اُس نے آدھے سے زیادہ کمرہ گھیر رکھا تھا۔

جب گووند اُس کے پاس آیا تو وہ سر جھکائے جھکائے ہنستا ہوا ٹیوب کا پنکچر پکڑ کر کان میں لگی کاپی انگ پنسل کو تھوک سے گیلا کرتے ہوئے (حالاں کہ ٹیوب بھیگا ہوا تھا اور سامنے بالٹی بھر پانی بھی رکھا تھا) نشان لگاتا ہوا جواب دے رہا تھا: "یہ کہا جمعدار صاحب نے! "لالہ کچھ نانواں ڈھیلا کرے تو، اس کی لڑکی پر جن کا سایہ ہے، اس کا علاج تو ہم اپنے مولوی بدرالدین صاحب سے منٹوں میں کرا دیں۔"

گووند کا ماتھا ٹھنکا۔ لالہ کی لڑکی پر کیا کوئی دیوی آتی ہے؟ اُسے اپنے گاؤں کی ایک برہمنی بیوہ تارا کا ایک دم خیال آیا۔ اُس پر بھی جب دیوی آتی تھی تو وہ گھر بھر کے برتن اٹھا اٹھا کر پھینکتی تھی، سارا بدن اینٹھنے لگتا تھا، منہ سے جھاگ آنے لگتے تھے، گردن مروڑ کھانے لگتی تھی، آنکھیں اور زبان باہر نکلنے لگتی تھی۔ کون لڑکی ہے لالہ کی؟ لکشمی تو نہیں؟ بھگوان کرے لکشمی نہ ہو! اس کا دل وسوسوں سے ڈوبنے سا لگا۔ اُس نے سنا، ہنگامہ اب تھم گیا تھا اور دور سے رہ رہ کر بس رونے کی ہلکی سی آواز سنائی دیتی تھی۔ شاید کسی کو دورہ ووورہ ہی پڑ گیا ہے، جبھی یہ لوگ اتنے بے فکر ہیں۔

گووند کو سُنا کر چوکیدار بولا: "نانواں! تم بھی یار کسی دن بچارے بڈھے کا بارٹ فیل کراؤ گے۔ اور بیٹا، اِس جن کا علاج تمہارے مولوی کے پاس نہیں ہے، سمجھے؟ وہ تو ہَوا ہی دوسری ہے۔ آؤ بابوجی، بیٹھو۔"

چوکیدار نے بیٹھے بیٹھے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ اصل میں یہ گووند کو بابوجی تو ضرور کہتا تھا لیکن اس کی کوئی خاص عزت نہیں کرتا تھا۔ ایک تو گووند قصبے سے آیا تھا، اور اُسے شہر میں چوکیداری کرتے کرتے ہو چکے تھے نقد بیس سال۔ دوسرے وہ فوج میں رہا تھا اور قاہرہ تک گھوم آیا تھا۔ عمر، تجربے، تہذیب، سبھی میں وہ خود کو گووند سے زیادہ ہی سمجھتا تھا، لیکن گووند کو اس وقت اس سب کا دھیان نہیں تھا۔ اُس نے اسٹول سے ٹک کر ذرا سہارا لیتے ہوئے فکرمند لہجے میں پوچھا: "کیوں بھئی، یہ شور غُل کیا تھا؟ کیا ہو رہا تھا؟"

مستری نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا اور چوکیدار کی مسکراتی نظروں سے اُس کی آنکھیں ملیں۔ اُس نے اپنی کھچڑی مونچھوں پر ہتھیلی پھیرتے ہوئے کہا: "کچھ نہیں بابوجی، اوپر کسی بچے نے کوئی چیز گرا دی ہو گی۔"

مستری نے کہا، "جمعدار صاحب، جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے؟ اب

Scanned with CamScanner

اِن سے کیا چھپا رہے گا؟"

"تُو خود کیوں نہیں بتا دیتا؟" چوکیدار نے کہا، اور جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال لیا۔ کاغذ کو نوچ کر آٹے کی لوئی بنانے کی طرح اُسے ڈھیلا کیا، پھر ایک بیڑی نکال کر مستری کی طرف پھینکی۔ دوسری کو دونوں طرف سے پھونکا اور جلانے کے لیے دہکتے کوئلے کی تلاش میں انگیٹھی میں نگاہیں گھماتے ہوئے ذرا مصروفیت کے ساتھ بات جاری رکھی: "تجھے کیا معلوم نہیں ہے؟"

اُن دونوں کی چہل سے گووند کی جھنجھلاہٹ بڑھ رہی تھی۔ اُسے لگا، ضرور کچھ دال میں کالا ہے جسے یہ لوگ ٹال رہے ہیں۔ مستری زبان نکالے پنکچر کی جگہ کو ریگ مال سے گھِس رہا تھا۔ وہ جب بھی کوئی کام یکسوئی سے کرتا تھا تو اپنی زبان نکال کر اوپر کے ہونٹ کی طرف موڑ لیتا۔ اُس کی چندیا کے بیچ میں اُبھرتے گنج کو دیکھ کر گووند نے سوچا کہ گنجاپن تو رئیسی کی نشانی ہے، مگر یہ کم بخت تو آدھی رات میں یہاں پنکچر جوڑ رہا ہے۔ اُس نے اُسی طرح گردن جھکائے جھکائے کہا: "اب میں بابو جی کو قصہ بتاؤں یا ان ٹیوبوں سے سر پھوڑوں؟ سالے سڑ کر حلوا تو ہو گئے ہیں پر بدلے گا نہیں۔ من تو ہوتا ہے سب کو اُٹھا کر اس انگیٹھی میں رکھ دوں۔ ہو گا صبح دیکھا جائے گا!"

"یہ اتنے ٹیوب ہیں کاہے کے؟" ذرا اپنائیت جتانے کو گووند نے پوچھا۔ "حالت تو سچ مچ ان کی بڑی خراب ہو رہی ہے۔"

"آپ کو نہیں معلوم؟" اس بار مستری نے کام چھوڑ کر غور سے گووند کو دیکھا۔ "یہ آپ کے لالہ کے جو دو درجن رکشا چلتے ہیں، اُن کا کوڑا ہے۔ یہ تو ہوتا نہیں کہ اتنے رکشا ہیں، روز ٹوٹ پھوٹ مرمّت ہوتی ہی رہتی ہے، ہمیشہ کے لیے لگا لے ایک مستری، دن بھر کی چھٹی ہوئی۔ سو تو ہو گا نہیں۔ ٹیوب ٹائر میرے سر ہیں اور باقی ٹوٹ پھوٹ مستری علی احمد ٹھیک کرتے ہیں۔" پھر اُس نے یوں ہی پوچھا: "آپ بابو جی، نئے آئے ہیں؟"

"ہاں، دو تین دن ہی تو ہوئے ہیں۔ میں یہاں پڑھنے آیا ہوں،" گووند نے کہا۔ اُس کے پیٹ میں کھلبلی مچ رہی تھی، لیکن وہ نئے سرے سے پوچھنے کا بہانہ کھوج رہا تھا۔

"تبھی تو!" مستری بولا۔ "تبھی تو آپ یہ سب پوچھ رہے ہیں۔ رات کو اِس کا حساب رکھتے ہیں نا؟ ہاں، تھوڑے دنوں میں اپنے فرزند کو بھی آپ سے پڑھوائے گا۔" اپنے فرزند کے لفظوں میں جو طنز اس نے کیا تھا، اس سے خود ہی مزہ لے کر مسکراتے ہوئے اس نے چوکیدار کی دی ہوئی بیڑی سلگائی۔

"ابے اِنھیں یہ سب کیا بتاتا ہے۔ وہ تو اس کے گاؤں ہی سے آئے ہیں۔ انھیں سب معلوم ہے،" چوکیدار بولا۔

"نہیں، سچ مجھے کچھ نہیں معلوم،" گووند نے ذرا یقین دہانی کے لہجے میں کہا۔ "اِن لالہ کے تو پِتا ہی یہاں چلے آئے تھے نا، سو ہم لوگوں کو کچھ بھی نہیں معلوم۔ بتائیے نا، کیا بات ہے؟" وہ ذرا احترام اور خوشامد کے لہجے میں بولا۔

Scanned with CamScanner

شاید اُس کے تجسس اور بے قراری سے متاثر ہو کر مستری بولا: "اجی کچھ نہیں، لالہ کی بڑی لڑکی جو ہے نا، اُسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ کوئی کہتا ہے اُسے ہسٹیریا ہے، پر ہمارا تو قیاس یہ ہے کہ بابوجی، دورہ دورہ کچھ نہیں، اُس پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔۔۔ اُس بچاری کو تو کچھ ہوش رہتا نہیں۔"

"بیوہ ہے؟" جلدی سے بات کاٹ کر گووند دھک دھک کرتے دل سے پوچھ بیٹھا۔ ہائے، لکشمی ہی نہ ہو!

اس بار پھر دونوں کی نگاہوں کا آپس میں ٹکرا کر مسکرانا اُس سے چھپا نہ رہا۔ بیڑی کے لمبے کش کے دھوئیں کو جذب کر کے چوکیدار زبردستی گمبھیر بن کر بولا: "اجی اِس نے اُس کی شادی ہی کہاں کی ہے؟"

"نام کیا ہے؟" گووند سے نہ رہا گیا۔

"لکشمی۔"

"لکشمی؟" اُس کے منہ سے نکل گیا اور جیسے ایک دم اُس کی ساری طاقت کسی نے کھینچ لی ہو۔ تجسس اور اشتعال سے تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

چوکیدار اس بار نہایت پُراسرار انداز سے ہنسا، جیسے کہہ رہا ہو، "اچھا، تم بھی جانتے ہو؟"

گووند کے دل میں فطری سوال اٹھا۔ "اس کی عمر کیا ہے؟"

لیکن چوکیدار نے پوچھا، "تو سچ مچ بابوجی، آپ ان کے گھر کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے؟"

"نہیں تو بھائی! میں نے بتایا تو، میں ان کے بارے میں کچھ بھی قطعی نہیں جانتا،" ایک طرح کی خودسپردگی کے انداز سے گووند بولا۔

"لیکن لکشمی کا قصہ تو سارے شہر میں مشہور ہے،" چوکیدار بولا۔ "آپ شاید نئے نئے آئے ہیں، یہی وجہ ہے۔" پھر مستری کی طرف دیکھ کر بولا: "کیوں مستری صاحب، تو بابوجی کو قصہ بتا ہی دوں؟"

"ارے لو! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ اِس میں چھپانا کیا! یہاں رہیں گے تو کبھی نہ کبھی جان ہی جائیں گے۔"

"اچھا تو پھر سُن ہی لو یار، تم بھی کیا کہو گے۔۔۔" چوکیدار نے آنند میں آ کر کہنا شروع کیا۔ "آپ شاید جانتے ہیں، یہ ہمارا لالہ شہر کا مشہور کنجوس اور مشہور رئیس ہے۔۔۔"

"لامحالہ، جو کنجوس ہو گا وہ رئیس تو ہو گا ہی،" مستری بولا۔

"نہیں مستری صاحب، پورا قصہ سننا ہو تو بیچ میں مت ٹوکو،" چوکیدار اس مداخلت پر ناراض ہو گیا۔

"اچھا اچھا، سناؤ!" مستری بدھوؤں کی طرح مسکرایا۔

"اس کی یہ چکی ہے نا، شادی بیاہ کے دنوں میں اس پر ہزاروں من پستا ہے۔ ویسے بھی دو ڈھائی سو من تو کم سے کم پستا ہی ہے روز۔ افسروں اور کلرکوں کو کچھ کھلا پلا کر لڑائی کے زمانے میں اسے ملٹری کے کچھ ٹھیکے مل ہی جاتے تھے۔ آپ جانو، ملٹری کا ٹھیکا تو جس کے پاس آیا سو بنا۔ آپ اُن دنوں دیکھتے لکشمی

فلورِل کے بلّے۔ بورے یوں چُنے رہتے تھے جیسے مورچے کے لیے بالو بھر بھر کر رکھ دیے ہوں۔ اُس میں اِس نے خوب روپیا پیٹا۔ ملٹری کو گیہوں بیچ دی اونے پونے بھاو، اور ردّی والی خرید کر کوٹا پورا کیا۔ اُس میں کھریا ملادیا۔ پسائی کے اُلٹے سیدھے پیسے تو مارے ہی، بلیک، چارسو بیسی، چوری، کیا کیا اِس نے نہیں کیا؟ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی صابن کی فیکٹری اور کافی بڑا جوتوں کا کارخانہ بھی اس کا ہے۔ اسے اس کے بیٹے سنبھالتے ہیں۔ پچیس تیس رکشے اور پانچ موٹر ٹرک چلتے ہیں۔ دس بارہ سے زیادہ اس کے مکان ہیں جن کا کرایہ آتا ہے۔ روپے سُود پر دیتا ہے۔ شاید گاؤں میں بھی کافی زمین اس نے لے رکھی ہے۔ ایک کام ہے سالے کا؟ اتنا تو ہمیں پتا ہے، باقی اس کی اصل آمدنی تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے۔ بھگوان ہی جانے! رات دن کسی نہ کسی تگڑم میں لگا ہی رہتا ہے۔ کروڑوں کا اسامی ہے۔ اور سب سے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ سب صرف اسی پچیس چھبیس سال میں جمع کی ہوئی رقم ہے۔"

چوکیدار دلاور سنگھ ملٹری میں رہ آنے کی وجہ سے خوب باتونی تھا اور مورچے کے اپنے افسروں کے قصّے اور اپنی بہادری کے کارنامے خوب نمک مرچ لگا کر اتنی بار سنا چکا تھا کہ اُسے کہانی سنانے کا محاورہ ہو گیا تھا۔ ہر بات کے اُتار چڑھاو کے ساتھ اُس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات بدلتے رہتے تھے۔

اُس کی باتیں غور اور دل چسپی سے سنتے ہوئے بھی گووند کے دل سے ایک بات ٹکرائی: لکشمی کو دورے پڑتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُس نے جو یہ نشان لگا کر بھیجے ہیں، یہ بھی دورے ہی کی حالت میں لگائے ہوں اور ان کا کوئی خاص گہرا مطلب نہ ہو؟ اس بات سے اسے سچ مچ بڑی مایوسی ہوئی، پھر بھی اس نے اوپر سے حیرت ظاہر کرتے ہوئے پوچھا: 'صرف پچیس چھبیس سال؟"

نئی بیڑی جلاتے ہوئے چوکیدار نے ذرا زور سے سر ہلایا۔ گووند نے سوچا: اور لکشمی کی عمر کیا ہو گی؟

"اور کنجوسی کی حد تو آپ نے دیکھ ہی لی ہو گی۔ بڈھا ہو گیا ہے، سانس کا روگ ہو رہا ہے، سارا بدن کانپتا ہے، لیکن ایک پیسے کا بھی فائدہ دیکھے گا تو دس میل دھوپ میں ہانپتا ہوا پیدل جائے گا۔ کیا مجال جو سواری کر لے! گرمی آئی تو پورا بدن ننگا، کمر میں دھوتی آدھی پہنے آدھی لپیٹے۔ جاڑا آیا تو یہی ڈریس۔ اس میں پچھلے دس سال سے تو میں دیکھ رہا ہوں۔ کبھی کسی مکان کی مرمّت نہ کرانا، سفیدی صفائی نہ کرانا، اور ہمیشہ یہی دھیان رکھنا کہ کون کتنی بجلی خرچ کر رہا ہے، کہاں بے کار نل یا پنکھا چل رہا ہے۔ لڑکا ہے سو اُسے مفت کے چنگی اسکول میں ڈال دیا ہے، لڑکی گھر پر بٹھا رکھی ہے۔ ایک ایک پیسے کے لیے گھنٹوں رکشاوالوں ٹرک والوں سے لڑنا، بحثیں کرنا اور چکی والوں کا ناک میں دم کیے رکھنا، اُنھیں دن رات یہ سکھانا کہ کس چالاکی سے آٹا بچایا جا سکتا ہے۔ بیسیوں روپے کا آٹا روز ہوٹل والوں کو بکتا ہے سو الگ۔ جس دن سے چکی کھلی ہے، گھر کے لیے تو آٹا بازار سے آیا ہی نہیں۔ آپ یقین کیجیے، کم سے کم بارہ پندرہ ہزار کی آمدنی ہو گی اِس کی؛ لیکن صورت دیکھیے، مکھیاں بھنکتی رہتی ہیں۔ کسی آنے جانے والے کے لیے ایک کرسی تک نہیں، پان سُپاری کی بات ہی الگ رہی۔ کون کہہ دے گا کہ یہ پیسے والا ہے؟ یہ عمر ہونے آئی، صبح سے شام تک بس پیسے کے پیچھے ہائے ہائے۔ دنیا کے کسی اَور کام سے مطلب ہی نہیں۔ سیدھا سوسائٹی

ہو، ہڑتال ہو، چھٹی ہو، کچھ ہو، لیکن لالہ روپارام اپنی ہی دُھن میں مست۔ نوکروں کو کم سے کم دینا پڑے، اس لیے خود ہی اُن کے کام کو دیکھتا ہے۔ مجھ سے تو کچھ اس لیے نہیں کہتا کہ مجھ پر تھوڑا اعتبار ہے۔ دوسرے میری ضرورت سب سے بڑی ہے۔ لیکن باقی ہر نوکر روتا ہے اس کے نام کو۔ اور مزہ یہ کہ سب جانتے ہیں کہ جھگی ہے۔ کوئی اس کی بات کو دھیان سے سنتا نہیں۔ بعد میں سب اس کا نقصان کرتے ہیں۔ آس پاس کے سبھی ہنستے اور گالیاں دیتے ہیں۔۔۔"

"بچے کتنے ہیں؟" چوکیدار کو ان بے کار کی باتوں میں بہکتا دیکھ کر گووند نے سوال کیا۔

"اسی بات پر آتا ہوں،" چوکیدار اطمینان سے بولا۔ "سچ بابوجی، میں یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوں کہ اس عمر تک تو اس نے یہ دولت جُٹائی ہے، اب اس کا یہ کم بخت کرے گا کیا؟ لوگ جمع کرتے ہیں کہ بیٹھ کر آرام بھوگیں، لیکن یہ راکھشس تو جمع ہی کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اسے جمع کرنے کی ایسی ہائے ہائے رہی ہے کہ دولت کس لیے جمع کی جاتی ہے، اس بات کو بچارا بالکل ہی بھول گیا ہے۔" پھر بڑے مفکرانہ اور فلسفیانہ مُوڈ میں دلاور سنگھ نے آگ والی راکھ کو دیکھتے ہوئے کہا: "اس عمر تک تو اسے جوڑنے کی ایسی ہوس ہے، اب یہ اس کا بھوگ کب کرے گا؟ سچ مچ بابوجی، جب کبھی میں سوچتا ہوں تو بچارے پر بڑی دَیا آتی ہے۔ دیکھو آج کی تاریخ تک یہ بچارا بھاگ دوڑ کر، لُو دھوپ کی فکر چھوڑ کر جمع کیے جا رہا ہے۔ ایک پائی اس میں سے کھا نہیں سکتا، جیسے کسی دوسرے کا ہو۔ جب مان لیجیے کل یہ مر جاتا ہے تو یہ سب کس کے لیے جمع کیا ہے؟ بچارے کے ساتھ کیسی لاچاری ہے۔ مر کر، جی کر، نوکر کی طرح جمع کیے جا رہا ہے۔ نہ خود کھا سکتا ہے، نہ دیکھ سکتا ہے کہ دوسرا چھُو بھی لے۔ جیسے دھن کے اوپر بیٹھا سانپ۔ خود اسے کھا نہیں سکتا، کھانے تو خیر دے گا ہی کیا! اُس کی رکھوالی کرنا اور جوڑنا۔۔۔" اور لالہ روپارام کے لیے ہم دردی سے مغلوب ہو کر چوکیدار نے ایک گہری سانس لی۔ پھر دوسرے ہی لمحے دانت کٹکٹاتا ہوا بولا: "اور کبھی کبھی من ہوتا ہے، چھُرا لے کر سالے کی چھاتی پر جا چڑھوں اور مرغے کے آم کی طرح گود دوں۔ اپنے پیٹ میں جو اتنا دھن بھر رکھا ہے، اُس کی ایک ایک پائی اگلوا لوں۔ چاہے خود نہ کھائے، لیکن اپنے بچوں کو بھی کھلا پلا نہیں سکتا، اس دھن کا کیا ہو گا؟"

"اس کے بچے کتنے ہیں؟" اس بار گووند بے تاب ہو اٹھا۔ اصل میں وہ چاہتا تھا کہ اس تقریر کو چھوڑ کر وہ جلد سے جلد اصل موضوع پر آ جائے، لکشمی کے بارے میں بتائے۔

تفصیل میں بہہ جانے کی اپنی کم زوری پر چوکیدار مسکرایا اور بولا: "اس کے بچے ہیں چار۔ بیوی مر گئی۔ باقی کسی ناتے دار کو جھانکنے نہیں دیتا۔ اوپر کوئی نوکر بھی نہیں ہے۔ بس ایک مَری سی بُڑھیا پال لی ہے۔ لوگ بڑے بھائی کی بیوی بتاتے ہیں۔ بس وہی ساری دیکھ بھال کرتی ہے۔ اَور تو کسی کو میں نے ساتھ دیکھا نہیں۔ خود، تین لڑکے اور ایک لڑکی۔۔۔"

"بڑے دو لڑکے تو ساتھ نہیں رہتے،" اس بار مستری بولا۔

"ہاں، وہ لوگ الگ رہتے ہیں۔ دن میں ایک آدھ چکر لگا جاتے ہیں۔ ایک جوتے کا کارخانہ دیکھتا

ہے، دوسرا صابن کی فیکٹری سنبھالتا ہے۔ اس سالے کو اُن پر بھی بھروسا نہیں ہے۔ پورے کاغذ پتر، حساب کتاب اپنے پاس ہی رکھتا ہے۔ شام کو پابندی سے وہاں جاتا ہے وصولی کرنے۔ لیکن لڑکے بھی بڑے تیز ہیں۔ ذرا شوقین طبیعت پائی ہے۔ اس کے مرتے ہی دیکھ لینا مستری، وہ اس کی ساری کنجوسی نکال ڈالیں گے۔" پھر یاد کر کے بولا، "اور کیا کہا تم نے؟ ساتھ رہنے کی بات، سو بھیا، جب تک اکیلے تھے تب تک تو کوئی بات ہی نہیں تھی، لیکن اب تو اُن کی بیویاں آ گئی ہیں نا۔ ایک کے بچہ بھی آ گیا ہے گھر میں، سو اُسے گودی میں لٹکائے پھرتا ہے۔ اس کے گھر میں ایک چنڈی جو ہے نا، اُس کے ساتھ سب کا نبھاو نہیں ہو سکتا۔"

ایک دم گووند کے ذہن میں آیا۔۔ لکشمی۔ اور وہ اوپر سے نیچے تک کانپ اٹھا۔ "کون؟ لکشمی؟"

"جی ہاں، اُسی کی بدولت تو یہ سارا کھیل ہے۔ وہی تو اس خزانے کی چابی ہے۔ وہ نہ ہوتی تو یہ سب تام جھام آتا کہاں سے؟ اُس نے تو اس کے دن ہی پلٹ دیے، نہیں تو تھا کیا اس کے پاس؟" اس بار چوکیدار نے یہ بات ایسے لہجے سے کہی جیسے سچ مچ کسی راز کی کنجی ہو۔

"کیسے بھائی، کیسے؟" گووند پوچھ بیٹھا۔ اُس کا دماغ چکرا گیا۔ یہ کیا معما ہے؟ ایک پل کو اس کے دماغ میں آیا: کہیں یہ روپیا کمانے کے لیے تو لکشمی کا استعمال نہیں کرتا؟ راکھشس! چنڈال!

اُس کی بے قراری پر چوکیدار پھر مسکرایا اور بولا: "باپ تو اس کا ایسا رئیس تھا بھی نہیں۔ پھر وہ کچی گرہستی چھوڑ کر مر گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ہزار ہزار روپیا دونوں بھائیوں کے پلّے پڑا ہو گا۔ شادیاں دونوں کی ہو چکی تھیں۔ کچھ کاروبار کھولنے کے خیال سے یہ سٹّے میں اپنے روپے دُونے چوگنے کرنے پہنچا تو سارے گنوا آیا۔ بڑے بھیا رُوچورام نے ایک پن چکی کھول لی۔ پہلے تو اُس کی بھی حالت ڈانواڈول رہی تھی، لیکن سنتے ہیں کہ جب سے اُس کی لڑکی گوری پیدا ہوئی، اُس کی حالت سنبھلتی ہی چلی گئی۔ یہ اُسی کے یہاں کام کرتا تھا؛ میاں بیوی وہیں پڑے رہتے۔ ایسا کچھ اُس لڑکی کا پاؤں آیا کہ لالہ روچورام سچ مچ کے لالہ ہو گئے۔ ان لوگوں کے بڑے بوڑھوں کا کہنا تھا کہ لڑکی ان کے خاندان میں بھاگوان ہوتی ہے۔ اب تو یہ اپنا لالہ کبھی اِس اوجھا کے پاس جا کبھی اُس پیر کے پاس جا، کبھی اِس کی مانتا کبھی اُس کی خدمت۔ دن رات بس یہی کہ ہے بھگوان، میرے لڑکی ہو۔ اور پتا نہیں کیسے، بھگوان نے سن لی اور لڑکی ہی آئی۔ آپ یقین نہیں کریں گے، پھر تو سچ مچ ہی روپارام کے نقشے بدلنے لگے۔ پتا نہیں گڑا ہوا ملا یا چھپر پھاڑ کر ملا، لالہ روپارام کے ستارے پھر گئے۔۔۔ اسے یقین ہونے لگا کہ یہ سب اسی کی کرپا ہے اور حقیقت میں یہ کوئی دیوی ہے۔ اس نے اُس کا نام لکشمی رکھا، اور صاحب، کہنا پڑے گا کہ وہ سچ مچ لکشمی ہی بن کر آئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں لکشمی فلور مل الگ بن گئی۔ اب تو اس کا یہ حال ہے کہ مٹی بھی چھُو دے تو سونا بن جائے اور کنکر کو اُٹھا لے تو ہیرا دِکھے۔ پھر آ گئی لڑائی اور اس کے پنجے چھکے ہو گئے۔ ٹھیکے ملنے لگے۔ سمجھیے ایک کے بعد ایک مکان خریدے جانے لگے۔ سامان لانے لے جانے والے ٹرک آئے۔ اُدھر روچورام بھی پھل رہا تھا، اور دونوں بھائی فخر سے کہتے تھے: ہمارے یہاں لڑکیاں لکشمی ہی بن کر آتی ہیں۔ لیکن پھر

ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ تصویر کی شکل بدل گئی۔" چوکیدار دلاور سنگھ جانتا تھا کہ یہ اُس کی کہانی کا کلائمکس ہے، اس لیے سامعین کے تجسس کو جھٹکا دینے کے لیے اُس نے انگلیوں میں دبی، ختم ہوتی بیڑی کو دو تین کش لگا کر ختم کیا اور بولا:

"گوری شادی لائق ہو گئی تھی۔ شاید کسی پڑوسی لڑکے کے نام سے کچھ ایسی ویسی باتیں بھی روچورام نے سُنیں۔ لوگوں نے بھی انگلیاں اٹھانا شروع کر دیا تو اُنھوں نے گوری کی شادی کر دی۔ بس، اُس کی شادی ہونا تھی کہ جیسے ایک دم سارا کھیل بگڑ گیا۔ اُس کے جاتے ہی لالہ ایک بہت بڑا مقدمہ ہار گئے، اور بھگوان کی لیلا دیکھیے، اُنھیں دنوں اُس کی پن چکی میں آگ لگ گئی۔ کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ کسی دشمن کا کام تھا۔ جو بھی ہو، بڑے ہاتھی کی طرح جو ایک بار گرے تو اُٹھنا دشوار ہو گیا۔ لوگ روپے داب گئے اور ان کا دِوالا نکل گیا۔ دِوالا کیا جی، ایک طرح سے بالکل ملیامیٹ ہو گئے؛ سب کچھ چوپٹ ہو گیا اور چلتا چلتا تک بک گیا۔ ایک دن لالہ جی کی لاش تالاب میں پھُولی ہوئی ملی۔ اب تو ہمارے لالہ روپارام کو سانپ سونگھ گیا۔ اُن کے کان کھڑے ہوئے اور لکشمی پر پہرا بٹھا دیا گیا۔ اُسے اسکول سے اُٹھا لیا گیا، اور وہ دن اور آج کا دن، بچاری نیچے نہیں اُتری۔ گھر کے اندر نہ کسی کو آنے دیتا ہے، نہ اسے باہر جانے دیتا ہے۔ ماسٹر رکھ کر پڑھانے کی بات پہلے اُٹھی تھی، لیکن جب سنا کہ ماسٹر لوگ لڑکیوں کو بہکا کر بھگا لے جاتے ہیں تو وہ خیال ایک دم چھوڑ دیا گیا۔ لکشمی خوب روئی پیٹی، لیکن اِس راکھشس نے اُسے بھیجا ہی نہیں۔ سنتے ہیں لڑکی دیکھنے دکھانے لائق۔۔۔"

بات کاٹ کر مستری بولا، "ارے دیکھنے دکھانے لائق کیا، ہم نے خود دیکھی ہے۔ جدھر سے نکل جاتی، اُدھر بجلی سی کوند جاتی۔ سَو میں ایک۔۔۔"

اُس کی بات کی مخالفت نہ کر کے، یعنی تائید کر کے، چوکیدار بولا: "اسکول میں بھی سنتے ہیں بڑی تعریف تھی، لیکن سب کی سالے نے ریڑھ کر دی۔ اُسے یہ یقین ہو گیا کہ یہ لڑکی سچ مچ لکشمی ہے اور جب یہ دوسرے کی ہو جائے گی تو ایک دم اس کا بھی ستیاناس ہو جائے گا۔ اسی ڈر سے نہ تو کسی کو آنے جانے دیتا ہے اور نہ اس کی شادی کرتا ہے۔ اُس کی ہر بات پر پولیس کے سپاہی کی طرح نظر رکھتا ہے۔ اُس کی ہر بات مانتا ہے، بُری طرح اُس کی عزت کرتا ہے، ہر ضد پوری کرتا ہے، لیکن نکلنے نہیں دیتا۔ لکشمی سولہ کی ہوئی، سترہ کی ہوئی، اٹھارہ، انیس۔۔۔ سال پر سال بیت گئے۔ پہلے تو وہ سب سے لڑتی تھی، بڑی چڑچڑی اور ضدی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی سب کو گالی دیتی اور مار بھی بیٹھتی تھی۔ پھر تو معلوم نہیں کیا ہوا کہ گھنٹوں رات رات بھر پڑی زور زور سے روتی رہتی، پھر اُسے دورہ پڑنے لگتا۔۔۔"

"اب کیا عمر ہے؟" گووند نے بیچ میں پوچھا۔

"اُس کی ٹھیک عمر تو کسی کو پتا نہیں، لیکن اندازے سے پچیس چھبیس سے کم کیا ہو گی۔" نفرت سے ہونٹ ٹیڑھے کر کے چوکیدار نے اپنی بات جاری رکھی۔ "دورہ نہ پڑے تو بچاری جوان لڑکی کیا کرے! اِدھر پانچ چھ سال سے تو یہ حال ہے کہ دورے میں گھنٹے دو گھنٹے بالکل پاگل ہو جاتی ہے۔ اُچھلتی

کودتی ہے، بُری بُری گالیاں دیتی ہے، بے مطلب روتی ہنستی ہے، چیزیں اٹھا اٹھا کر اِدھر اُدھر پھینکتی ہے، جو چیز سامنے ہو اُسے توڑ پھوڑ دیتی ہے، جو ہاتھ آتا ہے اُس سے مار پیٹ شروع کر دیتی ہے۔ اور سارے کپڑے اُتار کر پھینک دیتی ہے، بالکل ننگی ہو جاتی ہے اور رانیں اور چھاتی پیٹ پیٹ کر باپ سے کہتی ہے: لے، تو نے مجھے اپنے لیے رکھا ہے، مجھے کھا، مجھے کھا، مجھے بھوگ! وہ پٹتا ہے، گالیاں کھاتا ہے اور سب کچھ برداشت کرتا ہے، لیکن پہرے میں ذرا ڈھیل نہیں ہونے دیتا۔ چپ چاپ سر پر ہاتھ رکھے بیٹھا سنتا رہتا ہے۔ کیا زندگی ہے بچاری کی! باپ ہے سو اُسے بھوگ نہیں سکتا، اور چھوڑ تو سکتا ہی نہیں۔ میری تو عمر نہیں رہی، ورنہ کبھی من ہوتا ہے لے جاؤں بھگا کر، ہو گا سو دیکھا جائے گا!" اور ایک گہرے رنج سے مسکراتا ہوا چوکیدار دیر تک آگ کو دیکھتا رہا۔ پھر دھیرے سے ہونٹ چبا کر بولا: "اِس کی تو بوٹی بوٹی گرم لوہے سے داغی جائے اور پھر باندھ کر گولی سے اُڑا دیا جائے۔"

گووند کا بھی دل بھاری ہو اٹھا تھا۔ اُس نے دیکھا، بڈھے چوکیدار کی آنکھوں میں سامنے کی انگیٹھی کی دھُندلی آگ کی پرچھائیں جھلملا رہی ہے۔

آدھی رات کو اپنی کوٹھری میں لیٹے، لکشمی کے بارے میں سوچتے ہوئے، موم بتّی کی روشنی میں اُس کی ساری باتوں کی ایک ایک تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہو گئی اور پھر اُس نے اندھیرے کی چاردیواری سے گھِری، گرم گرم آنسو بہاتی موم بتّی کی روشنی میں نشان زد کی ہوئی سطریں پڑھیں:

"میں تمھیں جان سے بڑھ کر پیار کرتی ہوں---"

"مجھے یہاں سے بھگا لے چلو---"

"میں پھانسی لگا کر مر جاؤں گی!"

گووند کے دل میں اپنے آپ ایک سوال اُٹھا: کیا میں پہلا آدمی ہوں جو اِس پکار کو سن کر ایسا بے قرار ہو اُٹھا ہے، یا اَوروں نے بھی اِس آواز کو سنا ہے اور سن کر اَن سُنا کر دیا ہے؟ اور کیا سچ مچ جوان لڑکی کی آواز کو سُن کر اَن سُنا کیا جا سکتا ہے؟

**

کاشی ناتھ سنگھ

ہندی سے ترجمہ: عبدالعظیم سومرو

صدی کا سب سے بڑا آدمی

لڑائیاں ڈھیر ساری لڑی گئیں سورماؤں کی اِس دھرتی پر، اور دھرتی پر ہی کیوں، پانی پر بھی اور آسمان میں بھی، یہاں تک کہ گھر گھر میں۔ چاہے وہ راجپوتوں کا زمانہ رہا ہو، چاہے مغلوں کا، چاہے انگریزوں کا۔ لیکن گلی میں لڑائی صرف ایک لڑی گئی ہے، اور وہ بھی اِسی نگر میں۔ یہ اُسی لڑائی کی داستان ہے۔

دیس کو آزاد ہوئے مشکل سے چار پانچ سال ہوئے تھے۔ اُنھیں دنوں اِس گلی میں کوئی خاندانی رئیس رہتے تھے، جن کا نام رانا سے شروع ہوتا اور چندیل پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ اتنے لمبے نام سے انھیں کوئی نہیں جانتا تھا، لوگ جانتے تھے ان کے تخلص "شوق" سے۔ انھیں اس بات کا بہ خوبی علم تھا کہ اردو کے جتنے بھی بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں، ان میں زیادہ تر کے تخلص مختصر رہے ہیں، مثلاً میر، سودا، ذوق، جوش وغیرہ۔ اسی کی دیکھادیکھی جب انھوں نے شاعری شروع کی تھی تو اپنا نام شوق رکھا تھا۔ اور یہ نام کہیں چلا ہو یا نہ چلا ہو، کوٹھے پر خوب چلا۔

لیکن جب عمر کے ساتھ ساتھ یہ شوق چھُوٹا تو ان پر ایسا شوق چڑھا جس نے اُن کی شہرت دیس کے کونے کونے تک پھیلائی۔ جسے دیکھو وہی اس گلی کی طرف چلا جا رہا ہے جہاں شوق صاحب کا غریب خانہ ہے۔

شوق صاحب چار منزلوں والی اپنی کوٹھی میں تیسری اٹاری کی اُس کھڑکی کے پاس بیٹھے رہتے تھے جو گلی کی طرف کھُلتی تھی۔ ان کے پاس سبھی کچھ تھا، لیکن سب ان کے نزدیک ماٹی کے مول تھا۔ ہاتھی تھا لیکن چڑھتے نہیں تھے، گھوڑے تھے لیکن دوڑاتے نہیں تھے۔ بگھی اور کار بھی تھی لیکن ہوا کرے۔ یہ سب

Scanned with CamScanner

کچھ اس لیے تھا کہ رئیس کے پاس ہونا چاہیے۔ یہ سب کوٹھی کے پچھواڑے والے باغیچے میں، جہاں نوکروں چاکروں کے لیے دڑبے بنے ہوئے تھے، پڑے پڑے چنگھاڑا یا ہنہنایا کرتے تھے۔ کہیں دور دیہات میں ان کے سیکڑوں فارم بھی تھے جن میں اچھی پیداوار ہوتی تھی، لیکن شوق صاحب کا ان سب سے نہیں، بس پان، کتھے، سُپاری اور چُونے سے مطلب تھا۔

شوق صاحب جس کھڑکی کے پاس بیٹھتے تھے اس کی بغل میں چاندی کی پنّیوں میں لپٹی پان کی گلوریوں سے سجی ایک طشتری سجی رہتی، جس میں مہنگی سے مہنگی خوشبودار زردے کی ڈبیاں پڑی رہتیں۔ وہ موڈ کے مطابق گلوری اور تمباکو منہ میں ڈالتے، دیر تک طبیعت سے گھُلاتے اور تاک تاک کر کھڑکی سے باہر گلی میں تھوک مارتے۔

جب بھی اُن کی پیک کھڑکی سے باہر آتی، کسی نہ کسی کے سر اور کپڑوں پر پڑتی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ منہ کا ایسا سٹیک نشانے باز اس نگر میں کبھی نہیں ہوا، کوئی نہیں ہوا۔ کہنے والے تو کہتے ہیں کہ کبھی کبھی لوگ اُن کے نہ چُوکنے والے نشانے کا امتحان لینے کے لیے نیچے سے اکنّی یا اٹھنّی اُچھالتے تھے، اور جب وہ ٹنٹناتی ہوئی سڑک پر گرتی تو پیک میں بھیگی ہوئی ہوتی تھی۔

تو جس آدمی کے کپڑے، کرتا اور دھوتی لال ہوتے، اس پر ہونے والا ردعمل شوق صاحب بڑے شوق سے دیکھتے۔ کیا وہ بائیں دائیں تاک کر چپ چاپ نکل جانا چاہتا ہے؟ کیا وہ کھڑکی کی طرف سر اٹھاتا ہے، بھنبھناتا اور اُنھیں کوستا ہے؟ اور آخر میں کپڑے جھاڑ کر چل دیتا ہے؟ ایسے شریف اور بزدل قسم کے آدمیوں سے انھیں گھِن آتی اور وہ بچی کھچی پیک کی سِٹّی پیک دان میں تھوک دیتے۔

انھیں ایسے بہادروں کی تلاش رہتی جو کپڑے خراب ہوتے ہی ماں بہن کی دھواں دھار گالیں بکنا شروع کر دیں، اُچھلیں کودیں، آسمان سر پر اٹھالیں، رو گا کر محلّے والوں اور راہ چلتوں کو اپنے اِرد گرد جُٹا لیں۔ پھر بِلکیں، بلبلائیں، اور رحم کی بھیک مانگتے ہوئے، انصاف کا واسطہ دیتے ہوئے کہیں کہ اب وہ کیا پہنیں گے، ان کا کیا ہوگا۔

عین اس وقت جب وہ ماتھا پیٹ پاٹ کر اوپر والے کو گالیاں دے رہا ہوتا، اسی کوٹھی سے دو نوکر نکلتے اور ادب کے ساتھ اسے اوپر لے جاتے۔ اسے چندن کے صابن سے مل مل کر نہلایا جاتا، نیا کرتا اور نئی دھوتی پہنائی جاتی، عطر سے بدن آراستہ کیا جاتا، اچھے سے اچھا کھانا کھلایا جاتا، اور آخر میں اسے ہاتھی یا گھوڑے پر، جو اس کے لیے سپنا ہوتا، بٹھا کر گلی کے نکڑ تک وِداع کیا جاتا۔

ایسے مہمانوں کو پا کر شوق صاحب پھُولے نہ سماتے۔

دھیرے دھیرے ان کا نام گاؤں اور نگر کے باہر دور دور تک پہنچنے لگا۔ لوگ ہر جگہ چرچا کرتے کہ غریب نواز کی ایک کوٹھری دھوتیوں سے بھری ہوئی ہے اور دوسری اَدھی اور تن زیب کے کُرتوں سے۔ برآمدے میں برابر دو تین درزی سلائی کا کام کرتے رہتے ہیں۔ ان خبروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ طرح طرح کی گالیاں سیکھتے، رونے کلپنے کی عادت ڈالتے، اور پھر گلی کے چکر لگانا شروع کر دیتے۔ پتا نہیں کب

سرکار کا من بن جائے اور تھوک بیٹھیں۔
لہٰذا اپنے اوپر تھکوانے والوں کی جو بھیڑ بڑھنی شروع ہوئی اُس کا کوئی انت نہیں تھا۔

لیکن صاحب، تعریف کیجیے تو شوق صاحب کی۔ پیک کی طرح اُن کی نظر بھی نہ چُوکنے والی تھی۔ آپ دو چار دن تو کیا، مہینوں تک اس گلی میں ٹہلا کیجیے، وہ آپ پر نہیں تھوکیں گے سو نہیں تھوکیں گے۔ وہ آدمی کو اس کی چال سے پہچان لیتے کہ ایسی قابلیت کس شخص میں ہے۔ کون گالیاں دیتے دیتے رو سکتا ہے۔ یہی نہیں، کوئی لاکھ انجان بن کر، کھڑکی کو اَن دیکھا کرتے ہوئے، نیچے سے گزرنے کی کوشش کرے، وہ سمجھ جاتے کہ ابھی کتنے دن یا ہفتے یا مہینے پہلے یہ کم بخت سوَر اپنے پر تھکوا چکا ہے۔ کبھی کبھی تو، جب برداشت سے باہر ہو جاتا، جھلا کر بول بھی پڑتے، "ابے حرام خور، ابھی مہینا بھی نہیں گزرا کہ پھر آ پہنچا؟" یا "تیں کیسے آ گیارے؟ میں نے کیا کہا تھا، تیرے کو ٹھیک سے گالیاں بھی نہیں آتیں؟ آ گئیں کیا؟" یا "ارے، یہ کون ہے؟ چیتھڑو کا باپ؟ سسرے نہیں تو! میں نے کوئی ٹھیکا لیا ہے تیرے گھر بھر کا؟ بھاگ یہاں سے۔"

کچھ دن تک تو کئی ایسے لوگ بھی جو گھرانے دار تھے لیکن وقت کی مار سے خستہ حال ہو رہے تھے، پگڑی کے نیچے اپنا چہرہ چھپائے اور سر جھکائے اس گلی میں سے گزرتے اور پیک کی امید میں کھڑکی کے نیچے پہنچتے ہی اپنی چال دھیمی کر دیتے۔ شوق صاحب کی پکڑ میں آ جاتے اور وہ بے مروّت ہو کر ٹوک دیتے، "کیوں مجھے نرک میں ٹھیل رہے ہو مہاراج! میں تو ایسے بھی کرتا دھوتی دے دیتا، لیکن کیا کروں، اپنے قول سے بارا ہوں!" یا "بس کرو بابو صاحب، گالیاں تو دے لو گے، مگر رو کیسے پاؤ گے؟ عادت تو ڈالی نہیں، اور خواہ مخواہ اوپر سے مجھے بدنام کرو گے کہ اپنی ہی جات پر تھوکتا ہے۔"

اس طرح شوق صاحب نے جنتا کو یہ احساس کرا دیا کہ اُن کی پیک کے سچے حق دار کون ہیں۔
ایسے لوگ، جن کی تعداد بے حساب تھی، کھڑکی کے نیچے میلا سا لگائے ہوئے گھومتے گھامتے رہتے، اور ایک دوسرے سے یہ جاننا چاہتے کہ اُنہیں بھلا گالیوں سے اتنی محبت کیوں ہے۔ ان کے شان دار اور اُلوہی چہرے پر براق مونچھیں کتنی پھبتی ہیں! ہماری اتنی منت کے باوجود سرکار کبھی درشن دینے نیچے کیوں نہیں اُترتے؟ کیا وہ سچ مچ چلنے پھرنے لائق نہیں ہیں؟ کوئی تو ملتا جس نے انہیں کھڑکی کے سوا بھی کہیں دیکھا ہوتا! لیکن یہ پکا جان لو کہ اتنا رعب دار اور خرانٹ مرد کہیں ڈھونڈھے نہ ملے گا۔ ذرا دھن دھناتی بلند آواز تو سنو: "لے سالے، حرام خور، چرکٹ!"

مگر لوگوں کے نہ چاہتے ہوئے بھی، جب شوق صاحب کی نشانے بازی اپنے شباب پر تھی، وہ دن آ گیا جسے کبھی نہیں آنا چاہیے تھا اور جس کے بارے میں کسی نے سوچا تک نہ تھا۔ ایک مریل سا، سیکیا نوجوان، جو مہینوں سے گلی میں آ رہا تھا اور کرتا دھوتی لیتے لوگوں کو دیکھا کرتا تھا، ایک دن گھناؤنی حرکت کر بیٹھا۔ اُس نے ایک ایسے شخص کو جس پر پان کی پیک بس گرنے کو تھی، جانے کدھر سے دوڑ کر دھکا مار

دیا۔ وہ آدمی لڑھکتا ہوا دور جا گرا اور پیک موری کے پانی پر چھپاک کر کے رہ گئی۔

اُس وقت بھیڑ نے اُسے صرف بے عزت کر کے چھوڑ دیا۔

لیکن اس نوجوان نے جب وہی حرکت اگلے دن بھی کی، اور کسی دوسرے آدمی کے ساتھ، تو بھیڑ کا غصہ بڑھ گیا۔ وہ برداشت نہ کر سکی۔ اس نے اسے دس پانچ ہاتھ مارے اور سمجھایا کہ "صبر سے کام لے، اتنے لوگ مہینوں سے لگے ہوئے ہیں مگر اب تک باری نہیں آئی، اور تُو آناً فاناً میں ہتھیا لینا چاہتا ہے!" اس نے جیسے ہی کچھ بولنے کی کوشش کی، بھیڑ دوبارہ اس پر ٹوٹ پڑی۔

"چھوڑ دو اسے!" کھڑکی میں سے شوق صاحب نے للکار کر کہا۔ "اِسی حرام زادے کو کرتا دھوتی لے جانے دو۔ چل بے، سامنے آ!"

جب سامنے آیا تو شوق صاحب نے اس کا پورا جائزہ لیا، اس کی قد کاٹھی کا، ہاتھ پیروں کا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ عمر کا اندازہ نہیں لگ پا رہا تھا کیوں کہ مونچھیں تو پوری طرح آ گئی تھیں لیکن داڑھی کے بال صرف ٹھوڑی پر ہی تھے۔ چپٹی اور گانٹھ جیسی ناک کے باوجود وہ پُرکشش تھا۔ ذرا سی کھٹکنے والی بات بس یہ تھی کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی تھیں، ان میں کسی طرح کی بھوک یا لالچ نہیں تھی۔

اگر اس کے کپڑے گندے تے تو شوق صاحب نے اسے بھگا دیا ہوتا، کیوں کہ چیتھڑے اور مَٹ میلے کپڑوں پر تھوکنے سے انھیں گھن آتی تھی، اور لوگ اسے جانتے بھی تھے۔

"ہاں، تو آ سامنے!" انھوں نے آسن بدلا۔

اور پھر انھوں نے اسے نچانا شروع کیا۔ بھیڑ نے یہی دیکھا کہ شوق صاحب اُسے نچا نچا کر مار رہے ہیں۔ اُدھر تھوک ہی نہیں رہے ہیں جدھر وہ اُچھل کر کھڑا ہو رہا ہے۔ اگر وہ اسے کپڑے دینا چاہتے تو جانے کب کا تھوک کر وداع کر دیا ہوتا، لیکن وہ ابھی بچے کو پڑھا رہے ہیں۔ "ہاں، چل بے!"

شوق صاحب کو مزہ آ گیا۔ ایک مدت لمبے انتظار کے بعد انھیں کوئی مرد کا بچہ ملا تھا جس نے اپنی چستی اور چالاکی سے ان کی نشانے بازی کو چنوتی دی تھی۔ شام کے وقت جب نوجوان نے اپنے کپڑے ٹھیک کیے، ماتھے کا پسینا پونچھا اور ہانپتے ہوئے کھڑکی کی طرف اپنا سر اٹھایا، تو اس کے چھریرے بدن کا جائزہ لیتے ہوئے شوق صاحب نے اعلان کیا، "دیکھ، مرد کی زبان ایک! نہ اس کھڑکی سے مَیں ہٹوں گا اور نہ سڑک سے تُو! چاہے رات ہو جائے چاہے دن، نہ کوئی کھائے گا نہ پیے گا نہ آرام کرے گا۔ اگر اب سے سو بار بچا لے گیا اور ایک بھی چھینٹ تیرے بدن پر نہیں گری تو کپڑوں کے سوا میرے گھوڑوں میں جو تجھے پسند آئے لے جا! اسے تانگے میں جوت چاہے بیچ کھا، جیسی تیری مرضی!"

بھیڑ نے جے جے کار کیا اور کہا کہ سرکار اس بدماغ لونڈے پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو رہے ہیں۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے،" نوجوان نے پاؤں بدل کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا، تو یہ مجال!" شوق صاحب نے نشانہ سادھا۔

Scanned with CamScanner

پہلی بار، گلی میں، دروازے، کھڑکی، چھت پر براجے، پیڑ پر بیٹھے سارے عالم نے پہلی بار اس سوال جواب سے محسوس کیا کہ یہ کوئی کھیل تماشا نہیں، کچھ دوسری ہی بات ہے، کیوں کہ یہ لونڈا نہ گالیاں دے رہا ہے نہ رو رہا ہے، صرف اپنا بچاو کر رہا ہے، جبکہ سرکار سچ مچ، ایمان داری سے، سچے دل سے اس پر تھوکنا چاہتے ہیں۔ پھر بھی انہیں یہ کھل رہا تھا کہ اس سسرے کو کپڑے لتے، اور اب تو گھوڑا بھی، لے کر کنارے ہونا چاہیے اور دوسروں کو موقع دینا چاہیے۔ اتنے لوگ اپنا کام دھندا چھوڑ کر اتنی دیر سے، اتنے دن سے کھڑے ہیں، کچھ تو سوچنا چاہیے۔

نوجوان قاعدے سے پیک کے دائرے ہی میں تھا، اس کے باہر نہیں، اور اجازت بھی یہی تھی۔ طے ہوا تھا کہ تھوکے جانے کے وقت باہر سے کوئی بھی اشارہ نہیں کرے گا، اور اس کا بھی سختی سے پالن ہو رہا تھا۔ شوق صاحب اس کے غافل ہونے یا جھپکی لینے یا جھکنے کا انتظار کرتے اور بھوچک میں ہلا بول دیتے۔ نوجوان کا چوکنا پن غیر معمولی تھا۔ وہ بائیں یا دائیں گھومتے گھومتے اُچھل کر آگے یا پیچھے کھڑا ہو جاتا۔ کبھی کبھی تو بے مطلب گھنٹے بھر پیک کا انتظار کرنا پڑتا، لیکن موقعے کے وقت اچانک جھک کر یا اُچھل کر اپنے چوکنے پن کا ثبوت دے دیتا۔

یہ سب کچھ جتنا اُکتا دینے والا اور بور تھا، اتنا ہی تناو بھرا بھی، لیکن واہ رے شوق صاحب! وہ اوپر اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھے بیٹھے کھا بھی سکتے تھے، سو بھی سکتے تھے۔ نیچے سے کون دیکھتا ہے! اور دیکھنا بھی چاہے تو کسے دکھائی پڑے گا۔ لیکن نہیں، اصول تو اصول، راجا ہو یا رنک! وہ سست پڑنے لگے اور اِدھر صبح ہونے لگی۔

"چھو کرے!" انھوں نے سورج اُگتے اُگتے دوسرا اعلان کیا، حالاں کہ آواز تھوڑی مدھم اور کم زور تھی، "میں تیری ہمت اور دلیری سے خوش ہوا۔ چاہتا تو یہی تھا کہ تو راضی خوشی اپنے گھر جا، بیوی بچوں سے، ماں باپ سے مل، انہیں گھوڑا دکھا، ان کے ساتھ جشن منا، لیکن لگتا ہے تجھے منظور نہیں! اچھا جا، اگر آج بھی بچ گیا تو نولکھا ہاتھی تیرا! فیل بانی کر، اپنی اور اپنی دس پشتوں کی قسمت بنا!"

نوجوان لڑکھڑا رہا تھا، جیسے ہوش میں نہ ہو۔ اس نے اپنی بے قابو ہوتی زبان میں کہا، "مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"پھر سالے، کس لیے مر رہا ہے؟" بھیڑ گالیاں دیتی ہوئی اُسے پیٹنے کے لیے لپکی، لیکن پہلے ہی سے اس کے سر پر شوق صاحب کے نوکروں چاکروں کی تنی ہوئی لاٹھیاں دیکھیں تو ساکت ہو کر اپنی جگہ کھڑی ہو گئی۔

"خبردار!" شوق صاحب نے اوپر سے ڈپٹ کر سب کو ہٹایا اور کھڑکی سے، ہونٹوں کو بندوق کی نالی بنا کر، سدھی ہوئی پیک ماری۔

نوجوان اُچھلا، کھڑا ہوتے ہوتے گرا، مگر بچ گیا۔

شوق صاحب جھلا اٹھے۔ ان کا چہرہ تمتما اٹھا، نتھنے پھڑکنے لگے۔ ان کا گورا چٹا رنگ تانبے جیسا ہو

گیا۔ ہمیشہ مسکراتے رہنے والے دیالو سرکار کا یہ بھیانک روپ کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ اس کے بعد ہی انھوں نے فیصلہ ہونے تک مسلسل جنگ کا اعلان کر دیا۔

اور پھر گھنٹوں جو لڑائی چلی، اس کا اب تک کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس کا بیان وہی کر سکتا ہے جس کی زبان میں بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج اور موسلادھار بارش کو جذب کرنے کی طاقت ہو۔ دیکھتے دیکھتے کھڑکی سے نظر آنے والی ساری سڑک اور دیواریں لال ہونی شروع ہو گئیں۔ اس دوران نوجوان اُچھلتا رہا، کودتا رہا، ناچتا رہا، گرتا پڑتا رہا۔ اس کے کپڑے تار تار ہوے، کہنی اور گھٹنے پھوٹے، سینے پر کھرونچ آئی، مونڈھوں اور کندھوں پر موچ آئی، چھاتی دھونکنی کی طرح چلتی رہی، پسلیاں باہر جھانکنے لگیں، لیکن اس کے بدن پر ایک بھی چھینٹا نہ پڑا۔

اسے شوق صاحب کے لیے ہم دردی کہیے یا اپنی لالچ، بھیڑ نے بھی اُس کے ساتھ مروّت نہیں دکھائی۔ اُلٹے وہ اس کا مذاق اُڑاتی رہی، اس پر طنز کرتی رہی، بیچ بیچ میں کنکر اور لکڑیوں کے ٹکڑے تک پھینکتی رہی، لیکن اسے ڈگا نہ سکی۔

"چھوکرے، میرے سے کوئی چال تو نہیں چل رہا ہے؟" آخر میں تھک کر کھڑکی کے پلّے سے اپنے گال سٹائے ہوے شوق صاحب نے پوچھا۔

پسینے سے تربتر نوجوان نے سر اُٹھایا۔ "کیسی چال؟"

"گھناونی چال، یعنی کہ جادو ٹونا!"

نوجوان لمبی لمبی سانسیں لیتا ہوتا کتا رہا۔

"پھر مجھے کیوں لگتا ہے کہ تیری گردن لمبی ہو کر کھڑکی کے سامنے آرہی ہے، تیری آنکھیں میری آنکھوں میں گھسی آرہی ہیں، میری پیک اوپر ہی اوپر اُڑی جارہی ہے؟ تو جہاں کھڑا ہے وہاں نظر نہیں آ رہا ہے؟"

"چال وہ چلے صاحب، جو اپنی ماں سے گھات کرے!" نوجوان ہانپتے ہوے بولا۔

"شاباش!" پان کی گلوری طشتری سے اٹھاتے ہوے شوق صاحب نے خوش ہو کر سنایا۔ "شاباش بہادر، تو تیار ہو جا!"

دوپہر کے بعد بھیڑ نے غور کیا کہ شوق صاحب اور چھوکرا، دونوں کھائے پیے سوئے بغیر سُست پڑ چکے ہیں۔ چھوکرے سے نہ ٹھیک سے کھڑا ہوا جاتا ہے نہ اُچھلا جاتا ہے نہ چلا جاتا ہے۔ اسی طرح شوق صاحب کے نشانے میں نہ پہلے جیسی دھار ہے نہ طاقت نہ سیدھاپن۔ کبھی کبھی تو وہ کھڑکی سے گردن باہر کرتے اور پیک ان کے کھلے منہ سے باہر ٹھوڑی سے ہوتی ہوئی بوند بوند کر کے ٹپکنے لگتی۔ ایسی بھی نوبت آئی جب منہ کھلا رہتا اور کچھ بھی نہ گرتا۔ شام تک تو ایسا ہوا کہ نہ کھڑکی سے پیک گری اور نہ نوجوان کھڑا رہ سکا۔ وہ بائیں طرف جھکا جھکا کچھ دیر جھولتا رہا، پھر لڑھکا اور پیٹ کے بل ڈھیر ہو گیا۔ پھر کسی طرح بڑی

Scanned with CamScanner

مشقت کے بعد چت ہو سکا۔ اس نے زبان کی نوک سے اپنے ہونٹ تر کیے، دھیرے دھیرے پلکیں کھولیں اور اِدھر اُدھر کچھ دیکھنے کی کوشش کی۔ آخر اُس کی آنکھوں نے کھڑکی ڈھونڈھ لی اور وہیں ٹک گئیں۔

پھر بھی سب کا خیال تھا کہ اوپر سے پیک کی ایک بھی بوند گری تو کروٹ بدلنے کی بات تو چھوڑیے، اس میں ہلنے ڈُلنے تک کی طاقت نہیں رہ گئی ہے۔

لوگ تناؤ اور بے چینی سے بھرے ہوئے تھے، لیکن موسم خوش گوار اور جوش بھرا تھا۔ ٹھیک ویسا ہی جیسا ہونا چاہیے۔ دن کی دھوپ اور انگ انگ کو گرما چکی تھی اور شام کی ٹھنڈ نس نس میں نیند اور چین کا نشہ گھولے جا رہی تھی۔ ندی کی طرف سے آنے والی بسنت کی ہوا پکڑی کے بچے کھچے پتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی اور پھر کھڑکی سے گھس کر شوق صاحب کے سفید بالوں کو سہلا جاتی۔

نیلے اور کھلے آسمان میں پہلے بڑی دیر تک صرف ایک تارا ٹمٹماتا رہا، لیکن جیسے جیسے اندھیرا گھنا ہوتا گیا، سارا نیلاپن سفید کانپتے تاروں سے بھرنے لگا۔

لوگ ٹکٹکی لگائے کھڑے رہے کہ دیکھیں اس قتل کی رات میں کیا ہوتا ہے، بوند کب گرتی ہے!

اسی بوند کا انتظار کرتے کرتے اور ہوتے ہواتے صبح ہوئی تو چاروں طرف ایک سنسنی اور دہشت پھیل رہی تھی۔

نوجوان وہاں نہیں تھا جہاں پڑا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر بھی کہیں نہیں تھا۔ بھور میں تھوڑی دیر کے لیے لوگوں کو جھپکی آئی اور اس نے موقعے کا فائدہ اٹھا لیا۔ جتنے منہ اُتنی باتیں۔ کسی نے اندھیرے میں سنورے سنورے اُسے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا تو کسی نے کچھ لوگوں کو اُسے بھگا لے جاتے ہوئے۔ شوق صاحب کے آدمی بھی شک سے بَری نہیں تھے، لیکن یہ بھی تھا کہ ان کے لیے اُس کی اوقات مکھی سے زیادہ نہ تھی۔ جو کام کبھی بھی ہو سکتا تھا، اس کے لیے چوری کی کیا ضرورت؟

لوگوں نے شوق صاحب سے بہت کہا، ان کے اپنے لوگوں نے بھی اور بھیڑ نے بھی، کہ حضور کے آگے ایک لونڈے کی کیا بساط؟ وہ کیا کھا کر ٹکتا؟ یہ کیا کم ہے کہ اتنے دن ڈٹا رہ گیا؟ لہٰذا اُس کی چنتا چھوڑیں اور دنیا کو دیکھیں، اس کے دکھ درد اور تکلیف کو سنیں، لیکن اُن پر باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس اُداس اور گم سم بیٹھے تھے۔ نہ کچھ کھا پی رہے تھے اور نہ بول بتیا رہے تھے۔ انھوں نے چاروں دِشاؤں میں اپنے ہاتھی، گھوڑے اور بگھی دوڑا رکھے تھے۔ کبھی کبھی تو اُن کی گردن کھڑکی سے باہر آتی اور وہ اس اطمینان کے لیے نیچے جھانکتے کہ نوجوان سچ مچ غائب ہے یا ان کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے۔

یہ اعلان کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ آنسو گالوں پر ڈھلک ڈھلک آ رہے تھے کہ وہ کسی پر نہیں ٹھوکیں گے جب تک جُرم کرنے والا، اُسے بھگانے والا، خود سامنے آ کر قبول نہیں کرتا۔

Scanned with CamScanner

اس اعلان کا بڑا دردناک اثر ہوا۔ اسے سنتے ہی بھیڑ کے دکنی چھور پر، جہاں پکڑی کا پیڑ تھا جس کی ڈالیں چھوٹے بڑے، آدھ ننگے جسموں اور سروں سے لدی ہوئی تھیں، کوئی بولا، "ہائے کرتا!"، دوسرے کسی کونے سے ایک اور آواز آئی، "ہائے دھوتی!" دھیرے دھیرے ہر کونے سے آوازیں آنی شروع ہوئیں اور یہ کیرتن سا سنائی پڑنے لگا: "ہائے کرتا، ہائے دھوتی! ہائے چاول، ہائے روٹی!"

کچھ جو چپ چاپ کھڑے تھے اور گا نہیں رہے تھے، شک کی نگاہوں سے آگے پیچھے تاک رہے تھے اور سب کی بھلائی کو دیکھتے ہوئے آگے آنے کے لیے ایک دوسرے کو اکسا رہے تھے۔

"حضور!" آخر کار ایک بوڑھا آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر چلایا، "یہ قصور میرا ہے!"

شوق صاحب نے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ "کون ہے تُو؟"

"اُس اَبھاگے کا باپ،" بوڑھا بولا۔

"کیا کرتا ہے تُو؟"

"تھا تو ہل واہا حضور، لیکن جب سے زمین داری گئی، اِس نگر میں رکشا کھینچ رہا ہوں۔"

"اور تیرا بیٹا، وہ کیا کرتا ہے؟"

"کچھ نہیں سرکار! آوارہ اور نکما ہے۔ رات رات بھر دوستوں میں گپیں لڑاتا ہے، گھر سے غائب رہتا ہے، اَور بھی جانے کیا کیا کرتا ہے۔"

"انقلابی تو نہیں ہے؟"

"پتا نہیں حضور!"

شوق صاحب اسے چپ چاپ گھورتے رہے۔ اطمینان سے ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "مگر ایسا کیوں کیا تو نے؟"

"حضور، وہ میرا خون ہے، اور میں اُسے جانتا ہوں۔ وہ نہیں مرتا، ہرگز نہیں مرتا، لیکن آپ، سرکار---" وہ ہکلانے لگا، "اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو ہم کہیں کے نہ رہتے۔"

"لیکن تو نے دنیا کو جو بتایا کہ سرکار تیرے بیٹے کے مقابلے میں کمزور اور بزدل ہیں، اس کے لیے کیا کہتا ہے؟"

بوڑھا سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے یہ نہ سوچا تھا کہ اس کا مطلب ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے مدد کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لوگ باگ پیچھے سے گردن اُچکا اُچکا کر دیکھ رہے تھے اور اسے سننے کی کوشش کر رہے تھے۔

"سرکار، بزدل وہ ہے جو میدان چھوڑ دے، آپ نہیں!"

"یہ بات نہیں ہے بڈھے!" شوق صاحب کچھ دیر سوچتے رہے، "صاف صاف بول، تُو نے کس کی جان بچائی؟ میری یا اپنے بیٹے کی؟"

"اپنے بیٹے کی حضور!"

Scanned with CamScanner

"وہ کیسے؟"

"اگر آپ نہ ہوتے تو یہ لوگ، جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور کیرتن کر رہے ہیں، اُسے زندہ نہ چھوڑتے۔"

"سو کب؟ کب نہیں چھوڑتے؟"

"پہلے بھی، اور اب بھی۔"

"اب بھی؟ یہ بھلا کیوں؟"

"یہ اس لیے کہ آج آپ ہیں تو ہم ہیں، آپ نہیں تو ہم نہیں۔"

شوق صاحب ہنسے اور بڑی زور کی ہنسی ہنسے۔ ان کا بھاری بدن جب شانت ہوا تو بولے، "بڈھے، بہت چالاک ہے تُو! میں تیرے سے خوش بھی ہوں اور ناراض بھی۔ خوش اس لیے کہ تو نے میری جان بچائی لیکن نام بیٹے کا لیا، اور ناراض اس لیے کہ تو نے ایک ساتھ سب کو ذلیل کیا، مجھے بھی، اِس جمہوریت کو بھی اور بیٹے کی بہادری کو بھی۔۔۔ تُو بول، تیری منشا کیا ہے؟ کیا چاہتا ہے تُو؟"

"سرکار!" بڈھے نے سر جھکا لیا۔

وہ چوب داروں کے بیچ کھڑا تھا اور سوچ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کہے۔ اُسے سرکار کے رُخ کا بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس سے کیا سننا چاہتے ہیں۔ جب کافی دیر تک بڈھا شش و پنج میں کھڑا رہا اور کچھ نہ بول سکا تو شوق صاحب بھیڑ سے مخاطب ہوئے۔ "لوگو!" انھوں نے بھیڑ میں اعلان کیا، "وہ نوجوان جہاں کہیں بھی ہو، آسمان میں ہو تو آسمان میں سے، پاتال میں ہو تو پاتال میں سے، دھرتی پر ہو تو دھرتی پر سے، پکڑ کر حاضر کرو! جو حاضر کرے گا وہ بخشش کا حق دار ہو گا۔ جاؤ!"

بھیڑ دھیرے دھیرے چھٹنے لگی۔ لوگ دوڑتے گھومتے نظر آئے۔ شوق صاحب نے اپنے اعلان میں پانچ دن کی مہلت دی تھی اور کہا تھا کہ اس دوران وہ یہ وچار کریں گے کہ تھوکنے کا سلسلہ آگے بھی چلایا جائے یا بند کر دیا جائے۔ ان کی اس دھونس نے ہر آدمی کو چُست اور بے چین کر دیا تھا۔

دیکھتے دیکھتے گلی سُونی ہو گئی۔

"بڈھے!" جب سارے لوگ چلے گئے اور کوئی نہیں رہ گیا تو شوق صاحب بولے، "تُو نے اپنے بیٹے کی قیمت نہیں جانی بڈھے! بڑی قیمتی چیز ہے وہ! بول کتنا لگائے گا اس کا مول؟"

"سرکار!" بوڑھے نے تذبذب میں سڑک پر اپنا ماتھا رکھ دیا۔

"میں تھک گیا ہوں۔ اور زیادہ تھوکنا میرے بس کا نہیں۔ اب یہ کام تیرا بیٹا کرے تو کیسا رہے؟ اِسی گدّی پر بیٹھ کر، اِسی کھڑکی کے پاس!"

بڈھا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا منھ کھلا تھا اور دیر تک کھلا رہا۔ وہ بے یقینی کے ساتھ کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے سورج کو گواہ کر کے دونوں ہاتھ جوڑے اور آنکھیں بند کر لیں۔ "پیر کی دھُول کو چندن

بنانے والے پروردگار! ایسا نہ کریں، نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ مارے خوشی کے مر جاؤں گا!"

جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے بے چینی سے بے حال ہو کر کہا، "سرکار، آپ نے جو ابھی ابھی کہا، اُسے بھول تو نہ جائیں گے؟"

"بڈھے! شوق جو کہتا ہے اُسے کبھی نہیں بھولتا۔"

بڈھے کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا، لیکن اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ بیٹا آنے میں دیر کر رہا تھا۔ جب تک اُسے لے کر ہاتھی کوٹے تھے نہ گھوڑے نہ بگھی۔ اُسے خود پتا نہیں تھا، ورنہ دوڑا ہوا گیا ہوتا اور پکڑ لایا ہوتا۔

"سرکار!" اس نے التماس کیا۔ "اگر اجازت دیں تو میں خود دیکھوں؟"

"نہیں، تُو یہاں سے نہیں ہِل سکتا!" شوق صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔

بڈھا سر جھکا کر سوچنے لگا کہ اس کا بیٹا جو بڑا ہی بے کہا اور ضدّی ہے، کہاں کہاں جا سکتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت نہ جانے کہاں سے اُس کے من میں ایک شک پیدا ہوا۔

"لیکن حضور! وہ نیچ جات، دوسروں پر تھوکنا اُسے کیسے سوبھے گا؟" اس نے شوق صاحب سے عرض کیا۔

"کیوں؟"

"اس کے بھائی بند یہ کیسے برداشت کریں گے؟"

"جیسے مجھے کرتے ہیں۔"

بڈھا ہنسا۔ "آپ کی بات اَور ہے سرکار!"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" شوق صاحب گمبھیر ہو گئے اور سوچنے لگے۔ انھوں نے کئی بار چٹکیوں سے اپنی بھنویں مسلیں، پان کی گلوریاں جمائیں، پیک دان اٹھایا اور آخر میں راحت کی سانس لی۔ "میں نے فیصلہ کر لیا بڈھے! اگر وہ تھوکے اور سب سے پہلے مجھی سے شروع کرے تو کیسا رہے؟"

بڈھا بچکچایا۔ "کیا مطلب سرکار؟"

"مطلب یہ کہ کسی اَور پر تھوکنے سے پہلے اپنے باپ پر تھوکے، تو دوسروں کو کیا اعتراض؟"

بڈھے کا جی دھک سے رہ گیا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ "غضب ہو جائے گا سرکار! وہ جان دے دے گا لیکن یہ نہیں کرے گا۔"

"وہ کیا کرے گا کیا نہیں کرے گا، یہ مجھ پر چھوڑ!" شوق صاحب نے اُسے ڈانٹ کر تُرنت چپ کرا دیا۔

شوق صاحب اب کچھ بھی سننے کو تیار نہیں لگ رہے تھے۔ وہ پُرسکون ہو گئے تھے اور بڑی تیزی سے ان کا مُوڈ بدل رہا تھا۔ وہ کچھ گنگنا رہے تھے اور ران پر تال دے رہے تھے۔ جانے کتنے دنوں کے بعد کام دھام سے فرصت ملی تھی اُنھیں۔ انھوں نے جمائی لی اور منہ کے آگے چٹکیاں بجائیں۔

Scanned with CamScanner

کیا کریں کہ دن کٹے؟ یہ بات ان کے اندر اُٹھنے لگی تھی۔ انھوں نے باہر دیکھا۔ نہ لوگ تھے گریا نا تھا نہ گھگھیانا تھا۔ پان سے لال سڑک پر جان لیوا سناٹا تھا اور اس سے وقت نہیں کٹ سکتا تھا۔ انھوں نے اپنا سر کھجلایا اور تب تک کھجلاتے رہے جب تک ہاتھ درد نہیں کرنے لگا۔ پھر پیٹھ کھجلائی، پھر ہاتھوں کی انگلیاں چٹخائیں، پھر دانت کریدے اور کریدتے رہے۔ آخر میں شیشہ اٹھا کر جب چہرہ دیکھ رہے تھے تو کوٹھے کے دن یاد آنے لگے۔ خاص طور سے بیلا کی یاد آئی۔۔۔ ہائے ہائے! کیا گلا پایا تھا، کیا ترنم تھا اور کیا لوچ تھا۔۔۔

"ایک بار پھر سوچ لیں حضور! یہ اُس پر بھی ظلم ہو گا اور مجھ پر بھی۔ ہم کسے منہ دکھائیں گے؟" بڈھے سے رہا نہ گیا، اس نے پھر فریاد کی۔

شوق صاحب جھلّا اٹھے، انھیں غصہ آ گیا۔

"بے وقوف بڈھے! بھاگ سراہ اپنا کہ تیرا بیٹا، جو تیرے خیال سے آوارہ اور نکما ہے، تجھے وہ سب کچھ مہیا کرنے آ رہا ہے جس کے لیے ہر باپ جھینکا کرتا ہے، سمجھا؟" یہ کہہ کر انھوں نے نیچے جھانکا اور تھوڑی دیر چپ رہے۔ پھر بولے، "دیکھ! دماغ مت چاٹ۔ زندگی کے مزے لے۔ جب بڑے آدمی کی صحبت کی ہے تو عیش کر۔ بول، کیا سُنے گا؟ ٹھمری یا دادرا؟ ویسے موسم چیتا کا ہے۔ آہا، ہا! کوہی ٹھیاں جھولنی حیرانی ہو راما!" شوق صاحب نے آنکھیں بند کیں اور اندر کسی کو آواز دی، "او، کون ہے ادھر؟ بیلا بائی کو بھیج تو!"

بڈھے نے اپنے کانوں میں انگلیاں گھسیڑ لیں۔ اس کا ماتھا چکرانے لگا۔ اگر چوب داروں نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ بھرا پڑا ہوتا۔ اس کے دماغ میں اتنا تو آ رہا تھا کہ سرکار ٹھیک ہی کر رہے ہیں۔ وہ پکا آم، جانے کب چُو جائے۔ کے دن کی زندگانی ہے اس کی! لوگ بال بچوں ہی کے لیے جیتے ہیں، اور یہاں بیٹے کو راج مل رہا ہے، اور وہ بھی اپنے آپ۔ دنیا اسے "حضور"، "مالک" اور "سرکار" کہا کرے گی اور تکوانے کے لیے ترسا کرے گی، لیکن من کہہ رہا تھا کہ ایسے جینے سے تو مر جانا اچھا۔ وہ بھی کیا باپ جس پر بیٹا تھوکے!

اچانک جانے کہاں سے، شاید اس کی انتر آتما سے، آواز آئی کہ لاکھ ڈھونڈھو، وہ نہیں ملے گا!

اسے گدگدی سی محسوس ہوئی اور اس نے اوپر تاکا۔

گراموفون کا ریکارڈ پورے سُر میں بج رہا تھا اور کھڑکی پر بیٹھے بیٹھے شوق صاحب جھوم رہے تھے۔

"سرکار، اگر وہ نہ آئے تو؟" بڈھے نے خوشی میں چلّا کر پوچھا۔

شوق صاحب کا دھیان ٹوٹا۔ انھوں نے ناک بھوں سکیڑی۔ انھیں یہ کھٹ راگ بڑا ہی بے سُرا لگا، پھر بھی انھوں نے ضبط سے کام لیا۔ "ابے الّو کے پٹھے! اسے بُلا کون رہا ہے؟ وہ لایا جا رہا ہے!"

"لیکن وہ نہ ملے تو؟" بڈھا اسی رو میں چلّایا۔

Scanned with CamScanner

شوق صاحب نے بیلا بائی کو، یا جو بھی رہی تھیں انہیں، تھوڑی دیر کے لیے چپ کروایا اور غصے سے بڈھے کو دیکھا۔ بڈھا سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا منہ اٹھائے مچمچاتی آنکھوں سے ان کی طرف تاک رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ جُڑے تھے اور کانپ رہے تھے۔ اغل بغل چوب دار اُس کی بانہہ پکڑے ہوئے اسے دھتکار رہے تھے۔

غصے میں تو بہت تھے شوق صاحب، لیکن انہیں رحم آ گیا۔ اِدھر چیتا نے بھی ان کے دل کو نرمی اور سخاوت سے بھر دیا تھا۔ وہ و نود میں مسکرا اٹھے۔ "بھانڈوں اور لونڈوں کے ناچ کے رسیا بڈھے! تجھے مجرے کا مزہ کیا معلوم! تیری تنگ جُوتی کی طرح بیچ بیچ میں کاٹ رہا ہے۔ اچھا، اب ساری باتوں کا لب لباب سن لے، اور یہ ہائے ہائے بند کر۔ رعایت نہیں چلے گی یہاں۔ اگر تُو نے تھوکنے والے کو بیٹا جان کر گالیاں دینے میں، رونے میں، گڑگڑانے میں کوتاہی کی، چُوک کی، تو یاد رکھ! ایک بار نہیں، دو بار نہیں، تین بار نہیں، وہ تب تک تھوکتا جائے گا جب تک ہمیں سنتوش نہ ہو، بس! ہاں، تو بیلا رانی، اب شروع کر!"

گراموفون کی آواز پھر کھڑکی سے باہر آئی اور دھوپ میں بل کھانے لگی۔ شوق صاحب تال ہی نہیں دے رہے تھے، سے سے پر سُر بھی ملا رہے تھے۔

بڈھے نے اونچی آواز میں پھر کچھ کہا، لیکن خود نہیں سن سکا کہ کیا کہہ رہا ہے۔

وہ پالتھی مار کر وہیں سڑک پر بیٹھ گیا۔

شوق صاحب انتظار کر رہے تھے آنے کا۔

بڈھا انتظار کر رہا تھا نہ آنے کا۔

یہ پہلا دن تھا۔ چار دن اَور باقی تھے۔

شوق صاحب کے نام پر بنے اس نگر کے اس چوراہے پر، جسے لوگ "شوق" کی جگہ "چوک" کہتے ہیں، سال میں ایک بار بربادنگل ہوتا ہے جس میں بربا گانے والی دونوں پارٹیاں آپس میں سوال جواب کرتی ہیں۔ حالاں کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ چھٹے روز کیا ہوا تھا، پھر بھی بربیوں کی آخری لڑنت ہوتی ہے بھور میں، جس کے فیصلے کا دارومدار ان سوالوں کے جواب پر ہوتا ہے کہ نوجوان ملایا نہیں، گدی پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا تو بیٹھا یا نہیں، اپنے باپ پر تھوکا یا نہیں، تھوکا تو باپ نے کچھ کیا یا نہیں۔۔۔

اس میں شک نہیں کہ جواب تو اچھے سے اچھے دیے جاتے ہیں، مگر سننے والوں کا من نہیں بھرتا۔

**

موہن راکیش

ہندی سے ترجمہ: ولی رام ولبھ

ملبے کا مالک

پورے ساڑھے سات سال بعد وہ لوگ لاہور سے امرتسر آئے تھے۔ باکی کا میچ دیکھنے کا تو بہانہ ہی تھا، اُنھیں زیادہ چاؤ اُن گھروں اور بازاروں کو پھر سے دیکھنے کا تھا جو ساڑھے سات سال پہلے ان کے لیے پرائے ہو گئے تھے۔ ہر سڑک پر مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی ٹولی گھومتی نظر آ جاتی تھی۔ اُن کی آنکھیں اس احساس کے ساتھ وہاں کی ہر چیز کو دیکھ رہی تھیں جیسے وہ شہر سادھارن شہر نہیں بلکہ ایک اچھا خاصا کشش کا مرکز ہو۔

تنگ بازاروں میں سے گزرتے ہوئے وہ ایک دوسرے کو پرانی چیزوں کی یاد دلا رہے تھے۔ "دیکھ فتح دینا، مصری بازار میں اب مصری کی دکانیں پہلے سے کتنی کم رہ گئی ہیں!--- اس نکڑ پر سکھی بھٹیارن کی بھٹی تھی جہاں اب یہ پان والا بیٹھا ہے--- یہ نمک منڈی دیکھ لو، خان صاحب! یہاں کی ایک ایک لالائن وہ نمکین ہوتی ہے کہ بس---"

بہت دنوں کے بعد بازاروں میں طرّہ دار اور لال تُرکی ٹوپیاں نظر آ رہی تھیں۔ لاہور سے آئے ہوئے مسلمانوں میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنھیں بٹوارے کے وقت مجبور ہو کر امرتسر چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ ساڑھے سات سال میں آئی بہت سی تبدیلیوں کو دیکھ کر کہیں ان کی آنکھوں میں حیرانی بھر جاتی اور کہیں افسوس گھر آتا۔ "واللہ، کٹڑا جیمل سنگھ اتنا چوڑا کیسے ہو گیا؟ کیا اس طرف کے سب مکان جل گئے؟ یہاں حکیم آصف علی کی دکان تھی نا؟ اب یہاں ایک موچی نے قبضہ کر رکھا ہے---"

اور کہیں کہیں ایسی بھی باتیں سنائی دے جاتیں: "ولی، یہ مسجد جوں کی توں کھڑی ہے؟ ان لوگوں نے اس کا گردوارہ نہیں بنایا؟"

Scanned with CamScanner

جس راستے سے پاکستانیوں کی ٹولی گزرتی، شہر کے لوگ مشتاق ہو کر اس کی طرف دیکھتے رہتے۔ کچھ لوگ اب بھی مسلمانوں کو آتے دیکھ کر خوف زدہ سے ہو کر راستے سے ہٹ جاتے، جب کہ دوسرے لوگ بڑھ کر اُن سے بغل گیر ہونے لگتے۔ زیادہ تر وہ آنے والوں سے ایسے ایسے سوال پوچھتے کہ "آج کل لاہور کا کیا حال ہے؟ انار کلی میں اب پہلے جتنی رونق ہوتی ہے یا نہیں؟ سنا ہے شاہ عالمی گیٹ کا بازار پورا نیا بنا ہے؟ کرشن نگر میں تو خاص تبدیلی نہیں آئی؟ وہاں کا رشوت پورہ کیا واقعی رشوت کے پیسے سے بنا ہے؟ کہتے ہیں پاکستان میں اب برقع بالکل اُڑ گیا ہے، یہ ٹھیک ہے؟" ان سوالوں میں اتنا اپنا پن جھلکتا تھا کہ لگتا تھا لاہور ایک شہر نہیں ہزاروں لوگوں کا سگا سمبندھی ہے جس کے حالات جاننے کے لیے وہ بے چین ہیں۔ لاہور سے آئے ہوئے لوگ اُس دن شہر بھر کے مہمان تھے جن سے مل کر اور باتیں کر کے لوگوں کو خواہ مخواہ خوشی کا احساس ہوتا تھا۔

بازار بانساں امرتسر کا ایک عام سا بازار ہے، جو بٹوارے سے پہلے غریب مسلمانوں کی بستی تھی۔ وہاں زیادہ تر بانسوں اور شہتیروں کی دکانیں تھیں جو سب کی سب ایک ہی آگ میں جل گئی تھیں۔ بازار بانساں کی وہ آگ امرتسر کی سب سے بھیانک آگ تھی جس سے کچھ دیر کے لیے تو سارے شہر کے جل جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ بازار بانساں کے آس پاس کے کئی محلّوں کو تو اس آگ نے لپیٹ میں لے ہی لیا تھا۔ خیر، کسی طرح وہ آگ قابو میں آ تو گئی پر اُس میں مسلمانوں کے ایک ایک گھر کے ساتھ ہندوؤں کے بھی چار چار چھ چھ گھر جل کر راکھ ہو گئے۔ اب ساڑھے سات سال میں ان میں کئی عمارتیں پھر سے کھڑی ہو گئی تھیں مگر جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر اب بھی موجود تھے۔ نئی عمارتوں کے بیچ بیچ میں ملبے کے ڈھیر عجیب ہی ماحول پیش کرتے تھے۔

بازار بانساں میں اُس دن بھی چہل پہل تھی کیوں کہ بازار کے زیادہ تر باشندے تو اپنے مکانوں کے ساتھ ہی شہید ہو گئے تھے اور جو بچ کر چلے گئے تھے ان میں سے شاید کسی میں بھی لوٹ کر آنے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ صرف ایک دبلا پتلا بوڑھا مسلمان ہی اُس بازار میں آیا اور وہاں کی نئی اور دھلی ہوئی عمارتوں کو دیکھ کر جیسے بھول بھلیاں میں پڑ گیا۔ بائیں ہاتھ کو جانے والی گلی کے پاس پہنچ کر اس کے قدم اندر مڑنے کو ہوئے، مگر پھر وہ ہچکچا کر وہاں باہر ہی کھڑا رہ گیا، جیسے اسے وشواس نہ ہوا ہو کہ یہ وہی گلی ہے یا نہیں جس میں وہ جانا چاہتا ہے۔ گلی میں ایک طرف کچھ بچے کیڑی کاڑا کھیل رہے تھے اور کچھ دور پر دو عورتیں اونچی آواز میں چیختی ہوئی ایک دوسرے کو گالیاں دے رہی تھیں۔

"سب کچھ بدل گیا ہے مگر بولیاں نہیں بدلیں،" بوڑھے مسلمان نے دھیمے لہجے میں اپنے سے کہا اور چھڑی کا سہارا لیے کھڑا رہا۔ اس کے گھٹنے پاجامے سے باہر نکل رہے تھے اور گھٹنوں کے تھوڑا ہی اوپر اس کی شیروانی میں تین چار پیوند لگے تھے۔ گلی سے ایک بچہ روتا ہوا باہر کو آ رہا تھا۔ اس نے اُسے پچکار کر کہا، "ادھر آ بیٹے، آ ادھر! دیکھ، تجھے چیجی دیں گے۔ آ!" اور وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اُسے دینے کے لیے کوئی چیز ڈھونڈنے لگا۔ بچہ لمحہ بھر کے لیے چپ کر گیا لیکن پھر اس نے ہونٹ بسور لیے اور رونے لگا۔

ایک سولہ سترہ برس کی لڑکی اندر سے دوڑتی ہوئی آئی اور بچے کی بانہہ پکڑ کر اُسے گھسیٹتی ہوئی گلی میں لے چلی۔ بچہ رونے کے ساتھ ساتھ اپنی بانہہ چھڑانے کے لیے مچلنے لگا۔ لڑکی نے اسے بانہوں میں اٹھا کر اپنے ساتھ چپکا لیا اور اس کا منہ چومتے ہوئے بولی، "چپ کر میرے ویر! روئے گا تو تجھے وہ مسلمان پکڑ کر لے جائے گا۔ میں واری جاؤں، چپ کر!"

بوڑھے مسلمان نے بچے کو دینے کے لیے جو پیسا نکالا تھا وہ واپس جیب میں رکھ لیا۔ سر سے ٹوپی اتار کر اس نے وہاں تھوڑا کھجایا اور ٹوپی بغل میں دبا لی۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور گھٹنے ذرا ذرا کانپ رہے تھے۔ اس نے گلی کے باہر کی بند دکان کے تختے کا سہارا لے لیا اور ٹوپی پھر سے سر پر لگا لی۔ گلی کے سامنے، جہاں پہلے اونچے اونچے شہتیر رکھے رہتے تھے، وہاں اب ایک تمنزلہ مکان کھڑا تھا۔ سامنے بجلی کے تار پر دو موٹی موٹی چیلیں بالکل ساکت بیٹھی تھیں۔ بجلی کے کھمبے کے پاس تھوڑی دھوپ تھی۔ وہ کئی پل دھوپ میں اڑتے ہوئے ذرّوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے منہ سے نکلا، "یا مالک!"

ایک نوجوان چابیوں کا گچھا گھماتا ہوا گلی کی طرف آیا اور بوڑھے کو کھڑا دیکھ کر اس نے رک کر پوچھا، "کہیے میاں جی، یہاں کس طرح کھڑے ہیں؟"

بوڑھے مسلمان کی چھاتی اور بانہوں میں ہلکی سی کپکپی ہوئی اور اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر نوجوان کو دھیان سے دیکھتے ہوئے کہا، "بیٹے، تیرا نام منوری نہیں ہے؟"

نوجوان نے چابیوں کا گچھا ہلانا بند کر کے مٹھی میں لے لیا اور اچرج کے ساتھ پوچھا، "آپ کو میرا نام کیسے پتا ہے؟"

"ساڑھے سات سال پہلے تُو بیٹے، اتنا سا تھا،" یہ کہہ کر بوڑھے نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"آپ آج پاکستان سے آئے ہیں؟" منوری نے پوچھا۔

"ہاں۔ مگر پہلے ہم اسی گلی میں رہتے تھے،" بوڑھے نے کہا۔ "میرا لڑکا چراغ دین تم لوگوں کا درزی تھا۔ تقسیم سے چھ مہینے پہلے ہم لوگوں نے یہاں اپنا نیا مکان بنایا تھا۔"

"او، غنی میاں!" منوری نے پہچان کر کہا۔

"ہاں بیٹے، میں تم لوگوں کا غنی میاں ہوں۔ چراغ اور اس کے بیوی بچے تو نہیں مل سکتے، مگر میں نے کہا کہ ایک بار مکان کی صورت ہی دیکھ لوں۔" اور اس نے ٹوپی اتار کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آنسوؤں کو بہنے سے روک لیا۔

"آپ تو شاید کافی پہلے ہی یہاں سے چلے گئے تھے،" منوری نے لہجے میں ہمدردی لا کر کہا۔

"ہاں بیٹے، یہ میری بدبختی تھی کہ پہلے اکیلا نکل کر چلا گیا۔ یہاں رہتا تو اُن کے ساتھ میں بھی۔۔۔" اور کہتے کہتے اُسے احساس ہو آیا کہ اُسے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔ اس نے بات منہ میں روک لی، مگر آنکھ میں آئے ہوئے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا۔

"چھوڑو غنی میاں، اب بیتی باتوں کو سوچنے میں کیا رکھا ہے!" منوری نے غنی کی بانہہ پکڑ کر کہا۔

Scanned with CamScanner

"چلو، تمھیں تمھارا گھر دکھا دوں۔"

گلی میں خبر اس روپ میں پھیلی تھی کہ گلی کے باہر ایک مسلمان کھڑا ہے جو رام داسی کے لڑکے کو اٹھانے جا رہا تھا۔ اُس کی بہن اُسے پکڑ کر گھسیٹ لائی، نہیں تو مسلمان اُسے لے گیا ہوتا۔ یہ خبر پاتے ہی جو عورتیں گلی میں پیڑھے بچھا کر بیٹھی تھیں، وہ اپنے اپنے پیڑھے اُٹھا کر گھروں کے اندر چلی گئیں۔ گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کو بھی اُن عورتوں نے پکار پکار کر گھروں میں بلا لیا۔ منوری جب غنی کو لے کر گلی میں آیا تو گلی میں ایک پھیری والا رہ گیا تھا یا کنویں کے ساتھ ساتھ اُگے پیپل کے نیچے رکھا پہلوان بکھر کر سویا پڑا تھا۔ گھروں کی کھڑکیوں میں سے اور کواڑوں کے پیچھے سے البتہ کئی چہرے جھانک رہے تھے۔ غنی کو گلی میں آتے دیکھ کر اُن میں ہلکی ہلکی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ داڑھی کے سب بال سفید ہو جانے کے باوجود لوگوں نے چراغ دین کے باپ عبدالغنی کو پہچان لیا تھا۔

"وہ تھا تمھارا مکان،" منوری نے دور ایک ملبے کی طرف اشارہ کیا۔ غنی پل بھر کے لیے ٹھٹک کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرف دیکھتا رہا۔ چراغ اور اس کے بیوی بچوں کی موت کو تو وہ کافی عرصہ پہلے تسلیم کر چکا تھا، مگر اپنے نئے مکان کو اس روپ میں دیکھ کر اُسے جو جھنجھنی ہوئی اُس کے لیے وہ تیار نہ تھا۔ اس کی زبان پہلے سے زیادہ خشک ہو گئی اور گھٹنے بھی اور زیادہ کانپنے لگے۔

"وہ ملبہ؟" اس نے بے یقینی کے لہجے میں کہا۔

منوری نے اس کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ دیکھا، اس کی بانہہ کو اور سہارا دے کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا، "تمھارا مکان اُنھیں دنوں جل گیا تھا۔"

غنی چھڑی کا سہارا لیتا ہوا کسی طرح ملبے کے پاس پہنچ گیا۔ ملبے میں اب مٹی ہی مٹی تھی جس میں جہاں تہاں ٹوٹی اور جلی ہوئی اینٹیں پھنسی تھیں۔ لوہے اور لکڑی کا سامان اس میں سے نہ جانے کب کا نکال لیا گیا تھا۔ صرف جلے ہوئے دروازے کی چوکھٹ نہ جانے کیسے بچی رہ گئی تھی جو ملبے میں سے باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ پیچھے کی طرف دو جلی ہوئی الماریاں تھیں جن کی کالک پر اب سفیدی کی ہلکی ہلکی تہہ اُبھر آئی تھی۔ ملبے کو پاس سے دیکھ کر غنی نے کہا، "یہ باقی رہ گیا ہے؟ یہ؟" اور جیسے اس کے گھٹنے جواب دے گئے اور وہ جلی ہوئی چوکھٹ کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ لمحہ بھر بعد اس کا سر بھی چوکھٹ سے جا لگا اور اس کے منہ سے بلکنے کی سی آواز نکلی، "ہائے، اوئے چراغ دین!"

جلے ہوئے کواڑ کی چوکھٹ ساڑھے سات سال ملبے میں سے سر نکالے کھڑی تو رہی تھی مگر اس کی لکڑی بُری طرح بھُربھُرا گئی تھی۔ غنی کے سر کے چھُونے سے اس کے کئی ریشے جھڑ کر بکھر گئے۔ کچھ ریشے غنی کی ٹوپی اور بالوں پر آ گرے۔ لکڑی کے ریشوں کے ساتھ ایک کینچوا بھی نیچے گرا اور غنی کے پیر سے چھ آٹھ انچ دور نالی کے ساتھ لگی اینٹوں کی پٹڑی پر سرسرانے لگا۔ وہ اپنے لیے سوراخ ڈھونڈتا ہوا ذرا سا سر اٹھاتا، مگر ایک دو بار سر پٹک کر اور نراس ہو کر دوسری طرف کو مڑ جاتا۔

کھڑکیوں میں سے جھانکنے والے چہروں کی تعداد اب پہلے سے کہیں بڑھ گئی تھی۔ اُن میں چہ

میگوئیاں چل رہی تھیں کہ آج کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ چراغ دین کا باپ غنی آ گیا ہے، اس لیے ساڑھے سات سال پہلے کی ساری بات آج کھل جائے گی۔ لوگوں کو لگ رہا تھا جیسے وہ ملبہ ہی غنی کو ساری کہانی سنا دے گا کہ شام کے وقت چراغ اوپر کے کمرے میں کھانا کھا رہا تھا جب رکھا پہلوان نے اسے نیچے بلایا کہ ایک منٹ آ کر ایک ضروری بات سن جائے۔ پہلوان اُن دنوں گلی کا بادشاہ تھا۔ ہندوؤں پر ہی اس کا کافی دبدبہ تھا، چراغ تو خیر مسلمان تھا۔ چراغ ہاتھ سے نوالہ رکھ کر نیچے اُتر آیا۔ اس کی بیوی زبیدہ اور دونوں لڑکیاں کشور اور سلطانہ کھڑکیوں میں سے نیچے جھانکنے لگیں۔ چراغ نے ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ پہلوان نے اسے قمیص کے کالر سے پکڑ کر کھینچ لیا اور گلی میں گرا کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ چراغ اس کا چھُرے والا ہاتھ پکڑ کر چلّایا، "نہ، رکھے پہلوان، مجھے مت مار! ہائے! کوئی مجھے بچاؤ! زبیدہ، مجھے بچا!" اور اوپر زبیدہ، کشور اور سلطانہ ہکا بکا ہو کر چلّانے لگیں۔ زبیدہ چیختی ہوئی نیچے ڈیوڑھی کی طرف بھاگی۔ رکھے کے ایک شاگرد نے چراغ کی جدوجہد کرتی ہوئی بانہیں پکڑ لیں اور رکھا اس کی جانگھوں کو گھٹنے سے دبائے ہوئے بولا، "چیختا کیوں ہے، بھین کے۔۔۔ تجھے پاکستان دے رہا ہوں۔ لے!" اور زبیدہ کے نیچے پہنچنے سے پہلے ہی چراغ کو پاکستان دے دیا۔

آس پاس کے گھروں کی کھڑکیاں بند ہو گئیں۔ جو لوگ اس منظر کے گواہ تھے انھوں نے اپنے دروازے بند کر کے اپنے کو اس واقعے کی جواب دہی سے آزاد کر لیا۔ بند کواڑوں میں بھی انھیں دیر تک زبیدہ، کشور اور سلطانہ کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ رکھے پہلوان اور اس کے ساتھیوں نے اُنھیں بھی اُسی رات پاکستان دے کر وداع کر دیا، مگر دوسرے طویل راستے سے۔ ان کی لاشیں چراغ کے گھر میں نہیں بلکہ بعد میں نہر کے پانی میں پائی گئیں۔

دو دن تک چراغ کے گھر کی چھان بین ہوتی رہی تھی۔ جب اُس کا سارا سامان لُوٹا جا چکا تو نہ جانے کس نے اس گھر کو آگ لگا دی۔ رکھے پہلوان نے قسم کھائی تھی کہ وہ آگ لگانے والے کو زندہ زمین میں گاڑ دے گا، کیوں کہ اس نے اس مکان پر نظر رکھ کر ہی چراغ کو مارنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس نے اس مکان کو شُدھ کرنے کے لیے ہَون سامگری بھی خرید رکھی تھی۔ مگر آگ لگانے والے کا پتا ہی نہیں چل پایا، اسے زندہ گاڑنے کی نوبت تو بعد میں آتی۔ اب ساڑھے سات سال سے رکھا پہلوان اس ملبے کو اپنی جاگیر سمجھتا آ رہا تھا، جہاں وہ نہ کسی کو گائے بھینس باندھنے دیتا تھا اور نہ خوانچہ لگانے دیتا تھا۔ اس ملبے سے اس کی اجازت کے بغیر کوئی اینٹ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

لوگ امید کر رہے تھے کہ یہ ساری کہانی ضرور کسی نہ کسی طرح غنی کے کانوں تک پہنچ جائے گی، جیسے ملبے کو دیکھ کر اسے اپنے آپ ہی پورے واقعے کا پتا چل جائے گا۔ اور غنی ملبے کی مٹی ناخونوں سے کھود کھود کر اپنے اوپر ڈال رہا تھا اور دروازے کی چوکھٹ کو بانہوں میں لیے رو رہا تھا۔ "بول چراغ دینا، بول! تو کہاں چلا گیا اوئے! او کشور! او سلطانہ! ہائے میرے بچے اوئے! غنی کو کہاں چھوڑ گئے اوئے!"

اور بھُربھُرے سے لکڑی کے ریشے جھڑتے جا رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

پیپل کے نیچے سوئے ہوئے رکھے پہلوان کو نہ جانے کسی نے جگا دیا یا وہ خود ہی جاگ گیا۔ یہ جان کر کہ پاکستان سے عبدالغنی آیا ہے اور اپنے مکان کے ملبے پر بیٹھا ہے، اس کے گلے میں تھوڑا جھاگ اٹھ آیا جس سے اسے کھانسی ہو آئی اور اس نے کنویں کے فرش پر تھوک دیا۔ ملبے کی طرف دیکھ کر اس کی چھاتی سے دھونکنی کی سی آواز نکلی اور اس کا نچلا ہونٹ تھوڑا باہر کو پھیل گیا۔

"غنی اپنے ملبے پر بیٹھا ہے،" اس کے شاگرد لچھے پہلوان نے اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ملبہ اُس کا کیسے ہے؟ ملبہ ہمارا ہے!" پہلوان نے جھاگ کی وجہ سے بھاری ہوتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مگر وہ وہاں پر بیٹھا ہے،" لچھے نے آنکھوں میں پُراسرار اشارہ لاتے ہوئے کہا۔

"بیٹھا ہے بیٹھا رہے۔ تُو چلم لا!" اس کی ٹانگیں تھوڑی پھیل گئیں اور اس نے اپنی ننگی جانگھوں پر ہاتھ پھیرا۔

"منوری نے اگر اُسے کچھ بتایا وتایا تو---" لچھے نے چلم بھرنے کے لیے اٹھتے ہوئے اُسی پراسرار نظر سے دیکھ کر کہا۔

"منوری کی شامت آئی ہے؟"

لچھا چلا گیا۔

کنویں پر پیپل کی پرانی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ رکھا ان پتیوں کو اٹھا اٹھا کر ہاتھوں میں مسلتا رہا۔ جب لچھے نے چلم کے نیچے کپڑا لگا کر اس کے ہاتھ میں دیا تو اس نے کش کھینچتے ہوئے پوچھا، "اور تو کسی سے غنی کی بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔"

"لو،" اس نے کھانستے ہوئے چلم لچھے کے ہاتھ میں دے دی۔ لچھے نے دیکھا کہ منوری ملبے کی طرف سے غنی کی بانہہ پکڑے ہوئے آ رہا ہے۔ وہ اکڑوں ہو کر چلم کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ اس کی آنکھیں آدھا لمحہ رکھے کے چہرے پر ٹکتیں اور آدھا لمحہ غنی کی طرف لگی رہتیں۔

منوری غنی کی بانہہ پکڑے ہوئے اس سے ایک قدم آگے چل رہا تھا، جیسے اس کی کوشش ہو کہ غنی کنویں کے پاس سے بنا رکھے پہلوان کو دیکھے ہی نکل جائے۔ مگر رکھا جس طرح بکھر کر بیٹھا تھا، اس سے غنی نے اُسے دور ہی سے دیکھ لیا۔ کنویں کے پاس پہنچتے پہنچتے اس کی دونوں بانہیں پھیل گئیں اور اس نے کہا، "رکھے پہلوان!"

رکھے نے گردن اٹھا کر اور آنکھیں ذرا چھوٹی کر کے اُسے دیکھا۔ اس کے گلے میں ہلکی سی گھرگھراہٹ ہوئی، پر وہ بولا کچھ نہیں۔

"رکھے پہلوان! مجھے پہچانا نہیں؟" غنی نے بانہیں نیچے کر کے کہا۔ "میں غنی ہوں، عبدالغنی۔ چراغ دین کا باپ!"

پہلوان نے شک بھری نظر سے اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ عبدالغنی کی آنکھوں میں اُسے

Scanned with CamScanner

دیکھ کر چمک آ گئی۔ سفید داڑھی کے نیچے اس کے چہرے کی جھرّیاں ذرا پھیل گئی تھیں۔ رکھے کا نچلا ہونٹ پھڑکا، پھر اس کی چھاتی سے بھاری سی آواز نکلی، "سُنا غنیا!"

غنی کی بانہیں پھر پھیلنے کو ہوئیں، مگر پہلوان پر کوئی رد عمل نہ دیکھ کر اُسی طرح رہ گئیں۔ وہ پیپل کے تنے کا سہارا لے کر کنویں کی سِل پر بیٹھ گیا۔

اوپر کھڑکیوں میں چہ میگوئیاں تیز ہو گئیں کہ اب دونوں آمنے سامنے آ گئے ہیں تو بات ضرور کھُلے گی۔ پھر ہو سکتا ہے دونوں میں گالی گلوچ بھی ہو۔ اب رکھا غنی کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اب وہ دن نہیں رہے۔ بڑا ملبے کا مالک بنتا تھا! اصل میں ملبہ نہ اِس کا ہے نہ غنی کا۔ ملبہ تو سرکار کی ملکیت ہے۔ مردود وہاں کسی کو گاے کا کھونٹا تک نہیں لگانے دیتا۔ منوری بھی ڈرپوک ہے، اس نے غنی کو بتایا کیوں نہیں کہ رکھے ہی نے چراغ اور اس کے بیوی بچوں کو مارا ہے۔ رکھا آدمی نہیں سانڈ ہے۔ دن بھر سانڈ کی طرح گلی میں گھومتا ہے۔ غنی بےچارہ کتنا دُبلا ہو گیا ہے! داڑھی کے سارے بال سفید ہو گئے۔۔۔

غنی نے کنویں کی سِل پر بیٹھ کر کہا، "دیکھ رکھے پہلوان، کیا سے کیا ہو گیا ہے! بھرا پُرا گھر چھوڑ کر گیا تھا اور آج یہاں مٹی دیکھنے آیا ہوں۔ بسے ہوے گھر کی یہی نشانی رہ گئی ہے۔ تو سچ پوچھے رکھے، تو میرا یہ مٹی بھی چھوڑ کر جانے کو جی نہیں کرتا!" اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

پہلوان نے اپنی پھیلی ہوئی ٹانگیں سمیٹ لیں اور انگوچھے کو کنویں کی منڈیر سے اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ لچھے نے چلم اُس کی طرف بڑھا دی اور وہ کش لینے لگا۔

"تُو بتا رکھے، یہ سب ہوا کس طرح؟" غنی آنسو روکتا ہوا بڑے اصرار کے ساتھ بولا۔ "تم لوگ اُس کے پاس تھے، سب میں بھائیوں کی سی محبت تھی۔ اگر وہ چاہتا تو تم میں سے کسی کے گھر میں نہیں چھپ سکتا تھا؟ اُسے اتنی بھی سمجھ نہ آئی؟"

"ایسا ہی ہے،" رکھے کو خود لگا کہ اس کی آواز میں کچھ غیر فطری سی گونج ہے۔ اس کے ہونٹ گاڑھی رال سے چپک گئے تھے۔ اس کی مونچھوں کے نیچے سے پسینا اس کے ہونٹوں پر آ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر کسی چیز کا دباو پڑ رہا تھا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی سہارا چاہ رہی تھی۔

"پاکستان کا کیا حال ہے؟" اس نے ویسے ہی لہجے میں پوچھا۔ اس کے گلے کی نسوں میں تناو آ گیا تھا۔ اس نے انگوچھے سے بغلوں کا پسینا پونچھا اور گلے کا جھاگ منہ میں کھینچ کر باہر تھوک دیا۔

"میں کیا حال بتاؤں رکھے!" غنی دونوں ہاتھوں سے چھڑی پر زور دے کر جھکتے ہوے بولا۔ "میرا حال پوچھے تو وہ میرا خدا ہی جانتا ہے۔ میرا چراغ ساتھ ہوتا تو اَور بات تھی۔۔۔ رکھے، میں نے اُسے کتنا سمجھایا تھا کہ میرے ساتھ چلا چل۔ مگر وہ اڑا رہا کہ نیا مکان چھوڑ کر کیسے جاؤں، یہاں اپنی گلی ہے، کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بھولے کبوتر نے یہ نہیں سوچا کہ گلی میں خطرہ نہ سہی، باہر سے تو خطرہ آ سکتا ہے۔ مکان کی رکھوالی کے لیے چاروں جانوں نے جان دے دی! رکھے، اُسے تیرا بہت بھروسا تھا۔ کہتا تھا رکھے کے رہتے کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مگر جب آنی آئی تو رکھے کے روکے بھی نہ رک سکی۔"

Scanned with CamScanner

رکھے نے سیدھا ہونے کی کوشش کی، کیوں کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں درد کر رہی تھی۔ اُسے اپنی کمر اور جانگھوں کے جوڑ پر سخت دباو محسوس ہو رہا تھا۔ پیٹ کی انتڑیوں کے پاس جیسے کوئی چیز اس کی سانس کو جکڑ رہی تھی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا تھا اور پیروں کے تلووں میں چنچناہٹ ہو رہی تھی۔ بیچ بیچ میں نیلی پھلجھڑیاں سی اوپر سے اُترتیں اور اس کی آنکھوں کے سامنے تیرتی ہوئی نکل جاتیں۔ اُسے اپنی زبان اور ہونٹوں کے بیچ کا فاصلہ کچھ زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے انگوچھے سے ہونٹوں کے کونوں کو صاف کیا اور اُس کے منہ سے نکلا، "ہے پربھو سچیا، تو ہی ہے، تُو ہی ہے، تو ہی ہے!"

غنی نے محسوس کیا کہ پہلوان کے ہونٹ سُوکھ رہے ہیں اور اس کی آنکھوں کے ارد گرد دائرے گہرے ہو گئے ہیں، تو وہ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، "جی ہلکا نہ کر رکھیا! جو ہونی تھی سو ہو گئی۔ اُسے کوئی لوٹا تھوڑا ہی سکتا ہے! خدا نیک کی نیکی رکھے اور بد کی بدی معاف کرے۔ میرے لیے چراغ نہیں تو تم لوگ تو ہو۔ مجھے آکر اتنی ہی تسلی ہوئی کہ کہ اُس زمانے کی کوئی تو یادگار ہے۔ میں نے تم کو دیکھ لیا تو چراغ کو دیکھ لیا۔ اللہ تم لوگوں کو صحت مند رکھے۔ جیتے رہو اور خوشیاں دیکھو!" اور غنی چھڑی پر دباو دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے ہوئے اُس نے پھر کہا، "رکھے پہلوان، یاد رکھنا۔"

رکھے کے گلے میں سے ہامی بھرنے کی مدھم سی آواز نکلی۔ انگوچھا بیچ میں لیے ہوئے اُس کے دونوں ہاتھ جُڑ گئے۔ غنی گلی کے ماحول کو حسرت بھری نظر سے دیکھتا ہوا دھیرے دھیرے گلی سے باہر چلا گیا۔

اوپر کھڑکیوں میں تھوڑی دیر چہ میگوئیاں چلتی رہیں کہ منوری نے گلی کے باہر نکل کر ضرور غنی کو سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ غنی کے سامنے رکھے کا تالو کس طرح خشک ہو گیا تھا! رکھا اب کس منہ سے لوگوں کو ملبے پر گائے باندھنے سے روکے گا؟ بے چاری زبیدہ! کتنی اچھی تھی، کبھی کسی سے مندا نہیں بولی۔ رکھے مردود کا گھر نہ گھاٹ، اسے کس ماں بہن کا لحاظ تھا!

اور تھوڑی ہی دیر میں عورتیں گھروں سے گلی میں اُتر آئیں۔ بچے گلی میں گلی ڈنڈا کھیلنے لگے اور دو بارہ تیرہ برس کی لڑکیاں کسی بات پر گتھم گتھا ہو گئیں۔

رکھا گھری شام تک کنویں پر بیٹھا کھنکھارتا اور چلم پھونکتا رہا۔ کئی لوگوں نے یہاں سے گزرتے ہوئے اُس سے پوچھا، "رکھے شاہ، سنا ہے آج غنی پاکستان سے آیا تھا؟"

"ہاں، آیا تھا،" رکھے نے ہر بار ایک ہی جواب دیا۔

"پھر؟"

"پھر کچھ نہیں۔ چلا گیا۔"

رات ہونے پر رکھا روز کی طرح گلی کے باہر بائیں ہاتھ کی دکان کے تختے پر آ بیٹھا۔ روز اکثر وہ راستے سے گزرنے والے جان پہچان کے لوگوں کو آواز دے کر بُلا لیتا اور انھیں سٹے کے گُر اور صحت کے نسخے بتایا کرتا تھا۔ مگر اُس دن وہ لچھے کو اپنی وشنو دیوی کی اُس یاترا کی روداد سناتا رہا جو اُس نے پندرہ سال پہلے کی تھی۔ لچھے کو وداع کر کے وہ گلی میں آیا تو ملبے کے پاس لوکو پنڈت کی بھینس کو کھڑا دیکھ کر روز کی

عادت کے مطابق اُسے دھکے دے دے کر ہٹانے لگا: تت، تت، تت۔۔۔

بھینس کو ہٹا کر وہ ستانے کے لیے ملبے کی چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔ گلی اس سے بالکل سنسان تھی۔ کمیٹی کی بتی نہ ہونے سے وہاں شام ہی سے اندھیرا ہو جاتا تھا۔ ملبے کے نیچے نالی کا پانی ہلکی آواز کرتا ہوا بہہ رہا تھا۔ رات کی خاموشی کے ساتھ ملی ہوئی کئی طرح کی ہلکی ہلکی آوازیں ملبے کی مٹی میں سے نکل رہی تھیں: چیو چیو چیو۔۔۔ چک چک چک۔۔۔ چررر چررر۔۔۔ ری ری ری ری۔۔۔ چررر۔۔۔ ایک بھٹکا ہوا کوّا نہ جانے کہاں سے اُڑ کر لکڑی کی چوکھٹ پر آ بیٹھا۔ اس سے لکڑی کے ریشے اِدھر اُدھر چھترا گئے۔ کوّے کے وہاں بیٹھتے بیٹھتے ملبے کے ایک کونے میں لیٹا ہوا کتا غرّا کر اُٹھا اور زور زور سے بھونکنے لگا: ووووو! کوّا کچھ دیر سہما ہوا سا چوکھٹ پر بیٹھا رہا، پھر پنکھ پھڑپھڑاتا ہوا اُڑ کر کنویں کے چبوترے پر چلا گیا۔ کوّے کے اُڑ جانے پر کتا اور نیچے اُتر آیا اور پہلوان کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگا۔ پہلوان اُسے ہٹانے کے لیے بھاری آواز میں بولا، "دُر دُر دُر۔۔۔ دُرے!"

مگر کتا اور پاس آ کر بھونکنے لگا: ووووووووووو!

"ہٹ ہٹ، دُر دُر دُررر دُرے!"

ووووووووووو!

پہلوان نے ایک ڈھیلا اٹھا کر کتے کی طرف پھینکا۔ کتا تھوڑا پیچھے ہٹ گیا، پر اُس کا بھونکنا بند نہیں ہوا۔ پہلوان منہ ہی منہ میں کتے کو ماں کی گالی دے کر وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا اور دھیرے دھیرے جا کر کنویں کی سِل پر لیٹ گیا۔ پہلوان کے وہاں سے ہٹنے پر کتا گلی میں نکل آیا اور کنویں کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگا۔ کافی دیر بھونک کر جب گلی میں سے کوئی جاندار چلتا پھرتا دکھائی نہ دیا تو وہ ایک بار کان جھٹک کر ملبے پر لوٹ آیا اور وہاں کونے میں بیٹھ کر غرّانے لگا۔

**

بھیشم ساہنی

ہندی سے ترجمہ: عبدالعظیم سومرو

وانگ چُو

تبھی دور سے وانگ چُو آتا دکھائی دیا۔

ندی کے کنارے، لال منڈھی کی سڑک پر دھیرے دھیرے ڈولتا سا چلا آ رہا تھا۔ دھوسر (زرد) رنگ کا چوغہ پہنے تھا اور دور سے لگتا تھا کہ بودھ بھکشوؤں ہی کی طرح اُس کا بھی سر گھٹا ہوا ہے۔ پیچھے شنکر آچاریہ کی اونچی پہاڑی تھی اور اوپر صاف نیلا آسمان۔ سڑک کی دونوں جانب اونچے اونچے سفیدے کے پیڑوں کی قطاریں۔ لمحے بھر کے لیے مجھے لگا جیسے وانگ چُو تاریخ کے صفحات میں سے نکل کر آ گیا ہے۔ پراچین کال میں اسی طرح دیس بدیس سے آنے والے چیوردھاری بھکشو پہاڑوں اور گھاٹیوں کو پار کر کے بھارت میں آیا کرتے ہوں گے۔ ماضی کے ایسے ہی رومانی دھند لکے میں مجھے وانگ چُو بھی چلتا ہوا نظر آیا۔ جب سے سری نگر میں آیا تھا، بودھ وہاروں (مندروں) کے کھنڈروں اور سنگرہالیوں (عجائب خانوں) میں گھوم رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ لال منڈھی کے سنگرہالے سے نکل کر آ رہا تھا جہاں بودھ زمانے کے کئی آثار رکھے ہوئے ہیں۔ اس کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا کہ وہ سچ مچ حال سے کٹ کر ماضی کے ہی کسی زمانے میں چل پھر رہا تھا۔

"بُدھستو سے ملاقات ہو گئی؟" پاس آنے پر میں نے چٹکی لی۔

وہ مسکرا دیا، ہلکی ٹیڑھی سی مسکان جسے میری خالہ زاد بہن ڈیڑھ دانت کی مسکان کہا کرتی تھی، کیوں کہ مسکراتے وقت وانگ چُو کا اوپر کا ہونٹ صرف ایک جانب سے تھوڑا سا اوپر کو اُٹھتا تھا۔

"سنگرہالے کے باہر بہت سی مورتیاں رکھی ہیں۔ میں وہی دیکھتا رہا،" اس نے دھیمے سے کہا۔ پھر اچانک جذباتی ہو کر بولا، "ایک مورتی کے صرف پیر ہی بچے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

میں نے سوچا آگے کچھ کہے گا، مگر وہ جذبے سے اتنا مغلوب ہو گیا تھا کہ اس کا گلا رُندھ گیا اور اس کے لیے بولنا ناممکن ہو گیا۔

ہم ایک ساتھ گھر کی طرف لوٹنے لگے۔

"مہاپران (بُدھ) کے بھی پیر ہی پہلے دکھائے جاتے تھے،" اس نے کانپتی سی آواز میں کہا اور اپنا ہاتھ میری کہنی پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ کی ہلکی سی کپکپاہٹ دھڑکتے دل کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

"شروع میں مہاپران کی مورتیاں نہیں بنائی جاتی تھیں نا۔ تم تو جانتے ہی ہو، پہلے اِسٹوپ کے نیچے صرف پیر ہی دکھائے جاتے تھے۔ مورتیاں تو بعد میں بنائی جانے لگی تھیں۔"

ظاہر ہے بُدھِستّو کے پیر دیکھ کر اُسے مہاپران کے پیر یاد آ گئے تھے اور وہ جذباتی ہو اٹھا تھا۔ کچھ پتا نہیں چلتا تھا کون سی بات کس وقت وانگ چُو کو پُلکانے (جذباتی کرنے) لگے اور کس وقت وہ خوشی سے کھِل اٹھے۔

"تم نے بہت دیر کر دی۔ سب لوگ تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ میں چناروں کے نیچے بھی تمھیں دیکھ آیا،" میں نے کہا۔

"میں سنگرہالے میں تھا۔۔۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، پر دو بجے تک ہمیں ہباکدل پہنچ جانا چاہیے ورنہ جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

اُس نے چھوٹے چھوٹے جھٹکوں کے ساتھ دو تین بار سر ہلایا اور قدم بڑھا دیے۔

وانگ چُو بھارت میں متوالا بنا گھوم رہا تھا۔ وہ مہاپران کے جنم استھان لُمبینی کی یاترا ننگے پاؤں کر چکا تھا، سارا راستا ہاتھ جوڑے ہوئے۔ جس جس سمت میں مہاپران کے قدم اٹھے تھے، وانگ چُو سحرزدہ سا اسی اسی سمت میں گھوم آیا تھا۔ سارناتھ میں، جہاں مہاپران نے اپنا پہلا پروچن (وعظ) کیا تھا اور دو مرگ شاوک ہیبت زدہ سے جھاڑیوں میں سے نکل کر اُن کی طرف دیکھتے رہ گئے تھے، وانگ چُو ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے گھنٹوں محو ہو کر بیٹھا رہا تھا، یہاں تک کہ اُس کے کہنے کے مطابق اس کے ذہن میں لفظ صاف گونجنے لگے تھے اور اسے لگا تھا جیسے وہ مہاپران کا پہلا پروچن سن رہا ہے۔ وہ بھکتی کے اس تصور میں اتنا گہرا ڈوب گیا تھا کہ سارناتھ ہی میں رہنے لگا تھا۔ گنگا کی دھارا کو وہ دسیوں صدیوں کے دھندلکے میں بہتے مقدس پانیوں کے روپ میں دیکھتا۔ جب سے وہ سری نگر میں آیا تھا، برف سے ڈھکے پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اکثر مجھ سے کہتا، "وہ رستا لہاسا کو جاتا ہے نا؟ اسی رستے سے بودھ گرنتھ تبت میں بھیجے گئے تھے۔" وہ اس پہاڑی سلسلے کو بھی متبرک مانتا تھا کیوں کہ اس پر بچھی پگڈنڈیوں کے راستے بودھ بھکشو تبت کی طرف گئے تھے۔

وانگ چُو کچھ برس پہلے بودھ پروفیسر تان شان کے ساتھ بھارت آیا تھا۔ کچھ دنوں تک تو وہ اُنھیں کے ساتھ رہا اور ہندی اور انگریزی زبانیں سیکھتا رہا، پھر پروفیسر شان چین لوٹ گئے اور وہ یہیں ٹکا رہا اور

کسی بودھ سوسائٹی سے وظیفہ حاصل کر کے سارناتھ میں آ کر بیٹھ گیا- جذباتی، شاعرانہ مزاج کا شخص، جو قدیم زمانوں کے سحرانگیز ماحول میں سانس لیتے رہنا چاہتا تھا- وہ یہاں حقائق کی کھوج کرنے نہیں آیا تھا- وہ تو بدھستو کی مورتیوں کو دیکھ کر مسرّت حاصل کرنے آیا تھا- مہینے بھر سے سنگرہالیوں کے چکر کاٹ رہا تھا، لیکن اس نے کبھی نہیں بتایا کہ بودھ دھرم کی کون سی تعلیم اُسے سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے- نہ تو وہ کسی حقیقت کو دریافت کر کے مسرت سے کھِل اٹھتا نہ اسے کوئی شک پریشان کرتا- وہ بھکت زیادہ اور حق جُو کم تھا-

مجھے یاد نہیں کہ اُس نے ہمارے ساتھ کبھی کھُل کر بات کی ہو یا کسی موضوع پر اپنی رائے پیش کی ہو- اُن دنوں میرے اور میرے دوستوں کے بیچ گھنٹوں بحثیں چلا کرتیں، کبھی ملک کی سیاست کے بارے میں، کبھی مذہب کے بارے میں، لیکن وانگ چُو ان میں کبھی حصّہ نہیں لیتا تھا- وہ سارا وقت دھیمے دھیمے مسکراتا رہتا اور کمرے کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھا رہتا- اُن دنوں ملک میں ولولوں کا سیلاب سا اٹھ رہا تھا- آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اور ہمارے درمیان اسی کا ذکر رہتا- کانگریس کون سی پالیسی اپنائے گی، تحریک کون سا رخ لے گی- عملی طور پر تو ہم لوگ کچھ کرتے کراتے نہیں تھے، لیکن جذبات کی سطح پر اس سے بہت زیادہ وابستہ تھے- اس پر وانگ چُو کی بے نیازی کبھی ہمیں اکھرنے لگتی تو کبھی اچنبھے میں ڈال دیتی- وہ ہمارے ہی ملک کے معاملات میں نہیں، اپنے ملک کے معاملات میں بھی کوئی خاص دل چسپی نہیں لیتا تھا- اس کے اپنے ملک کے بارے میں بھی پوچھو تو مسکراتا سر ہلاتا رہتا تھا-

کچھ دنوں سے سری نگر کی ہوا بھی بدلی ہوئی تھی- کچھ مہینے پہلے یہاں گولی چلی تھی- کشمیر کے لوگ مہاراجا کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے- اور اب کچھ دنوں سے شہر میں ایک نیا جوش و خروش پایا جاتا تھا- نہرو جی سری نگر آنے والے تھے اور اُن کا استقبال کرنے کے لیے شہر کو دلھن کی طرح سجایا جا رہا تھا- آج دوپہر کو نہرو جی سری نگر پہنچ رہے تھے- ندی کے کنارے کشتیوں کے جلوس کی شکل میں اُنھیں لانے کا پروگرام تھا اور اسی وجہ سے میں وانگ چُو کو کھوجتا ہوا اس طرف آ نکلا تھا-

ہم گھر کی طرف بڑھے جا رہے تھے کہ اچانک وانگ چُو ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا-

"کیا میرا جانا بہت ضروری ہے؟ جیسا تم کہو---"

مجھے دھکا سا لگا- ایسے وقت میں جب لاکھوں لوگ نہرو جی کے استقبال کے لیے اکٹھے ہو رہے تھے، وانگ چُو کا یہ کہنا کہ اگر وہ ساتھ میں نہ جائے تو کیسا رہے، مجھے سچ مچ بُرا لگا- لیکن پھر خود ہی کچھ سوچ کر اُس نے اپنی تجویز کو دُہرایا نہیں اور ہم گھر کی طرف ساتھ ساتھ جانے لگے-

کچھ دیر بعد ہم لوگ بنا کدل کے پل کے قریب لاکھوں کی بھیڑ میں کھڑے تھے- میں، وانگ چُو اور میرے دو تین دوست- چاروں طرف جہاں تک نظر جاتی لوگ ہی لوگ تھے، مکانوں کی چھتوں پر، ندی کے ڈھلواں کناروں پر- میں بار بار کنکھیوں سے وانگ چُو کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کا کیا ردِ عمل ہے، کہ ہمارے دل میں اُٹھنے والے ولولوں کا اُس پر کیا اثر ہوا ہے- یوں بھی یہ میری عادت سی بن گئی

Scanned with CamScanner

ہے کہ جب بھی کوئی بدیسی ساتھ میں ہو، میں اس کے چہرے کا تاثر پڑھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں کہ ہمارے ریت رواج، ہمارے رہنے سہنے کے بارے میں اس کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ وانگ چُو آدھ مُندی آنکھوں سے سامنے کا منظر دیکھے جا رہا تھا۔ جس وقت نہروجی کی ناؤ سامنے آئی تو جیسے مکانوں کی چھتیں بھی ہل اٹھیں۔ راج ہنس کی شکل کی سفید کشتی میں نہروجی مقامی لیڈروں کے ساتھ کھڑے ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کے استقبال کا جواب دے رہے تھے۔ ہوا میں پھول ہی پھول بکھر گئے۔ میں نے پلٹ کر وانگ چُو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے کی طرح بے حس سا سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔

"آپ کو نہروجی کیسے لگے؟" میرے ایک ساتھی نے وانگ چُو سے پوچھا۔

وانگ چُو نے اپنی ٹیڑھی سی آنکھیں اٹھا کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر اپنی ڈیڑھ دانت کی مسکان کے ساتھ کہا، "اچا، بھوت اچا۔"

وانگ چُو معمولی سی ہندی اور انگریزی جانتا تھا۔ اگر تیز بولیں تو اس کے پلّے کچھ نہیں پڑتا تھا۔

نہروجی کی کشتی دور جا چکی تھی لیکن کشتیوں کا جلوس اب بھی چلتا جا رہا تھا جب وانگ چُو اچانک مجھ سے بولا، "میں تھوڑی دیر کے لیے سنگرہالے جانا چاہتا ہوں۔ اِدھر سے راستا جاتا ہے، میں خود ہی چلا جاؤں گا۔" اور وہ اَور کچھ کہے بغیر ایک بار آدھ مُندی آنکھوں سے مسکرایا اور ہلکے سے ہاتھ ہلا کر مڑ گیا۔

ہم سب حیران رہ گئے۔ اسے سچ مچ جلوس سے دل چسپی نہیں رہی ہو گی جو اتنی جلدی سنگرہالے کے طرف اکیلا چل دیا۔

"یار، کس بُودم کو اٹھا لائے ہو؟ یہ کیا چیز ہے؟ کہاں سے پکڑ لائے ہو اسے؟" میرے ایک دوست نے کہا۔

"باہر کا رہنے والا ہے، اسے ہماری باتوں میں کیا دل چسپی ہو سکتی ہے،" میں نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔

"واہ، ملک میں اتنا کچھ ہو رہا ہو اور اسے دل چسپی ہی نہ ہو!"

وانگ چُو جب تک دور جا چکا تھا اور بھیڑ میں سے نکل کر پیڑوں کی قطار کے نیچے آنکھوں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔

"مگر یہ ہے کون؟" دوسرا دوست بولا۔ "نہ یہ بولتا ہے نہ چمکتا ہے۔ کچھ پتا ہی نہیں چلتا ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے۔ سارا وقت ایک کونے میں دبک کر بیٹھا رہتا ہے۔"

"نہیں نہیں، بڑا سمجھ دار آدمی ہے۔ پچھلے پانچ سال سے یہاں پر رہ رہا ہے۔ بڑا پڑھا لکھا آدمی ہے۔ بودھ دھرم کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے،" میں نے پھر اس کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

میری نظر میں اس بات کی بڑی اہمیت تھی کہ وہ بودھ کتابیں پڑھتا ہے اور انہیں پڑھنے کے لیے اتنی دور سے آیا ہے۔

"ارے بھاڑ میں جائے ایسی پڑھائی! واہ جی، جلوس کو چھوڑ کر میوزیم کی طرف چل دیا!"

Scanned with CamScanner

"سیدھی سی بات ہے یار!" میں نے جوڑا۔ "اسے یہاں بھارت کا حال کھینچ کر نہیں لایا، بھارت کا ماضی لایا ہے۔ ہیون سانگ بھی تو یہاں بودھ کتابیں پڑھنے ہی آیا تھا۔ یہ بھی عالم آدمی ہے۔ بودھ مت ہی سے اس کو دل چسپی ہے۔"

گھر لوٹتے ہوئے ہم لوگ سارا راستا وانگ چُو ہی کی باتیں کرتے رہے۔ اجے کی رائے تھی کہ اگر وہ پانچ سال بھارت میں کاٹ گیا ہے تو اب زندگی بھر یہیں پر رہے گا۔

"اب آ گیا ہے تو لوٹ کر نہیں جائے گا۔ بھارت میں ایک بار پردیسی آ جائے تو لوٹنے کا نام نہیں لیتا۔"

"بھارت دیش وہ دلدل ہے جس میں ایک بار باہر کے آدمی کا پاؤں پڑ جائے تو وہ دھنستا ہی چلا جاتا ہے، نکلنا چاہے بھی تو نہیں نکل سکتا،" دلیپ نے مذاق میں کہا۔ "نہ جانے کون سے کنول پھول توڑنے کے لیے اس دلدل میں گھسا ہے!"

"ہمارا دیس ہم ہندوستانیوں کو پسند نہیں، باہر کے لوگوں کو تو بہت پسند ہے،" میں نے کہا۔

"پسند کیوں نہ ہو گا۔ یہاں تھوڑے میں گزر ہو جاتی ہے، سارا وقت دھوپ کھلی رہتی ہے، پھر باہر کے آدمی کو لوگ پریشان نہیں کرتے، جہاں بیٹھا ہے وہیں بیٹھا رہنے دیتے ہیں۔ اس پر انھیں تم جیسے احمق بھی مل جاتے ہیں جو اُن کے گن گاتے اور آؤ بھگت کرتے رہتے ہیں! تمھارا وانگ چُو بھی یہیں پر مرے گا۔"

ہمارے یہاں اُن دنوں میری چھوٹی خالہ زاد بہن ٹھہری ہوئی تھی، وہی جو وانگ چُو کی مسکان کو ڈیڑھ دانت کی مسکان کہا کرتی تھی۔ چلبلی سی لڑکی، بات بات پر ٹھٹھول کرتی رہتی تھی۔ میں نے دو ایک بار وانگ چُو کو کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا، لیکن کوئی خاص دھیان نہیں دیا کیوں کہ وہ سب کو کنکھیوں ہی سے دیکھتا تھا۔ پر اُس شام نیلم میرے پاس آئی اور بولی، "آپ کے دوست نے مجھے تحفہ دیا ہے۔ پریم اُپہار!"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ "کیا دیا ہے؟"

"جھُومروں کی جوڑی!"

اور اس نے دونوں مٹھیاں کھول دیں جن میں چاندی کے کشمیری چلن کے دو سفید جھُومر چمک رہے تھے، اور پھر دونوں جھومر اپنے کانوں کے پاس لے جا کر بولی، "کیسے لگتے ہیں؟"

میں ہکا بکا سا نیلم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اس کے اپنے کان کیسے بھُورے بھُورے ہیں!" نیلم نے ہنس کر کہا۔

"کس کے؟"

"میرے اس پریمی کے!"

Scanned with CamScanner

"تمھیں اس کے بھورے کان پسند ہیں؟"

"بہت! جب شرماتا ہے تو براؤن ہو جاتے ہیں، گہرے براؤن!" اور نیم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

لڑکیاں کیسے اس آدمی کے پریم کا مذاق اڑا سکتی ہیں جو انھیں پسند نہ ہو! یا کہیں نیلم مجھے بنا تو نہیں رہی ہے؟

پر میں اس اطلاع سے زیادہ پریشان نہیں ہوا تھا۔ نیلم لاہور میں پڑھتی تھی اور وانگ چُو سارناتھ میں رہتا تھا، اور اب ہفتے بھر میں سری نگر سے واپس جانے والا تھا۔ اس پریم کی کونپل اپنے آپ ہی جل جائے گی۔

"نیلم، یہ جھومر تو تم نے اُس سے لے لیے ہیں، مگر اس طرح کی دوستی آخر میں اس کے لیے تکلیف دہ ہو گی۔ بنے بنائے گی کچھ نہیں۔"

"واہ بھیا، تم بھی کیسے دقیانوسی ہو! میں نے بھی چمڑے کا ایک رائٹنگ پیڈ اُسے تحفے میں دیا ہے۔ میرے پاس پہلے سے پڑا تھا، میں نے اُسے دے دیا۔ جب لوٹے گا تو اسے پریم پتر لکھنے میں آسانی ہو گی!"

"وہ کیا کہتا تھا؟"

کہتا کیا تھا، سارا وقت اس کے ہاتھ کانپتے رہے اور چہرہ کبھی لال ہوتا رہا کبھی پیلا۔ کہتا تھا مجھے خط لکھنا، میرے خطوں کا جواب دینا۔ اور کیا کہے گا بے چارہ، بھورے کانوں والا!"

میں نے غور سے نیلم کی طرف دیکھا، پر اُس کی آنکھوں میں مجھے ہنسی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ لڑکیاں دل کی بات چھپانا خوب جانتی ہیں۔ مجھے لگا نیلم اُسے بڑھاوا دے رہی ہے۔ اس کے لیے یہ کھیل تھا لیکن وانگ چُو ضرور اس کا دوسرا ہی مطلب نکالے گا۔

اس کے بعد مجھے لگا کہ وانگ چُو اپنا سکون کھو رہا ہے۔ اس رات میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا باہر میدان میں چناروں کی قطار کی طرف دیکھ رہا تھا کہ چاندنی میں کچھ دوری پر پیڑوں کے نیچے مجھے وانگ چُو ٹہلتا دکھائی دیا۔ وہ اکثر رات کو دیر تک پیڑوں کے نیچے ٹہلتا رہتا تھا۔ مگر آج وہ اکیلا نہیں تھا۔ نیلم بھی اُس کے ساتھ ٹھمک ٹھمک چلی جا رہی تھی۔

مجھے نیلم پر غصہ آیا۔ لڑکیاں کتنی ظالم ہوتی ہیں! یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کھلواڑ سے وانگ چُو کی بے چینی بڑھے گی، وہ اسے بڑھاوا دیے جا رہی تھی۔

دوسرے روز کھانے کی میز پر نیلم پھر اُس کے ساتھ ٹھٹھول کرنے لگی۔ کچن میں سے ایک چوڑا سا المونیم کا ڈبا اٹھا لائی۔ اُس کا چہرہ تپے تانبے جیسا لال ہو رہا تھا۔

"آپ کے لیے روٹیاں اور آلو بنا لائی ہوں۔ آم کے اچار کی چٹنی بھی رکھی ہے۔ آپ جانتے ہیں چٹنی کسے کہتے ہیں؟ ایک بار کہو تو چٹنی! کہو وانگ چُوجی، چٹنی!"

اس نے نیلم کی طرف کھوئی کھوئی آنکھوں سے دیکھا اور بولا، "بانک!" ہم سب کھلکھلا کر ہنس

پڑے۔

"بانگ نہیں، پھانک!"

"بانک!" پھر ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔

نیلم نے ڈبّا کھولا۔ اس میں سے آم کے اچار کا ٹکڑا نکال کر اسے دکھاتے ہوئے بولی، "یہ ہے پھانک۔ پھانک اسے کہتے ہیں!" اور اسے وانگ چو کی ناک کے پاس لے جا کر بولی، "اسے سونگھنے پر منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ آیا منہ میں پانی۔ اب کہو پھانک!"

"نیلم، کیا فضول باتیں کر رہی ہو! بیٹھو آرام سے!" میں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

نیلم بیٹھ گئی مگر اس کی حرکتیں بند نہیں ہوئیں۔ بڑی اپنائیت سے وانگ چُو سے کہنے لگی، "بنارس جا کر ہمیں بھول نہیں جائیے گا۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔ اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو تکلف نہ کیجیے گا۔"

وانگ چُو لفظوں کا مطلب تو سمجھ لیتا تھا لیکن ان کے پیچھے طنز کی لہر کو نہیں پکڑ پاتا تھا۔ وہ بہت مشکل میں محسوس ہوتا تھا۔

"بھیڑ کی کھال کی ضرورت ہو یا کوئی نمدہ، یا اخروٹ۔۔۔"

"نیلم!"

"کیوں بھیا، بھیڑ کی کھال پر بیٹھ کر گرنتھ پڑھیں گے۔"

وانگ چُو کے کان لال ہونے لگے۔ شاید پہلی بار اُسے احساس ہونے لگا تھا کہ نیلم ٹھٹھول کر رہی ہے۔ اس کے کان سچ مچ بھورے رنگ کے تھے جن کا نیلم مذاق اُڑایا کرتی تھی۔

"نیلم جی، آپ لوگوں نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔ میں بہت شکر گزار ہوں۔"

ہم سب چپ ہو گئے۔ نیلم بھی جھینپ سی گئی۔ وانگ چُو نے ضرور اس کے مذاق کو سمجھ لیا ہو گا۔ اس کے دل کو ضرور ٹھیس لگی ہو گی۔ پر میرے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہے کہ نیلم کے بارے میں اس کے جذبات بدلیں، ورنہ اُسی کو سب سے زیادہ پریشانی ہو گی۔

شاید وانگ چُو اپنی صورت حال کو جانتے سمجھتے ہوئے بھی ایک فطری کشش کے اثر میں آ گیا تھا۔ جذباتی انسان کا اپنے پر کوئی قابو نہیں ہوتا۔ وہ پچھاڑ کھا کر گرتا ہے تبھی اپنی بھول کو سمجھ پاتا ہے۔

ہفتے کے آخری دنوں میں وہ روز کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آنے لگا۔ ایک بار میرے لیے بھی ایک چوغہ لے آیا اور بچوں کی طرح ضد کرنے لگا کہ میں اور وہ اپنا اپنا چوغہ پہن کر ایک ساتھ گھومنے جائیں۔ سنگر بالے میں وہ اب بھی جاتا تھا۔ دو ایک بار نیلم کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا اور لوٹنے پر ساری شام نیلم بُدھستو کا مذاق اڑاتی رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں نیلم کے اس برتاو کا خیر مقدم کرتا رہا، کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وانگ چُو کا کوئی جذبہ ہمارے گھر میں جڑ جما پائے۔ ہفتہ گزر گیا اور وانگ چُو سارناتھ واپس لوٹ گیا۔

Scanned with CamScanner

وانگ چُو کے چلے جانے کے بعد اُس کے ساتھ میرا رابطہ ویسا ہی رہا جیسا عام طور پر جان پہچان کے کسی شخص کے ساتھ رہتا ہے۔ کبھی خط آجاتا، کبھی کسی آنے جانے والے سے اس کی خبر مل جاتی۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو برسوں تک رسمی تعارف کی دہلیز پر ہی ڈگمگاتے رہتے ہیں، نہ دہلیز لانگھ کر اندر آتے ہیں اور نہ پیچھے ہٹ کر آنکھ سے اوجھل ہوتے ہیں۔ مجھے بس اتنا علم رہا کہ اس کے بندھے ٹکے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کچھ عرصے تک مجھے تجسس سا رہا کہ نیلم اور وانگ چو کے بیچ کی بات آگے بڑھی یا نہیں، لیکن لگا کہ وہ پریم بھی وانگ چُو کی زندگی پر حاوی نہیں ہو پایا۔

سال بیتتے گئے۔ ہمارے ملک میں اُن دنوں بہت واقعات پیش آرہے تھے۔ آئے دن ستیہ گرہ ہوتا، بنگال میں قحط پڑا، "ہندوستان چھوڑدو" کی تحریک چلی، سڑکوں پر گولیاں چلیں، بمبئی میں جہازیوں کی بغاوت ہوئی، ملک میں خوں ریزی ہوئی، پھر ملک کا بٹوارا ہوا، اور اس تمام وقت وانگ چُو سارناتھ ہی میں رہا۔ وہ اپنے ہی آپ میں مگن معلوم ہوتا تھا۔ کبھی لکھتا کہ تنترک فلسفے کا مطالعہ کر رہا ہے، کبھی پتا چلتا کہ کوئی کتاب لکھنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔

اس کے بعد میری ملاقات وانگ چُو سے دلّی میں ہوئی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب چینی وزیرِاعظم چُواین لائی بھارت کے دورے پر آنے والے تھے۔ وانگ چُو اچانک سڑک پر مجھے مل گیا اور میں اُسے اپنے گھر لے آیا۔ مجھے اچھا لگا کہ چینی وزیرِاعظم کی آمد پر وہ سارناتھ سے دلّی چلا آیا ہے۔ پر جب اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے وظیفے کے سلسلے میں آیا ہے اور یہاں پہنچنے پر اسے چواین لائی کے دورے کی خبر ملی ہے تو مجھے اُس کے رویے پر تعجب ہوا۔ اُس کا سبھاو ویسے کا ویسا تھا۔ پہلے کی طرح ہولے ہولے اپنی ڈیڑھ دانت کی مسکان مسکراتا رہا۔ ویسی ہی بے نیازی اور اطمینان۔ اس دوران اُس نے کوئی کتاب یا مضمون وغیرہ بھی نہیں لکھے تھے۔ میرے پوچھنے پر اس نے اس کام میں کوئی خاص دل چسپی بھی ظاہر نہیں کی۔ تنترک فلسفے کی باتیں کرتے ہوئے بھی وہ بہت پُرجوش نہیں ہوا۔ دو ایک کتابوں کے بارے میں بتاتا رہا جن میں سے وہ کچھ نوٹس لیتا رہا تھا۔ اپنے کسی مضمون کا بھی ذکر نہیں کیا جس پر وہ اُن دنوں کام کر رہا ہو۔ نیلم کے ساتھ اُس کی خط و کتابت چلتی رہی تھی، اس نے بتایا۔ حالاں کہ نیلم کب کی بیاہی جا چکی تھی اور دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ہمارے بنیادی تصورات چاہے نہ بدلیں لیکن ان کی شدت میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اپنی تعلیم وغیرہ کا بھی اُس نے تذکرہ کیا؛ اُس کی شدت اور اشتیاق میں بھی ٹھہراو سا آگیا تھا۔ پہلے جیسا جذباتی ولولہ نہیں تھا۔ بُدھ مجسّموں کے پیروں پر اپنے پران نچھاور نہیں کرتا پھرتا تھا۔ لیکن اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ پہلے کی طرح تھوڑا کھاتا، تھوڑا پڑھتا، تھوڑا ٹہلتا اور تھوڑا سوتا تھا۔ اور دور لڑکپن کے جھٹ پٹے میں کسی جذباتی لمحے میں چُنی اپنی زندگی کی راہ پر کچھوے کی چال مزے سے چلتا آرہا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ہمارے درمیان بحث چھڑ گئی۔ "سماجی قوتوں کو سمجھے بغیر تم بودھ دھرم کو کیسے سمجھ پاؤ گے؟ ہر علم کا میدان ایک دوسرے سے جُڑا ہوا ہے، زندگی سے جُڑا ہوا ہے۔ کوئی چیز

Scanned with CamScanner

زندگی سے الگ نہیں ہے۔ تم جیون سے الگ ہو کر دھرم کو بھی کیسے سمجھ سکتے ہو؟"

کبھی وہ مسکراتا کبھی سر ہلاتا، اور سارا وقت فلسفیوں کی طرح میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے کہے کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا، کہ میں چکنے گھڑے پر پانی اُنڈیلے جا رہا ہوں۔

"ہمارے ملک سے نہ سہی، اپنے ملک سے تو دل چسپی لو۔ اتنا تو جانو سمجھو کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔"

اس پر بھی وہ سر ہلاتا اور مسکراتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ ایک بھائی کو چھوڑ کر چین میں اُس کا کوئی نہیں ہے۔ ۱۹۲۹ میں وہاں کوئی سیاسی اُتھل پتھل ہوئی تھی: اس میں اُس کا گاؤں جلا ڈالا گیا تھا اور سب سگے رشتے دار مر گئے تھے یا بھاگ گئے تھے۔ لے دے کر ایک بھائی بچا تھا اور وہ پیکنگ کے قریب کسی گاؤں میں رہتا تھا۔ برسوں سے وانگ چُو کا رابطہ اُس کے ساتھ ٹوٹ چکا تھا۔ وانگ چُو پہلے اپنے گاؤں کے اسکول میں پڑھتا رہا تھا، بعد میں پیکنگ کے ایک کالج میں پڑھنے لگا۔ وہیں سے وہ پروفیسر شان کے ساتھ بھارت چلا آیا تھا۔

"سنو وانگ چُو، بھارت اور چین کے بیچ بند دروازے اب کھل رہے ہیں۔ اب دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات قائم ہو رہے ہیں اور اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی مطالعہ جو تم الگ تھلگ کرتے رہے ہو، اب اپنے ملک کے باعزت نمائندے کے طور پر کر سکتے ہو۔ تمھاری حکومت تمھارے وظیفے کا بندوبست کرے گی۔ اب تمھیں الگ تھلگ پڑے نہیں رہنا پڑے گا۔ تم پندرہ سال سے زیادہ عرصے سے بھارت میں رہ رہے ہو، انگریزی اور ہندی زبانیں جانتے ہو، بودھ گرنتھوں پر کام کرتے رہے ہو، تم دونوں ملکوں کے تہذیبی تعلقات میں بہت قیمتی کڑی بن سکتے ہو۔۔۔"

اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آئی۔ سچ مچ اُسے کچھ سہولتیں مل سکتی تھیں۔ کیوں نہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے! دونوں ملکوں کے درمیان پائی جانے والی یگانگت سے وہ بھی متاثر ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ کچھ ہی دنوں پہلے جب وہ وظیفے کی رقم وصول کرنے بنارس گیا تو راہ چلتے لوگ سڑکوں پر اُس سے گلے مل رہے تھے۔ میں نے اُسے مشورہ دیا کہ کچھ عرصے کے لیے ضرور اپنے ملک لوٹ کر جائے اور وہاں ہونے والی عظیم تبدیلیوں کو دیکھے اور سمجھے کہ سارناتھ میں الگ تھلگ بیٹھے رہنے سے اُسے کچھ حاصل نہیں ہو گا، وغیرہ وغیرہ۔

وہ سنتا رہا، سر ہلاتا اور مسکراتا رہا، لیکن مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ میری باتوں کا اُس پر کچھ اثر ہوا ہے یا نہیں۔

لگ بھگ چھ مہینے بعد اُس کا خط آیا کہ وہ چین جا رہا ہے۔ مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ اپنے ملک میں جائے گا تو دھوبی کے کتے والی اُس کی حالت بدلے گی، کہیں کا تو ہو کر رہے گا۔ اس کی زندگی میں نیا ولولہ پیدا ہو گا۔ اس نے لکھا کہ وہ اپنا ایک ٹرنک سارناتھ میں چھوڑے جا رہا ہے جس میں اُسکی کچھ کتابیں اور تحقیقی کاغذ وغیرہ رکھے ہیں، کہ برسوں تک بھارت میں رہ چکنے کے بعد وہ اپنے کو بھارت ہی کا باشندہ سمجھتا ہے، اور یہ کہ وہ جلد ہی لوٹ آئے گا اور اپنا مطالعہ پھر سے شروع کرے گا۔ میں دل ہی دل میں ہنس دیا،

Scanned with CamScanner

ایک بار اپنے ملک میں گیا تو لوٹ کر نہیں آنے کا۔

چین میں وہ لگ بھگ دو برس رہا۔ وہاں سے اس نے مجھے پیکنگ کے قدیم راج محل کا تصویری کارڈ بھیجا۔ دو ایک خط بھی لکھے مگر ان سے اس کے خیالات کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں ملی۔

اُن دنوں چین میں بھی بڑے ولولے اُٹھ رہے تھے، بڑا جوش تھا، اور اس جوش کی لپیٹ میں تقریباً سبھی لوگ تھے۔ زندگی نئی کروٹ لے رہی تھی۔ لوگ کام کرنے جاتے تو ٹولیاں بنا کر، گاتے ہوئے، لال جھنڈا ہاتھ میں اٹھائے ہوئے۔ وانگ چُو سڑک کے کنارے کھڑا اُنہیں دیکھتا رہ جاتا۔ اپنی شکی طبیعت کی وجہ سے وہ ٹولیوں کے ساتھ گاتے ہوئے جا تو نہیں سکتا تھا، لیکن انہیں جاتے دیکھ کر حیران سا کھڑا رہتا جیسے کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہو۔

اُسے اپنا بھائی تو نہیں ملا، لیکن ایک پرانا استاد، دور کی ایک خالہ اور دو ایک واقف کار ضرور مل گئے۔ وہ اپنے گاؤں گیا۔ گاؤں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اسٹیشن سے گھر کی طرف جاتے ہوئے اُس کا ایک ہم سفر اُسے بتانے لگا کہ وہاں، اُس پیڑ کے نیچے، زمیندار کے سب کاغذ، ساری دستاویزیں جلا ڈالی گئی تھیں اور زمیندار ہاتھ باندھے کھڑا رہا تھا۔

وانگ چُو نے بچپن میں زمیندار کا بڑا گھر دیکھا تھا، اس کی رنگین کھڑکیاں اُسے اب بھی یاد تھیں۔ اس نے دو ایک بار زمیندار کی بگھی کو بھی قصبے کی سڑک پر جاتے دیکھا تھا۔ اب وہ گھر گاؤں کا انتظامی مرکز بنا ہوا تھا۔ اَور بھی بہت کچھ بدل گیا تھا۔ مگر اُس کی حالت یہاں بھی ویسی ہی تھی جیسی بھارت میں رہی تھی۔ اُس کے دل میں اُمنگ نہیں اٹھتی تھی، دوسروں کی اُمنگیں اس کے دل پر سے پھسل پھسل جاتی تھیں۔ وہ یہاں بھی تماشائی ہی بنا گھومتا تھا۔ شروع شروع کے دنوں میں اُس کی آؤ بھگت بھی ہوئی۔ اُس کے پرانے اُستاد کی پہل قدمی پر اسے اسکول میں مدعو کیا گیا۔ بھارت چین تعلقات کی اہم کڑی کے طور پر اسے اعزاز بھی دیا گیا۔ وہاں وانگ چُو دیر تک لوگوں کو بھارت کے بارے میں بتاتا رہا۔ لوگوں نے طرح طرح کے سوال پوچھے، ریت رواج کے بارے میں، تیرتھوں میلوں کے بارے میں۔ وانگ چُو صرف اُنہیں سوالوں کا تسلی بخش جواب دے پاتا تھا جن کے بارے میں وہ اپنے تجربے سے کچھ جانتا تھا، لیکن بہت کچھ ایسا تھا جس کے بارے میں بھارت میں رہتے ہوئے بھی وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

کچھ دنوں بعد چین میں "بڑی چھلانگ" کی مہم زور پکڑنے لگی۔ اُس کے گاؤں میں بھی لوگ لوہا اکٹھا کر رہے تھے۔ ایک دن صبح اُسے بھی ردّی لوہا بٹورنے کے لیے ایک ٹولی کے ساتھ بھیج دیا گیا۔ دن بھر وہ لوگوں کے ساتھ رہا۔ ایک نیا جوش چاروں طرف لہریں لے رہا تھا۔ لوگ ایک ایک لوہے کا ٹکڑا بڑے فخر سے دکھا دکھا کر لا رہے تھے اور ساجھے ڈھیر پر ڈال رہے تھے۔ رات کے وقت آگ سے لپلپاتے شعلوں میں اس ڈھیر کو پگھلایا جانے لگا۔ آگ کے گرد بیٹھے لوگ انقلابی گیت گا رہے تھے۔ سب لوگ ایک آواز ہو کر اس گیت میں حصّہ لے رہے تھے۔ اکیلا وانگ چُو منہ بنائے بیٹھا تھا۔

Scanned with CamScanner

چین میں رہتے رہتے دھیرے دھیرے ماحول میں تناؤ سا آنے لگا اور ایک جُھٹ پُٹا سا گھِرنے لگا۔ ایک روز ایک آدمی نیلے رنگ کا کوٹ اور نیلے ہی رنگ کی پتلون پہنے اُس کے پاس آیا اور اسے اپنے ساتھ گاؤں کے انتظامی مرکز میں لِوا لے گیا۔ راستے بھر وہ آدمی چپ چاپ رہا۔ مرکز میں پہنچنے پر اس نے پایا کہ ایک بڑے سے کمرے میں پانچ افراد کا ایک گروپ میز کے پیچھے بیٹھا اُس کی راہ دیکھ رہا ہے۔

جب وانگ چُو ان کے سامنے بیٹھ گیا تو وہ باری باری سے اُس کے بھارت کے قیام کے بارے میں سوال پوچھنے لگے۔ "تم بھارت میں کتنے برسوں تک رہے؟"، "وہاں کیا کرتے رہے؟"، "کہاں کہاں گھومے؟" وغیرہ وغیرہ۔ پھر بودھ دھرم سے وانگ چُو کی دل چسپی کے بارے میں جان کر ان میں سے ایک شخص بولا: "تمھارے خیال میں بودھ دھرم کی مادّی بنیاد کیا ہے؟"

سوال وانگ چُو کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اُس نے آنکھیں مچمچائیں۔

"جدلیاتی مادّیت کے نقطۂ نظر سے تم بودھ دھرم کو کیسا سمجھتے ہو؟"

سوال پھر بھی وانگ چُو کی سمجھ میں نہیں آیا، لیکن اس نے بُدبُداتے ہوئے جواب دیا، "انسان کی روحانی ترقی میں، اس کے سکھ اور شانتی کے لیے، بودھ دھرم کے آٹھ راستے بہت اہم ہیں۔ مہاپران کا کہنا تھا۔۔۔"

اور وانگ چُو بودھ دھرم کے آٹھ احکام کی تفصیل بتانے لگا۔ ابھی وہ اپنی بات ختم نہیں کر پایا تھا کہ صدارتی کرسی پر بیٹھے، چھوٹی چھوٹی ترچھی آنکھوں والے شخص نے بات کاٹ کر کہا، "بھارت کی خارجہ پالیسی کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"

وانگ چُو مسکرایا، اپنی ڈیڑھ دانت کی مسکان۔ پھر بولا، "آپ صاحبان اس بارے میں بہتر جانتے ہیں۔ میں تو ایک سیدھا سادھا بودھ کا متلاشی ہوں۔ مگر بھارت بہت قدیم ملک ہے۔ اس کی تہذیب امن اور انسان دوستی کی تہذیب ہے۔۔۔"

"نہرو کے بارے میں تم کیا سوچتے ہو؟"

"نہرو کو میں نے تین بار دیکھا ہے۔ ایک بار تو اُن سے باتیں بھی کی ہیں۔ ان پر کچھ مغربی خیالات کا اثر زیادہ ہے، مگر پرانی تہذیب کے وہ بھی بڑے پرستار ہیں۔"

اس کے جواب سنتے ہوئے کچھ افراد تو سر ہلانے لگے، کچھ کا چہرہ تمتمانے لگا۔ پھر طرح طرح کے ٹیڑھے سوال پوچھے جانے لگے۔ انھیں احساس ہوا کہ جہاں تک حقائق کا، بھارت کی موجودہ زندگی کا تعلق ہے، وانگ چُو کی معلومات ادھوری بلکہ مضحکہ خیز ہیں۔

"سیاسی لحاظ سے تو تم صفر ہو! بودھ دھرم کی تعلیمات کو بھی سماجی علوم کے اعتبار سے پرکھ نہیں سکتے۔ جانے وہاں بیٹھے کیا کرتے رہے ہو! مگر ہم تمھاری مدد کریں گے۔"

پوچھ گچھ گھنٹوں چلتی رہی۔ پارٹی کے کارکنوں نے اُسے ہندی پڑھانے کا کام دے دیا، ساتھ ہی پیکنگ کے میوزیم میں دو دن کام کرنے کی بھی اجازت دے دی۔

Scanned with CamScanner

جب وانگ چُو وہاں سے لوٹا تو تھکا ہوا تھا۔ اُس کا سر بھنا رہا تھا۔ اپنے ملک میں اس کا دل لگ ہی نہیں پایا تھا۔ آج وہ اَور بھی زیادہ اُجڑا اُجڑا محسوس کر رہا تھا۔ چھپر کے نیچے لیٹا تو اسے اچانک ہی بھارت کی یاد ستانے لگی۔ اسے سارناتھ کی اپنی کوٹھری یاد آئی جس میں دن بھر بیٹھا پوتھیاں پڑھا کرتا تھا۔ نیم کا گھنا پیڑ یاد آیا جس کے نیچے کبھی کبھی ستایا کرتا تھا۔ یادوں کی قطار لمبی ہوتی گئی۔ اسے سارناتھ کی کینٹین کا رسوئیا یاد آیا جو سدا پیار سے ملتا تھا، سدا ہاتھ جوڑ کر، 'کہو بھگوان!' کہہ کر استقبال کرتا تھا۔

ایک بار وانگ چُو بیمار پڑ گیا تھا تو دوسرے روز کینٹین کا باورچی اپنے آپ اُس کی کوٹھری میں چلا آیا تھا۔ "میں بھی کھوں چینی بابو چاے پینے نہیں آئے، دو دن ہو گئے! پہلے آتے تھے تو درشن ہو جاتے تھے۔ ہمیں خبر کی ہوتی بھگوَن، تو ہم ڈاکٹر بابو کو بلا لاتے۔۔۔ میں بھی کھوں بات کیا ہے۔" پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے گنگا کا تٹ آ گیا جس پر وہ گھنٹوں گھوما کرتا تھا۔ پھر اچانک منظر بدل گیا اور کشمیر کی جھیل آنکھوں کے سامنے آ گئی اور اس کے پیچھے برف سے ڈھکے پہاڑ۔ پھر نیلم سامنے آئی، اُس کی کھلی کھلی آنکھیں، موتیوں کی سی جھلملاہٹ والے دانت۔۔۔ اُس کا دل بے چین ہو اٹھا۔

جوں جوں دن بیتتے گئے، بھارت کی یاد اُسے زیادہ پریشان کرنے لگی۔ وہ جل سے باہر پھینکی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ سارناتھ کے وہار میں سوال جواب نہیں ہوتے تھے۔ جہاں پڑے رہو پڑے رہو۔ رہنے کے لیے کوٹھری اور کھانے کا انتظام وہار کی طرف سے تھا۔ یہاں نئے نقطۂ نظر سے دھرم گرنتھوں کو پڑھنے اور سمجھنے کی نہ اس میں طاقت تھی نہ خواہش۔ برسوں سے ایک ہی ڈھرّے پر چلتے رہنے کی وجہ سے وہ تبدیلی سے کتراتا تھا۔ اس طلبی اور پوچھ گچھ کے بعد وہ پھر سے سکڑنے سمٹنے لگا تھا۔ کہیں کہیں اُسے بھارتی حکومت کے خلاف باتیں بھی سننی پڑتی تھیں۔ اچانک وانگ چُو بے حد اکیلا محسوس کرنے لگا اور اسے لگا کہ زندہ رہ پانے کے لیے اسے اپنے لڑکپن کے اس خواب میں پھر سے لوٹ جانا ہو گا جب وہ بودھ بھکشو بن کر بھارت میں گھومنے کا تصوّر کیا کرتا تھا۔

اس نے ایک دم بھارت لوٹنے کی ٹھان لی۔ لوٹنا آسان نہیں تھا۔ بھارتی سفارت خانے سے تو ویزا ملنے میں مشکل نہیں ہوئی، لیکن چین کی سرکار نے بہت سے اعتراض اٹھائے۔ وانگ چُو کی شہریت کا سوال تھا، اَور کئی سوال تھے۔ مگر بھارت اور چین کے تعلقات ابھی بہت بگڑے نہیں تھے، اس لیے آخر وانگ چُو کو بھارت لوٹنے کی اجازت مل گئی۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ زندگی کے باقی دن اب بھارت ہی میں کاٹے گا۔ بودھ بھکشو ہی بنے رہنا ہی اُس کی نیتی تھی۔

جس روز وہ کلکتے پہنچا، اُسی روز سرحد پر چینی اور بھارتی فوجوں میں جھڑپ ہوئی تھی اور دس بھارتی فوجی مارے گئے تھے۔ اس نے پایا کہ لوگ گھور گھور کر اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ اسٹیشن کے باہر ابھی نکلا ہی تھا کہ دو سپاہی آ کر اُسے پولیس کے دفتر میں لے گئے اور وہاں ایک اہلکار گھنٹے بھر تک اس کے پاسپورٹ اور کاغذوں کی چھان بین کرتا رہا۔

Scanned with CamScanner

"دو سال پہلے آپ چین گئے تھے۔ وہاں جانے کا کیا مقصد تھا؟"

"میں بہت برسوں تک یہاں رہتا رہا تھا، کچھ وقت کے لیے اپنے ملک جانا چاہتا تھا۔"

پولیس افسر نے اُسے سر سے پیر تک دیکھا۔ وانگ چُو پُرسکون تھا اور مسکرا رہا تھا، وہی ٹیڑھی سی مسکان۔

"آپ وہاں کیا کرتے رہے؟"

"وہاں میں ایک کمیون میں کھیتی باڑی کی ٹولی میں کام کرتا تھا۔"

"مگر آپ تو کہتے تھے کہ آپ بودھ گرنتھ پڑھتے ہیں؟"

"ہاں۔ پیکنگ میں ایک ادارے میں ہندی پڑھانے لگا تھا اور مجھے پیکنگ میوزیم میں کام کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔"

"اگر اجازت مل گئی تھی تو آپ اپنے ملک سے بھاگ کیوں آئے؟" پولیس افسر نے غصّے سے کہا۔

وانگ چُو کیا جواب دے؟ کیا کہے؟

"میں کچھ وقت کے لیے ہی وہاں گیا تھا، اب لوٹ آیا ہوں۔۔۔"

پولیس افسر نے ایک بار پھر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں شک اُتر آیا تھا۔ وانگ چُو کچھ عجیب سا محسوس کرنے لگا۔ بھارت میں پولیس اہلکاروں کے سامنے کھڑے ہونے کا اس کا پہلا تجربہ تھا۔ اس سے صنامنی کے لیے پوچھا گیا تو اُس نے پروفیسر تان شان کا نام لکھا، پھر گرودیو کا، مگر دونوں مر چکے تھے۔ اس نے سارناتھ کے ادارے کے منتری کا نام لیا، شانتی نکیتن کے دو ایک پرانے ساتھیوں کے نام لیے جو اُسے یاد تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے سب نام اور پتے نوٹ کر لیے۔ اُس کے کپڑوں کی تین بار تلاشی لی گئی۔ اُس کی ڈائری کو رکھ لیا گیا جس میں اُس نے کئی اقتباس اور نوٹس لکھ رکھے تھے۔ اور سپرنٹنڈنٹ نے اُس کے نام کے آگے ہدایت لکھ دی کہ اس آدمی پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

ریل کے ڈبے میں بیٹھا تو مسافر فائرنگ کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اُسے بیٹھتے دیکھ کر سب چپ ہو گئے اور اُس کی طرف گھورنے لگے۔

کچھ دیر بعد جب مسافروں نے دیکھا کہ وہ تھوڑی بہت بنگالی اور ہندی بول لیتا ہے تو ایک بنگالی بابو اُچک کر کھڑے ہوئے اور ہاتھ جھٹک جھٹک کر کہنے لگے، "یا تو کہو کہ تمہارے ملک نے دغابازی کی ہے، نہیں تو ہمارے ملک سے نکل جاؤ۔۔۔ نکل جاؤ۔۔۔ نکل جاؤ!"

ڈیڑھ دانت کی مسکان جانے کہاں اوجھل ہو چکی تھی۔ اُس کی جگہ چہرے پر مایوسی اُتر آئی تھی۔ بے چین اور خاموش وانگ چُو چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کہے بھی تو کیا کہے! فائرنگ کے بارے میں جان کر اُسے بھی گہرا صدمہ ہوا تھا۔ اس جھگڑے کی وجہ کے بارے میں اُسے کچھ بھی علم نہیں تھا۔ اور وہ جاننا چاہتا بھی نہیں تھا۔

ہاں، سارناتھ پہنچ کر وہ سچ مچ جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ اپنا تھیلا رکشا میں رکھے جب وہ آشرم کے

قریب پہنچا تو کینٹین کا باورچی سچ مچ لپک کر باہر آیا۔ "آ گئے بھگوان! آ گئے میرے چینی بابو! بہت دن بعد درشن دیے۔ ہم بھی کہیں اتنا عرصہ ہو گیا چینی بابو نہیں لوٹے! آپ یہاں نہیں تھے۔ ہم کہیں جانے کب لوٹیں گے! یہاں پر تھے، دن میں دو باتیں ہو جایا کرتی تھیں، بھلے آدمی کے درشن ہو جاتے تھے۔ اس میں بڑی بھلائی ہوتی ہے۔" اور اس نے ہاتھ بڑھا کر تھیلا اٹھا لیا۔ "ہم دیں پہنچا، چینی بابو؟"

وانگ چُو کو لگا جیسے وہ اپنے گھر پہنچ گیا ہو۔

"آپ کا ٹرنک، چینی بابو، ہمارے پاس رکھا ہے۔ منتری جی سے ہم نے لے لیا۔ آپ کی کوٹھری میں ایک دوسرے سجن رہنے آئے تو ہم نے کہا کوئی فکر نہیں، یہ ٹرنک ہمارے پاس رکھ جائیے۔ اور چینی بابو، آپ اپنا لوٹا باہر ہی بھول گئے تھے؟ ہم نے منتری بابو سے کہا یہ لوٹا چینی بابو کا ہے، ہم جانتے ہیں، ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"

وانگ چُو کا دل بھر آیا۔ اُسے لگا کہ اُس کی ڈانواڈول زندگی میں ٹھہراو آ گیا ہے، جیون کی ڈگمگاتی نو کا پھر ہموار رفتار سے چلنے لگی ہے۔

منتری جی بھی خلوص سے ملے۔ پرانی جان پہچان کے آدمی تھے۔ انھوں نے ایک کوٹھری بھی کھول کر دے دی، مگر وظیفے کے بارے میں کہا کہ اس کے لیے پھر سے کوشش کرنی ہو گی۔ وانگ چُو نے کوٹھری کے پیچھوں بیچ چٹائی دوبارہ بچھالی، کھڑکی کے باہر وہی منظر پھر سے اُبھر آیا۔ کھوئی ہوئی روح اپنے مقام پر لوٹ آئی۔

تبھی مجھے اُس کا خط ملا کہ وہ بھارت لوٹ آیا ہے اور پھر سے جم کر بودھ گرنتھوں کا مطالعہ کرنے لگا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اسے ماہوار وظیفے کے بارے میں کچھ فکر ہے اور اگر اس سلسلے میں میں بنارس میں فلاں صاحب کو خط لکھ دوں تو وظیفہ ملنے میں سہولت ہو گی۔

خط پا کر مجھے کھٹکا ہوا۔ کون سی مرگ ترشنا اُسے واپس کھینچ لائی ہے؟ یہ لوٹ کیوں آیا ہے؟ اگر کچھ دن اَور وہیں ٹکا رہتا تو اپنے لوگوں میں اس کا دل لگنے لگتا۔ پر کسی کی سنک کا کیا علاج! اب جو لوٹ آیا ہے تو کیا چارہ ہے۔ میں نے فلاں صاحب کو خط لکھ دیا اور وانگ چُو کے وظیفے کا چھوٹا موٹا بندوبست ہو گیا۔

لوٹنے کے دس ایک دن بعد وانگ چُو ایک صبح چٹائی پر بیٹھا ایک گرنتھ پڑھ رہا تھا اور بار بار مست ہو رہا تھا کہ اس کی کتاب پر کسی کا سایہ پڑا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو پولیس کا تھانے دار کھڑا تھا، ہاتھ میں ایک پرچا اٹھائے ہوئے تھا۔ وانگ چُو کو بنارس کے بڑے پولیس اسٹیشن میں بلایا گیا تھا۔ وانگ چُو کا دل وسوسوں سے بھر گیا۔

تین دن بعد وانگ چُو بنارس کے پولیس اسٹیشن کے برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ بنچ پر بڑی عمر کا ایک اَور چینی شخص تھا جو جوتے بنانے کا کام کرتا تھا۔ آخر بلاوا آیا اور وانگ چُو چق اٹھا کر افسر کی میز کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

Scanned with CamScanner

"تم چین سے کب لوٹے؟"

وانگ چُو نے بتا دیا۔

"کلکتے میں تم نے اپنے بیان میں کہا کہ تم شانتی نکیتن جا رہے ہو، پھر یہاں کیوں چلے آئے؟ پولیس کو پتا لگانے میں بڑی پریشانی اٹھانی پڑی ہے۔"

"میں نے دونوں جگہوں کے بارے میں کہا تھا۔ شانتی نکیتن تو میں صرف دو ایک دن کے لیے جانا چاہتا تھا۔"

"تم چین سے کیوں لوٹ آئے؟"

"میں بھارت میں رہنا چاہتا ہوں۔۔۔" اس نے پہلے کا جواب دُہرا دیا۔

"لوٹ آنا تھا تو گئے کیوں تھے؟"

یہ سوال وہ بہت بار پہلے بھی سن چکا تھا۔ جواب میں بودھ گرنتھوں کا حوالہ دیے کے سوا اسے کوئی اَور جواب نہیں سوجھ پاتا تھا۔

بہت لمبا انٹرویو نہیں ہوا۔ وانگ چُو کو ہدایت کی گئی کہ اسے ہر مہینے کے پہلے سوموار کو بنارس کے بڑے پولیس اسٹیشن میں آنا ہو گا اور اپنی حاضری دکھانی ہو گی۔

وانگ چُو باہر آ گیا مگر خود کو مضطرب سا محسوس کرنے لگا۔ مہینے میں ایک بار آنا کوئی بڑی بات نہیں تھی، لیکن اس سے اس کی پُرسکون زندگی میں خلل پڑتا تھا۔

وانگ چُو دل میں اتنا اضطراب محسوس کر رہا تھا کہ بنارس سے لوٹنے کے بعد کوٹھری میں جانے کے بجائے سب سے پہلے اس خاموش متبرک مقام پر جا کر بیٹھ گیا جہاں صدیوں پہلے مہاپران نے اپنا پہلا وعظ کیا تھا، اور دیر تک وہاں بیٹھا مراقبہ کرتا رہا۔ بہت دیر بعد اس کا دل پھر سے ٹھکانے پر آنے لگا اور دل میں پھر جذبے کی ترنگیں اٹھنے لگیں۔

پر وانگ چُو کو چین نصیب نہیں ہوا۔ کچھ ہی دن بعد اچانک چین اور بھارت میں جنگ چھڑ گئی۔ ملک بھر میں جیسے طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس روز شام کو پولیس کے کچھ لوگ ایک جیپ میں آئے اور وانگ چُو کو حراست میں لے کر بنارس چلے گئے۔ سرکار یہ نہ کرتی تو اَور کیا کرتی؟ حکومت کرنے والوں کو اتنی فرصت کہاں کہ ہنگامی حالت میں ہمدردی اور نیک نیتی کے ساتھ دشمن کے ایک ایک شہری کی جانچ کرتے پھریں۔

دو دن تک دونوں چینیوں کو پولیس اسٹیشن کی ایک کوٹھری میں رکھا گیا۔ دونوں میں کوئی بات بھی مشترک نہیں تھی۔ جوتے بنانے والا چینی سارا وقت سگریٹ پھونکتا رہتا اور گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے بڑبڑاتا رہتا، جب کہ وانگ چُو ساکت اور نڈھال سا دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا خلا میں دیکھتا رہتا۔

جس وقت وانگ چُو اپنی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، اُسی وقت دو تین کمرے چھوڑ کر

سپرنٹنڈنٹ کی میز پر اُس کی پوٹلی کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ اُس کی غیر موجودگی میں پولیس کے سپاہی کوٹھری میں سے اُس کا ٹرنک اٹھا لائے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ کے سامنے کاغذوں کا پلندا رکھا تھا جس پر کہیں پالی میں تو کہیں سنسکرت میں اقتباسات درج تھے، لیکن بہت سا حصہ چینی زبان میں تھا۔ صاحب کچھ دیر تک تو کاغذوں کو اُلٹتے پلٹتے رہے، روشنی کے سامنے رکھ کر اس میں کسی خفیہ زبان کو ڈھونڈتے بھی رہے، آخر میں انھوں نے حکم دیا کہ کاغذوں کے پلندے کو باندھ کر دلّی کے اہلکاروں کے پاس بھیج دیا جائے کیوں کہ بنارس میں کوئی آدمی چینی زبان نہیں جانتا تھا۔

پانچویں دن لڑائی بند ہو گئی، لیکن وانگ چُو کو سارناتھ لوٹنے کی اجازت ایک مہینے بعد ملی۔ چلتے وقت جب ٹرنک اس کے حوالے کیا گیا اور اس نے اسے کھول کر دیکھا تو سکتے میں آ گیا۔ اُس کے کاغذ اس میں نہیں تھے جن پر وہ برسوں سے نوٹس اور مضامین وغیرہ لکھتا رہا تھا اور ایک طرح سے اس کے لیے سب کچھ تھے۔ پولیس افسر کے کہنے پر کہ انھیں دلّی بھیج دیا گیا ہے، وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔

"وہ میرے کاغذ آپ مجھے دے دیجیے۔ ان پر میں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ بہت ضروری ہیں۔"

اس پر افسر رُکھائی سے بولا، "مجھے ان کاغذوں کا کیا کرنا ہے؟ آپ کے ہیں، آپ کو مل جائیں گے۔" اور اس نے وانگ چُو کو چلتا کیا۔ وانگ چُو اپنی کوٹھری میں لوٹ آیا۔ اپنے کاغذوں کے بغیر وہ آدھ مرا سا ہو رہا تھا۔ نہ پڑھنے میں دل لگتا نہ کاغذوں پر نئے اقتباس اُتارنے میں۔ اور پھر اس کی کڑی نگرانی کی جانے لگی تھی۔ کھڑکی سے تھوڑا ہٹ کر نیم کے پیڑ کے نیچے ایک آدمی روز بیٹھا نظر آنے لگا۔ ڈنڈا ہاتھ میں لیے وہ کبھی ایک کروٹ بیٹھتا کبھی دوسری کروٹ۔ کبھی اٹھ کر ڈولنے لگتا، کبھی کنویں کی منڈیر پر جا بیٹھتا، کبھی کینٹین کی بنچ پر آ بیٹھتا، کبھی گیٹ پر جا کھڑا ہوتا۔ اس کے علاوہ اب وانگ چُو کو مہینے میں ایک بار کے بجائے ہفتے میں ایک بار بنارس میں حاضری لگوانے جانا پڑتا تھا۔

تب مجھے وانگ چُو کی چٹھی ملی۔ ساری تفصیل بتانے کے بعد اس نے لکھا کہ بودھ وہار کا منتری بدل گیا ہے؛ نئے منتری کو چین سے نفرت ہے اور وانگ چُو کو ڈر ہے کہ وظیفہ ملنا بند ہو جائے گا۔ دوسرے، جیسے بھی بن پڑے میں اس کے کاغذوں کو بچا لوں؛ جیسے بھی بن پڑے انھیں پولیس کے ہاتھوں سے نکلوا کر سارناتھ میں اُس کے پاس بھجوا دوں۔ اور اگر بنارس کے پولیس اسٹیشن میں ہر ہفتے پیش ہونے کے بجائے اسے مہینے میں ایک بار جانا پڑے تو اسے سہولت ہو گی، کیوں کہ اِس طرح مہینے میں لگ بھگ دس روپے آنے جانے میں لگ جاتے ہیں اور پھر کام میں جی ہی نہیں لگتا، سر پر تلوار ٹنگی رہتی ہے۔

وانگ چُو نے خط تو لکھ دیا، لیکن یہ نہیں سوچا کہ مجھ جیسے آدمی سے یہ کام نہیں ہو پائے گا۔ ہمارے یہاں کوئی کام بغیر جان پہچان یا سفارش کے نہیں ہو سکتا۔ اور میرے جاننے والوں میں بڑے سے بڑا آدمی میرے کالج کا پرنسپل تھا۔ پھر بھی میں کچھ اسمبلی ممبروں کے پاس گیا؛ ایک نے دوسرے کی طرف بھیجا، دوسرے نے تیسرے کی طرف۔ میں بھٹک بھٹک کر لوٹ آیا۔ یقین دہانیاں تو بہت ملیں مگر سب یہی کہتے: "وہ چین جو گیا تھا، وہاں سے لوٹ کیوں آیا؟"، یا پھر پوچھتے: "پچھلے بیس سال سے مطالعہ ہی کر رہا

ہے؟"

لیکن جب میں اس کے مسودوں کا ذکر کرتا تو سب یہی کہتے: "ہاں، یہ تو مشکل نہیں ہونا چاہیے"، اور سامنے رکھے کاغذ پر کچھ نوٹ کر لیتے۔ پر سرکاری کام کے راستے بھول بھلیّوں کی طرح ہوتے ہیں اور ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی آدمی تمھیں تمھاری حیثیت کی پہچان کراتا رہتا ہے۔ میں جواب میں اسے اپنی کوششوں کی تفصیل لکھی، یہ بھی تسلّی دی کہ میں پھر لوگوں سے ملوں گا، لیکن ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ جب حالات بہتر ہو جائیں تو وہ اپنے ملک لوٹ جائے کیوں کہ اس کے لیے یہی بہتر ہے۔

خط سے اُس کے دل پر کیا اثر ہوا، میں نہیں جانتا۔ اس نے کیا سوچا ہو گا؟ مگر ان تناؤ بھرے دنوں میں جب مجھے خود چین کے رویّے پر غصّہ آ رہا تھا، میں وانگ چُو کی صورتِ حال کو زیادہ ہم دردی کے ساتھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اُس کا پھر ایک خط آیا۔ اس میں چین لوٹ جانے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس میں صرف وظیفے کا ذکر کیا گیا تھا۔ وظیفے کی رقم اب بھی چالیس روپے ہی تھی لیکن اُسے اطلاع دے دی گئی تھی کہ سال ختم ہونے پر پھر غور کیا جائے گا کہ وہ ملتار ہے گا یا بند کر دیا جائے گا۔

لگ بھگ سال بھر بعد وانگ چُو کو ایک پُرزہ ملا کہ تمھارے کاغذ واپس کیے جا چکے ہیں اور تم پولیس اسٹیشن آ کر انھیں لے جا سکتے ہو۔ اُن دنوں وہ بیمار پڑا تھا، لیکن بیماری کی حالت میں بھی وہ گرتا پڑتا بنارس پہنچا۔ مگر اس کے ہاتھ صرف ایک تہائی کاغذ لگے۔ پوٹلی اب بھی کھلی ہوئی تھی۔ وانگ چُو کو پہلے تو یقین نہیں آیا، پھر اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ اس پر تھانے دار رُکھائی کے ساتھ بولا، "ہم کچھ نہیں جانتے۔ اِنھیں اٹھاؤ اور یہاں سے لے جاؤ۔ ورنہ لکھ دو کہ ہم انھیں لینے سے انکار کرتے ہیں۔"

وانگ چُو پلندا بغل میں دبائے کانپتی ٹانگوں سے لوٹ آیا۔ کاغذوں میں صرف ایک پورا مضمون اور کچھ نوٹس بچے تھے۔

اُس دن سے وانگ چُو کی آنکھوں کے سامنے دھُول اُڑنے لگی۔

وانگ چُو کی موت کی خبر مجھے مہینے بھر بعد ملی، وہ بھی بودھ وہار کے منتری کی طرف سے کہ مرنے سے پہلے وانگ چُو نے درخواست کی تھی کہ اس کا چھوٹا سا ٹرنک اور گنی چنی کتابیں مجھے پہنچوا دی جائیں۔

عمر کے اِس حصّے میں پہنچ کر انسان بُری خبریں سننے کا عادی ہو جاتا ہے اور وہ دل پر گہرا اثر نہیں کرتیں۔

میں فوراً سارناتھ نہیں جا پایا۔ جانے کی کوئی تک بھی نہیں تھی کیوں کہ وہاں وانگ چُو کا کون بیٹھا تھا جس کے سامنے افسوس کرتا۔ وہاں تو صرف ٹرنک ہی رکھا تھا۔ پر کچھ دن بعد موقع ملنے پر میں گیا۔ منتری جی نے وانگ چُو کی بابت کچھ اچھے الفاظ کہے، "بڑا نیک دل آدمی تھا، سچے معنوں میں بودھ بھکشو

تھا،" وغیرہ۔ میرے دستخط لے کر انھوں نے ٹرنک میرے حوالے کیا۔ ٹرنک میں وانگ چُو کے کپڑے تھے، وہ پھٹا پرانا چوغہ تھا جو کسی زمانے میں اُس نے سری نگر میں خریدا تھا۔ چھوٹا سا چمڑے کا پیڈ تھا جو نیلم نے تحفے میں دیا تھا۔ تین چار کتابیں تھیں، پالی اور سنسکرت کی۔ چٹھیاں تھیں، کچھ میری، کچھ نیلم کی، کچھ اَور لوگوں کی۔

ٹرنک اٹھائے میں باہر کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ ملی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، کینٹین کا رسوئیا بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اپنے خطوں میں وانگ چُو اکثر اُس کا ذکر کیا کرتا تھا۔

"بابو آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ مجھ سے آپ کا بہت ذکر کرتے تھے۔ بہت بھلے آدمی تھے۔۔۔"

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ سارے سنسار میں شاید یہی اکیلا انسان تھا جس نے وانگ چُو کی موت پر دو آنسو بہائے تھے۔

"بڑی بھولی طبیعت تھی۔ بےچارے کو پولیس والوں نے بہت پریشان کیا۔ شروع شروع میں تو چوبیس گھنٹے نگرانی رہتی تھی۔ میں اُس حوالدار سے کہوں، بھیّا، تو کیوں اس بےچارے کو پریشان کرتا ہے؟ وہ کہے، میں تو ڈیوٹی کر رہا ہوں۔۔۔"

میں ٹرنک اور کاغذوں کا پلندا لے آیا ہوں۔ اس پلندے کا کیا کروں؟ کبھی سوچتا ہوں اسے چھپوا ڈالوں۔ مگر ادھورا مسودہ کون چھاپے گا؟ بیوی روز بگڑتی ہے کہ میں گھر میں کچرا بھرتا رہتا ہوں! دو تین بار اسے پھینکنے کی دھمکی بھی دے چکی ہے، پر میں اسے چھپاتا رہتا ہوں۔ کبھی کسی تختے پر رکھ دیتا ہوں، کبھی پلنگ کے نیچے چھپا دیتا ہوں۔ پر میں جانتا ہوں، کسی دن یہ بھی گلی میں پھینک دیے جائیں گے۔

**

بھیشم ساہنی

ترجمہ: خورشید قائم خانی۔ تاج قائم خانی

امرتسر آ گیا ہے

گاڑی کے ڈبے میں زیادہ مسافر نہیں تھے۔ میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سردار جی مجھے بڑی دیر سے محاذ جنگ کے قصے سنا رہے تھے۔ جنگ کے زمانے میں وہ برما کی لڑائی میں حصہ لے چکے تھے اور بات بات پر کھی کھی کر کے ہنستے اور گورے فوجیوں کا مذاق اُڑاتے جا رہے تھے۔ ڈبے میں تین پٹھان بیوپاری بھی تھے۔ اُن میں سے ایک ہرے رنگ کی پوشاک پہنے اوپر والی برتھ پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ آدمی بڑا ہنس مکھ تھا اور بڑی دیر سے میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ایک دُبلے سے بابو کے ساتھ اُس کا مذاق چل رہا تھا۔ وہ دبلا بابو پشاور کا رہنے والا جان پڑتا تھا کیوں کہ کسی کسی وقت وہ آپس میں پشتو میں باتیں کرنے لگتے تھے۔ میرے سامنے بائیں طرف کونے میں ایک بُڑھیا منہ سر ڈھانپے بیٹھی تھی اور دیر سے مالا جپ رہی تھی۔ یہی کچھ لوگ رہے ہوں گے۔ ممکن ہے دو ایک مسافر اَور بھی رہے ہوں لیکن وہ مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔

گاڑی دھیمی رفتار سے چلی جا رہی تھی، گاڑی میں بیٹھے مسافر باتیں کر رہے تھے، باہر گیہوں کے کھیتوں میں ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں، اور میں من ہی من میں بڑا خوش تھا کیوں کہ میں دلّی میں ہونے والا آزادی کا جشن دیکھنے جا رہا تھا۔

اُن دنوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو لگتا ہے ہم کسی جھُٹ پُٹے میں جی رہے تھے۔ شاید وقت بیت جانے پر ماضی کا سارا بیوپار ہی جھُٹ پُٹے میں گزرا ہوا جان پڑتا ہے۔ جوں جوں مستقبل کے پٹ کھُلتے جاتے ہیں، یہ جھٹ پٹا اَور بھی گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

اُنہیں دنوں پاکستان کے بنائے جانے کا اعلان کیا گیا تھا اور لوگ طرح طرح کے اندازے لگانے

Scanned with CamScanner

لگے تھے کہ مستقبل میں زندگی کا خاکہ کیسا ہو گا۔ مگر کسی کا بھی تصوّر بہت دور تک نہیں جا پاتا تھا۔ میرے سامنے بیٹھے ہوئے سردار جی بار بار مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ پاکستان بن جانے کے بعد جناح صاحب بمبئی ہی میں رہیں گے یا پاکستان جا کر بس جائیں گے۔ اور میرا ہر بار یہی جواب ہوتا: بمبئی کیوں چھوڑیں گے، پاکستان آتے جاتے رہیں گے، بمبئی چھوڑ دینے کی کیا تک ہے؟ لاہور اور گورداس پور کے بارے میں بھی اندازے لگائے جا رہے تھے کہ کون سا شہر کس طرف جائے گا۔ مل بیٹھنے کے ڈھنگ میں، گپ شپ میں، ہنسی مذاق میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ کچھ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر جا رہے تھے جب کہ دوسرے لوگ اُن کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون سا قدم ٹھیک ہو گا اور کون سا غلط۔ ایک طرف پاکستان بن جانے کا جوش تھا تو دوسری طرف ہندوستان کے آزاد ہونے کا جوش۔ جگہ جگہ فساد بھی ہو رہے تھے اور یومِ آزادی کی تیاریاں بھی چل رہی تھیں۔ اس پس منظر میں لگتا، ملک آزاد ہو جانے پر فسادات اپنے آپ بند ہو جائیں گے۔ ماحول کے اس جھٹ پٹے میں آزادی کی سنہری دھُول سی اُڑ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ غیر یقینی پن بھی ڈول رہا تھا، اور اسی غیر یقینی پن کی حالت میں کسی کسی وقت مستقبل کا خاکہ جھلک دے جاتا تھا۔

شاید جہلم کا اسٹیشن گزر چکا تھا جب اوپر والی برتھ پر بیٹھے پٹھان نے ایک پوٹلی کھول لی، اور اس میں سے اُبلا ہوا گوشت اور نان کے ٹکڑے نکال نکال کر اپنے ساتھیوں کو دینے لگا۔ پھر وہ ہنسی مذاق کے بیچ میری بغل میں بیٹھے بابو کی طرف بھی نان کا ٹکڑا اور گوشت کی بوٹی بڑھا کر کھانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ "کھا لے بابو، طاقت آئے گی۔ ہم جیسا ہو جائے گا۔ بیوی بھی تیرے ساتھ خوش رہے گی۔ کھا لے دال خور، تُو دال کھاتا ہے اس لیے دبلا ہے۔۔۔"

ڈبے میں لوگ ہنسنے لگے تھے۔ بابو نے پشتو میں کچھ جواب دیا اور پھر مسکراتا سر ہلاتا رہا۔

اس پر دوسرے پٹھان نے ہنس کر کہا، "او ظالم، اَمارے آتھ سے نئیں لیتا اے تو اپنے آتھ سے اٹھا لے۔ خدا قسم بَر کا گوشت اے، اَور کسی چیز کا نئیں ہے!"

اوپر بیٹھا پٹھان چہک کر بولا، "او خنزیر کے تُخم، اِدر تمیں کون دیکتا اے؟ ام تیری بیوی کو نئیں بولے گا۔ او تو امارے ساتھ بوٹی توڑ، ام تیرے ساتھ دال پیے گا۔"

اس پر قہقہہ اٹھا لیکن دبلا پتلا بابو ہنستا سر ہلاتا رہا اور کبھی کبھی دو لفظ پشتو میں بھی کہہ دیتا۔

"او کتنا بُرا بات اے، ام کاتا اے اور تو امارا منہ دیکتا اے۔۔۔" سب پٹھان مگن تھے۔

"یہ اس لیے نہیں لیتا کہ تم نے ہاتھ نہیں دھوئے ہیں،" بھاری بھرکم سردار جی بولے اور بولتے ہی کھی کھی کرنے لگے۔ اَدھ لیٹی حالت میں بیٹھے سردار جی کی توند سیٹ کے نیچے لٹک رہی تھی۔ "تم ابھی سو کر اٹھے ہو اور اٹھتے ہی پوٹلی کھول کر کھانے لگ گئے ہو، اسی لیے بابو جی تمہارے ہاتھ سے نہیں لیتے۔ اَور کوئی بات نہیں۔" سردار جی نے میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور پھر کھی کھی کرنے لگے۔

"گوشت نئیں کاتا اے بابو تو جاؤ زنانہ ڈبے میں جا کر بیٹھو۔ اِدر کیا کرتا اے؟" پھر قہقہہ اٹھا۔

Scanned with CamScanner

ڈبے میں اَور بھی کئی مسافر تھے لیکن پُرانے مسافر یہی تھے جو سفر شروع ہونے پر گاڑی میں بیٹھے تھے۔ باقی مسافر اُترتے چڑھتے رہے تھے۔ پرانے مسافر ہونے کے ناتے ہی اُن میں ایک طرح کی بے تکلفی آ گئی تھی۔

"او ادر آ کر بیٹھو۔ تم امارے ساتھ بیٹھو۔ آؤ ظالم، قصہ خوانی کی باتیں کریں گے۔" تب ہی کسی اسٹیشن پر گاڑی رکی تھی اور نئے مسافروں کا ریلا اندر آ گیا تھا۔ بہت سے مسافر ایک ساتھ اندر گھستے چلے آئے تھے۔

"کون سا اسٹیشن ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"وزیر آباد ہے شاید،" میں نے باہر کی طرف دیکھ کر کہا۔ گاڑی وہاں تھوڑی دیر کھڑی رہی لیکن چھوٹنے سے پہلے ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ ایک آدمی ساتھ والے ڈبے میں سے پانی لینے اُترا تھا اور نل پر جا کر پانی لوٹے میں بھر رہا تھا کہ اچانک بھاگ کر اپنے ڈبے کی طرف لوٹ آیا۔ چھلچھلاتے لوٹے میں سے پانی گر رہا تھا۔ لیکن جس ڈھنگ سے وہ بھاگا تھا اُسی نے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ نل پر کھڑے دوسرے لوگ بھی -- تین یا چار آدمی رہے ہوں گے -- ادھر اُدھر اپنے اپنے ڈبوں کی طرف بھاگ گئے تھے۔ اس طرح گھبرا کر بھاگتے لوگوں کو میں دیکھ چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پلیٹ فارم خالی ہو گیا۔ مگر ڈبے کے اندر اب بھی ہنسی مذاق چل رہا تھا۔

"کہیں کوئی گڑبڑ ہے،" میرے پاس بیٹھے دبلے بابو نے کہا۔

کہیں کچھ تھا، لیکن کیا تھا، کوئی بھی ٹھیک سے نہیں جانتا تھا۔ میں کئی فساد دیکھ چکا تھا اس لیے ماحول میں ہونے والی چھوٹی سی تبدیلی کو بھی بھانپ گیا تھا۔ بھاگتے لوگ، کھٹاک سے بند ہوتے دروازے، گھروں کی چھتوں پر کھڑے آدمی، خاموشی اور سناٹا، سبھی فساد کے آثار تھے۔

ٹھیک تب ہی پچھلے دروازے کی طرف سے، جو پلیٹ فارم کے دوسری طرف کھلتا تھا، ہلکا سا شور ہوا۔ کوئی مسافر اندر گھسنا چاہتا تھا۔

"کہاں گھسا آ رہا ہے، نہیں ہے جگہ! بول دیا جگہ نہیں ہے۔" کسی نے کہا۔

"بند کرو جی دروازہ۔ یوں ہی منہ اٹھائے گھسے آتے ہیں---" آوازیں آ رہی تھیں۔

جتنی دیر کوئی مسافر ڈبے کے باہر کھڑا اندر آنے کی کوشش کرتا رہے، اندر بیٹھے مسافر اُس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک بار جیسے تیسے وہ اندر آ جائے تو مخالفت ختم ہو جاتی ہے اور وہ مسافر جلد ہی ڈبے کی دنیا کا باسی بن جاتا ہے اور اگلے اسٹیشن پر وہی سب سے پہلے باہر کھڑے مسافر پر چلانے لگتا ہے: "نہیں ہے جگہ! اگلے ڈبے میں جاؤ۔ گھسے چلے آتے ہیں---"

دروازے پر شور بڑھتا جا رہا تھا۔ تب ہی میلے کچیلے کپڑوں اور لٹکتی مونچھوں والا ایک آدمی دروازے میں سے اندر گھستا دکھائی دیا۔ چیکٹ میلے کپڑے، ضرور کہیں حلوائی کی دکان کرتا ہو گا۔ وہ لوگوں کی شکایتوں آوازوں کی طرف دھیان دیے بغیر دروازے کی طرف گھوم کر بڑا سا کالے رنگ کا صندوق اندر کی

طرف گھسیٹنے لگا۔

"آ جاؤ، آ جاؤ، تم بھی چڑھ جاؤ!" وہ اپنے پیچھے کسی سے کہے جا رہا تھا۔ تبھی دروازے میں ایک پتلی سُوکھی سی عورت نظر آئی اور اُس کے پیچھے سولہ سترہ برس کی سانولی سی ایک لڑکی اندر آ گئی۔ لوگ اب بھی چلائے جا رہے تھے۔ سردار جی کو کولھوں کے بل اٹھ کر بیٹھنا پڑا۔

"بند کرو جی دروازہ، بنا پوچھے چڑھے آتے ہیں! اپنے باپ کا گھر سمجھ رکھا ہے۔ مت گھسنے دو جی، کیا کرتے ہو، دھکیل دو پیچھے۔۔۔" دوسرے لوگ بھی چلا رہے تھے۔

وہ آدمی اپنا سامان اندر گھسیٹے جا رہا تھا اور اس کی بیوی اور بیٹی سنڈاس کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی تھیں۔

"اور کوئی ڈبا نہیں ملا؟ عورت ذات کو بھی یہیں اٹھا لایا ہے!"

وہ آدمی پسینے میں تر تھا اور ہانپتا ہوا سامان اندر گھسیٹے جا رہا تھا۔ صندوق کے بعد رسیوں سے بندھی کھاٹ کی پٹیاں اندر کی طرف کھینچنے لگا۔

"ٹکٹ ہے جی میرے پاس، میں بے ٹکٹ نہیں ہوں۔ لاچاری ہے، شہر میں فساد ہو گیا ہے۔ بڑی مشکل سے اسٹیشن تک پہنچا ہوں۔" اس پر ڈبے میں بیٹھے بہت سے لوگ چپ ہو گئے، لیکن برتھ پر بیٹھا پٹھان اُچک کر بولا، "نکل جاؤ ادر سے! دیکتا نئیں اے ادر جگہ نئیں اے!"

اور پٹھان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، آگے بڑھ کر اوپر ہی سے اُس مسافر کو لات جما دی، مگر لات اس آدمی کو لگنے کے بجائے اُس کی بیوی کے کلیجے میں لگی اور وہ وہیں ہائے ہائے کرتی بیٹھ گئی۔

اُس آدمی کے پاس مسافروں کے ساتھ اُلجھنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ برابر اپنا سامان اندر گھسیٹے جا رہا تھا۔ لیکن ڈبے میں خاموشی چھا گئی۔ کھاٹ کی پٹیوں کے بعد بڑی بڑی گٹھریاں آئیں۔ اس پر اوپر بیٹھے پٹھان کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔

"نکالو اس کو باہر! کون ہے یہ؟" وہ چلایا۔

اس پر دوسرے پٹھان نے جو نیچے کی سیٹ پر بیٹھا تھا، اُس آدمی کا صندوق دروازے میں سے نیچے دھکیل دیا جہاں لال وردی والا ایک قلی کھڑا سامان اندر پہنچا رہا تھا۔

اُس کی بیوی کو چوٹ لگنے پر کچھ مسافر چپ ہو گئے تھے، صرف کونے میں بیٹھی بڑھیا کُرلائے جا رہی تھی، "اے نیک بندو، بیٹھنے دو۔ آ جا بیٹی، تو میرے پاس آ جا۔ جیسے کیسے سفر کاٹ لیں گے۔ چھوڑو ظالمو، بیٹھنے دو۔"

ابھی آدھا ہی سامان اندر آ پایا ہو گا کہ اچانک گاڑی سرکنے لگی۔

"چھوٹ گیا! سامان چھوٹ گیا!" وہ آدمی بدحواس سا ہو کر چلایا۔

"پتاجی، سامان چھوٹ گیا!" سنڈاس کے پاس کھڑی لڑکی سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی اور چلائے جا رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

"اترو، نیچے اترو!" وہ آدمی ہڑبڑا کر چلایا اور آگے بڑھ کر کھاٹ کی پٹیاں اور گٹھریاں باہر پھینکتے ہوئے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر نیچے اُتر گیا۔ اس کے پیچھے اس کی بے چین بیٹی اور پھر اس کی بیوی کلیجے کو دونوں ہاتھوں سے دبائے، ہائے ہائے کرتی، نیچے اتر گئی۔

"بہت بُرا کیا ہے تم لوگوں نے، بہت بُرا کیا ہے!" بڑھیا اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ "تمہارے دل میں درد مر گیا ہے۔ چھوٹی سی بچی اُس کے ساتھ تھی۔ بے رحمو، تم نے بہت بُرا کیا ہے، دھکے دے کر اُتار دیا!"

گاڑی سُونے پلیٹ فارم کو لانگھتی آگے بڑھ گئی۔ ڈبے میں بے چین سی خاموشی چھا گئی۔ بُڑھیا نے بولنا بند کر دیا تھا۔ پٹھانوں کی مخالفت کرنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوئی۔

میری بغل میں بیٹھے دبلے بابو نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا، "آگ ہے، دیکھو آگ لگی ہے۔"

گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ کر آگے نکل آئی تھی اور شہر پیچھے چھوٹ رہا تھا۔ تب ہی شہر کی طرف سے اٹھتے دھویں کے بادل اور اُن میں لپلپاتی آگ کے شعلے نظر آنے لگے تھے۔

"فساد ہوا ہے۔ اسٹیشن پر بھی لوگ بھاگ رہے تھے۔ ضرور کہیں فساد ہوا ہے۔"

شہر میں آگ لگی ہوئی تھی۔ یہ بات ڈبے بھر کے لوگوں کو معلوم ہو گئی اور وہ لپک لپک کر کھڑکیوں سے آگ کا منظر دیکھنے لگے۔

جب گاڑی شہر چھوڑ کر آگے نکل گئی تو ڈبے میں سناٹا چھا گیا۔ میں نے گھوم کر ڈبے کے اندر دیکھا، دبلے بابو کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور ماتھے پر پسینے کی پرت کسی مُردے کے ماتھے کی طرح چمک رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے اپنی اپنی جگہ بیٹھے سب مسافروں نے اپنے اِدھر اُدھر بیٹھے لوگوں کا جائزہ لیا ہے۔ سردار جی اٹھ کر میری سیٹ پر آ بیٹھے۔ نیچے والی سیٹ پر بیٹھا پٹھان اٹھا اور اپنے دو ساتھی پٹھانوں کے ساتھ اوپر والی برتھ پر چڑھ گیا۔ یہی عمل شاید ریل گاڑی کے دوسرے ڈبوں میں بھی جاری تھا۔ اب ڈبے میں تناؤ آ گیا۔ لوگوں نے بات چیت بند کر دی۔ تینوں کے تینوں پٹھان اوپر والی برتھ پر ساتھ ساتھ بیٹھے چپ چاپ نیچے دیکھے جا رہے تھے۔ تمام مسافروں کی آنکھیں پہلے سے زیادہ کھلی کھلی اور شک بھری نظر آنے لگیں۔ یہی صورتِ حال شاید گاڑی کے سبھی ڈبوں میں پیدا ہو رہی تھی۔

"کون سا اسٹیشن تھا یہ؟" ڈبے میں کسی نے پوچھا۔

"وزیر آباد،" کسی نے جواب دیا۔

جواب ملنے پر ڈبے میں ایک دوسرا ردِ عمل ہوا۔ پٹھانوں کے دل کا تناؤ فوراً ڈھیلا پڑ گیا، جب کہ ہندو سکھ مسافروں کی خاموشی اور زیادہ گہری ہو گئی۔ ایک پٹھان نے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے نسوار کی ڈبیا نکالی اور ناک میں نسوار چڑھانے لگا۔ دوسرے پٹھان بھی اپنی اپنی ڈبیا نکال کر نسوار چڑھانے لگے۔ بڑھیا برابر مالا جپے جا رہی تھی۔ کسی کسی وقت اُس کے بُدبُداتے ہونٹ نظر آتے، لگتا اُن میں سے کوئی کھوکھلی سی آواز نکل رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو وہاں بھی سناٹا تھا۔ کوئی پرندہ تک نہیں پھڑک رہا تھا۔ ہاں، ایک بھشتی بیٹھ پر پانی کی مشک لادے، پلیٹ فارم لانگھ کر آیا اور مسافروں کو پانی پلانے لگا۔

"لو پیو پانی، پانی پیو۔" زنانہ ڈبے میں سے عورتوں اور بچوں کے کئی ہاتھ باہر نکل آئے تھے۔

"بہت مار کاٹ ہوئی ہے، بہت لوگ مرے ہیں۔" لگتا تھا یہ اس مار کاٹ میں اکیلا ثواب کمانے چلا آیا تھا۔

گاڑی سرکی تو فوراً کھڑکیوں کے پلّے چڑھائے جانے لگے۔ دور دور تک پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ کھڑکیوں کے پلّے چڑھانے کی آواز آنے لگی۔

کسی نامعلوم خطرے کے احساس تلے دُبلا بابو میرے پاس والی سیٹ سے اٹھا اور دو سیٹوں کے درمیان فرش پر لیٹ گیا۔ اُس کا چہرہ اب بھی مُردے کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔ اس پر برتھ پر بیٹھا پٹھان اس کا مذاق اڑانے لگا۔ "او بے غیرت، تم مرد اے کہ عورت اے؟ سیٹ سے اُٹھ کر نیچے لیٹتا اے۔ تم مرد کے نام کو بدنام کرتا اے!" وہ بار بار بول رہا تھا اور بار بار ہنسے جا رہا تھا۔ پھر پشتو میں کچھ کہنے لگا۔ بابو چپ چاپ لیٹا رہا۔ دوسرے تمام مسافر بھی چپ تھے۔ ڈبے کا ماحول بوجھل ہو گیا تھا۔

"ایسے آدمی کو ام ڈبے میں بیٹھنے نئیں دے گا۔ او بابو، تم اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤ اور زنانہ ڈبے میں بیٹھو۔"

مگر اب بابو کی حاضر جوابی اس کے گلے میں سوکھ چکی تھی۔ وہ ہکلا کر چپ ہو رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ اپنے آپ سیٹ پر جا بیٹھا اور دیر تک اپنے کپڑوں کی دھول جھاڑتا رہا۔ وہ فرش پر کیوں لیٹ گیا تھا؟ شاید اُسے ڈر تھا کہ باہر سے گاڑی پر پتھراؤ ہو گا یا گولی چلے گی۔ شاید اسی خوف سے کھڑکیوں کے پلّے بھی چڑھائے جا رہے تھے۔

کچھ بھی کہنا مشکل تھا۔ ممکن ہے کسی ایک مسافر نے کسی وجہ سے کھڑکی کا پلّا چڑھایا ہو اور پھر اُس کی دیکھا دیکھی، بلا سوچے سمجھے، دھڑادھڑ کھڑکیوں کے پلّے چڑھائے جانے لگے ہوں۔

بوجھل اور غیر یقینی سے ماحول میں سفر کٹنے لگا۔ رات گہری ہوتی گئی۔ ڈبے کے مسافر خاموش اور خوف زدہ، جوں کے توں بیٹھے تھے۔ کبھی گاڑی کی رفتار اچانک ٹوٹ کر دھیمی پڑ جاتی تو لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے۔ اور کبھی راستے میں رک جاتی تو ڈبے کے اندر کا سناٹا اور بھی گہرا ہو جاتا۔ صرف پٹھان بے فکر بیٹھے تھے۔ ہاں، بات چیت کرنا انھوں نے بھی چھوڑ دیا تھا، کیوں کہ اب اُن کی بات چیت میں کوئی بھی شامل ہونے والا نہیں تھا۔

دھیرے دھیرے پٹھان اونگھنے لگے، جب کہ دوسرے مسافر پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھور رہے تھے۔ بڑھیا منہ سر لپیٹے، پاؤں سیٹ پر رکھے بیٹھی بیٹھی سو گئی تھی۔ اوپر والی برتھ پر ایک پٹھان نے ادھ لیٹے ہی کرتے کی جیب میں سے کالے منکوں کی تسبیح نکال لی اور اُسے دھیرے دھیرے ہاتھ میں چلانے لگا۔

Scanned with CamScanner

کھڑکی کے اوپر آسمان میں چاند نکل آیا تھا اور چاندنی میں باہر کی دنیا اور بھی زیادہ غیر یقینی، اور پُراسرار ہو گئی تھی۔ کسی کسی وقت دور کسی طرف آگ کے شعلے اٹھتے نظر آتے، کوئی نگر جل رہا تھا۔ گاڑی کسی وقت چنگھاڑتی ہوئی آگے بڑھنے لگتی، پھر کسی وقت اس کی رفتار دھیمی پڑ جاتی اور میلوں تک دھیمی رفتار ہی سے چلتی رہتی۔

اچانک دبلا بابو کھڑکی میں سے باہر دیکھ کر اونچی آواز میں بولا، "ہر بنس پورہ گزر گیا ہے۔" اُس کی آواز میں جوش تھا، وہ جیسے چیخ کر بولا تھا۔ ڈبے کے سبھی لوگ اُس کی آواز سن کر چونک گئے۔ اُس وقت ایسا لگا جیسے ڈبے کے زیادہ تر مسافروں نے اس کی آواز ہی کو سن کر کروٹ بدلی ہو۔

"خو بابو، چلاتا کیوں اے؟" تسبیح والا پٹھان چونک کر بولا۔ "ادر اترے گا تم؟ زنجیر کھینچوں؟" اور کھی کھی کر کے ہنس دیا۔ ظاہر ہے وہ ہر بنس پورہ کے حالات سے بلکہ اس کے نام تک سے ناواقف تھا۔

بابو نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف سر ہلا کر ایک آدھ بار پٹھان کی طرف دیکھا اور پھر کھڑکی کے باہر جھانکنے لگا۔

ڈبے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ تبھی انجن نے سیٹی دی اور ایک دم اس کی رفتار ٹوٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک کھٹاک کی سی آواز سنائی دی، شاید گاڑی نے لائن بدلی تھی۔ بابو نے جھانک کر اُس سمت میں دیکھا جدھر گاڑی چلی جا رہی تھی۔

"شہر آ گیا ہے!" وہ پھر اونچی آواز میں چلایا۔ "امرتسر آ گیا ہے!" اس نے پھر سے کہا اور اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اوپر والی برتھ پر لیٹے پٹھان کو مخاطب کر کے کہا، "او بے پٹھان کے بچے! نیچے اُتر تیری ماں کی--- نیچے اُتر، تیری اُس پٹھان بنانے والے کی میں---"

بابو چلانے لگا تھا اور چیخ چیخ کر گالیاں بکنے لگا تھا۔ تسبیح والے پٹھان نے کروٹ بدلی اور بابو کی طرف دیکھ کر بولا، "او کیا اے بابو؟ ام کو کچھ بولا؟"

بابو کو جوش میں دیکھ کر دوسرے مسافر بھی اٹھ بیٹھے۔

"نیچے اُتر، تیری میں--- ہندو عورت کو لات مارتا ہے، حرام زادے، تیری اُس---"

"اے بابو، بک بک مت کرو۔ او خنزیر کے تخم، گالی مت بکو، ام نے بول دیا۔ ام تمارا زبان کھینچ لے گا۔"

"گالی دیتا ہے مادر---" بابو چلایا اور اُچھل کر سیٹ پر چڑھ گیا۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔

"بس بس،" سردار جی بولے، "یہ لڑنے کی جگہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کا سفر باقی ہے، آرام سے بیٹھو۔"

"تیری میں لات نہ توڑوں تو کہنا۔ گاڑی تیرے باپ کی ہے؟" بابو چلایا۔

"او ام نے کیا بولا۔ سب لوگ اُس کو نکالتا تا، ام نے بی نکالا۔ یہ ادر ام کو گالی دیتا اے۔ ام اس کا زبان کھینچ لے گا۔"

Scanned with CamScanner

بڑھیا بیچ میں پھر بول اٹھی، "اے جیئن جوگیو، آرام نال بیٹھو۔ اے رب دیو بندیو، کجھ ہوش کرو!" اس کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے اور ان میں سے ہلکی سی پھسپھاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

بابو چلائے جا رہا تھا، "اپنے گھر میں شیر بنتا تھا۔ اب بول، تیری میں اُس پٹھان بنانے والے کی---"

تب ہی گاڑی امرتسر کے پلیٹ فارم پر رکی۔ پلیٹ فارم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جو جھانک جھانک کر ڈبوں کے اندر دیکھنے لگے۔ لوگ بار بار ایک ہی سوال پوچھ رہے تھے: پیچھے کیا ہوا ہے؟ کہاں پر فساد ہوا ہے؟

کھچا کھچ بھرے پلیٹ فارم پر شاید اسی بات کا ذکر تھا کہ پیچھے کیا ہوا ہے۔ پلیٹ فارم پر کھڑے دو تین خوانچے والوں پر مسافر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ سبھی کو اچانک بھوک پیاس پریشان کرنے لگی تھی۔ اسی دوران تین چار پٹھان ہمارے ڈبے کے باہر دکھائی دیے اور کھڑکی میں سے جھانک جھانک کر اندر دیکھنے لگے۔ اپنے پٹھان ساتھیوں پر نظر پڑتے ہی وہ اُن سے پشتو میں کچھ بولنے لگے۔ میں نے گھوم کر دیکھا، بابو ڈبے میں نہیں تھا۔ نہ جانے کب وہ ڈبے سے نکل گیا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ غصے میں پاگل ہوا جا رہا تھا، نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ مگر اسی دوران ڈبے کے تینوں پٹھان اپنی اپنی گٹھری اٹھا کر باہر نکل گئے اور اپنے پٹھان ساتھیوں کے ساتھ گاڑی کے کسی اگلے ڈبے کی طرف بڑھ گئے۔ جو تقسیم پہلے ہر ایک ڈبے کے اندر ہوتی رہی تھی، اب وہ پوری گاڑی کی سطح پر ہو رہی تھی۔

خوانچے والوں کے ارد گرد بھیڑ چھٹنے لگی۔ لوگ اپنے اپنے ڈبوں کی طرف لوٹنے لگے۔ اچانک مجھے ایک طرف سے وہ وابو آتا دکھائی دیا۔ اُس کا چہرہ اب بھی زرد تھا اور ماتھے پر بالوں کی لٹ جھول رہی تھی۔ نزدیک پہنچا تو میں نے دیکھا، اس نے اپنے بائیں ہاتھ میں لوہے کی ایک سلاخ اٹھا رکھی تھی۔ جانے وہ اُسے کہاں سے مل گئی تھی۔ ڈبے میں گھستے وقت اُس نے سلاخ کو اپنی پیٹھ کے پیچھے کر لیا اور ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے آہستہ سے سیٹ کے نیچے سرکا دیا۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اُس کی آنکھیں پٹھان کی تلاش میں اوپر کو اُٹھیں، لیکن ڈبے میں پٹھانوں کو نہ پا کر وہ ہڑبڑا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"نکل گئے حرامی، مادر--- سب کے سب نکل گئے!" پھر وہ سٹپٹا کر اٹھ کھڑا ہوا اور چلا کر بولا، "تم نے اُن کو جانے کیوں دیا؟ تم سب نامرد ہو، بزدل!"

گاڑی میں بہت بھیڑ تھی، بہت سے نئے مسافر آ گئے تھے۔ کسی نے اُس کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔

گاڑی سرکنے لگی تو وہ پھر میری بغل والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ وہ بہت جوش میں تھا اور بڑبڑائے جا رہا تھا۔

دھیرے دھیرے ہچکولے کھاتی گاڑی آگے بڑھنے لگی۔ ڈبے کے پرانے مسافروں نے پیٹ بھر کر پوریاں کھا لی تھیں اور پانی پی لیا تھا۔ اب گاڑی اُس علاقے میں آگے بڑھنے لگی تھی جہاں اُن کے جان و

مال کو خطرہ نہیں تھا۔

نئے مسافر باتوں میں مصروف تھے۔ دھیرے دھیرے گاڑی اپنی عام رفتار سے چلنے لگی تھی اور کچھ ہی دیر بعد لوگ اونگھنے بھی لگے تھے۔ مگر بابو اب بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے کی طرف دیکھے جا رہا تھا اور بار بار مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ پٹھان ڈبے میں سے نکل کر کس طرف گئے ہیں۔ اُس کے سر پر جنون سوار تھا۔

گاڑی کے ہچکولوں میں مَیں خود اونگھنے لگا تھا۔ ڈبے میں لیٹنے کی جگہ نہیں تھی۔ بیٹھے بیٹھے ہی نیند میں میرا سر کبھی ایک طرف کو لڑھک جاتا اور کبھی دوسری طرف۔ کسی کسی وقت جھٹکے سے میری نیند ٹوٹتی اور مجھے سامنے کی سیٹ پر بے پروائی سے پڑے سردار جی کے خرّاٹے سنائی دیتے۔ امرتسر پہنچنے کے بعد سردار جی پھر سے سامنے کی سیٹ پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گئے تھے۔ ڈبے میں طرح طرح کی آڑی ترچھی حالتوں میں مسافر پڑے تھے۔ اُن کی یہ بے ترتیب کیفیت کو دیکھ کر لگتا جیسے ڈبا لاشوں سے بھرا ہو۔ پاس بیٹھے بابو پر نظر پڑتی تو کبھی وہ کھڑکی سے باہر منہ کیے ہوتا تو کبھی دیوار سے پیٹھ لگائے تن کر بیٹھا نظر آتا۔

کسی کسی وقت جب گاڑی کسی اسٹیشن پر رکتی تو پہیوں کی گڑگڑاہٹ بند ہو کر خاموشی چھا جاتی۔ اُس وقت یوں لگتا جیسے پلیٹ فارم پر کچھ گرا ہے یا جیسے کوئی مسافر گاڑی سے اترا ہے، اور میں جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

اسی طرح ایک بار جب میری نیند ٹوٹی تو گاڑی کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی اور ڈبے میں اندھیرا تھا۔ میں نے اُسی طرح اَدھ لیٹے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ دور، پیچھے کی طرف، کسی اسٹیشن کے سگنل کے لال قمقمے چمک رہے تھے۔ ظاہر ہے گاڑی کسی اسٹیشن سے گزر کر آئی تھی لیکن ابھی تک اُس نے رفتار نہیں پکڑی تھی۔

ڈبے کے باہر مجھے دھیمی سی، مبہم آوازیں سنائی دیں۔ دور ایک دھندلا سا کالا ہیولا نظر آیا۔ نیند کے خمار میں کچھ دیر میری نظریں اُس پر جمی رہیں، پھر میں نے اُسے سمجھ پانے کا خیال چھوڑ دیا۔ ڈبے کے اندر اندھیرا تھا، بتیاں بجھی ہوئی تھیں، لیکن باہر لگتا تھا پو پھٹنے لگی ہے۔

میری پیٹھ پیچھے، ڈبے کے باہر، کسی چیز کے کھُرچنے کی سی آواز آئی۔ میں نے دروازے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ ڈبے کا دروازہ بند تھا۔ مجھے پھر دروازہ کھرچنے کی آواز سنائی دی۔ پھر میں نے صاف صاف سنا، لاٹھی سے کوئی آدمی ڈبے کا دروازہ پیٹ رہا تھا۔ میں نے جھانک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سچ مچ ایک آدمی ڈبے کی دو سیڑھیاں چڑھ آیا تھا۔ اُس کے کندھے پر ایک گٹھری جھُول رہی تھی اور ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اُس نے بدرنگ سے کپڑے پہن رکھے تھے اور اس کے داڑھی تھی۔ پھر جب میری نظر باہر نیچے کی طرف گئی تو دیکھا، گاڑی کے ساتھ ساتھ ایک عورت ننگے پاؤں بھاگتی آ رہی تھی۔ اُس نے دو گٹھریاں اٹھا رکھی تھیں۔ بوجھ کی وجہ سے اُس سے دوڑا نہیں جا رہا تھا۔ ڈبے کے پائیدان پر کھڑا آدمی

Scanned with CamScanner

بار بار اُس کی طرف مڑ کر دیکھ رہا تھا اور ہانپتا ہوا کہے جا رہا تھا، "آجا، آجا، تو بھی چڑھ جا!"

دروازے پر پھر لاٹھی پٹپٹانے کی آواز آئی۔ "کھولو جی دروازہ، خدا کے واسطے دروازہ کھولو۔"

وہ آدمی ہانپ رہا تھا۔ "خدا کے لیے دروازہ کھولو۔ میرے ساتھ عورت ذات ہے۔ گاڑی نکل جائے گی۔۔۔"

اچانک میں نے دیکھا، بابو ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کے پاس جا کر، دروازے میں لگی ہوئی کھڑکی سے منہ باہر نکال کر بولا، "کون ہے؟ ادھر جگہ نہیں ہے۔" باہر کھڑا آدمی پھر گڑگڑانے لگا، "خدا کے واسطے، گاڑی نکل جائے گی۔۔۔" اور کھڑکی میں سے اپنا ہاتھ اندر ڈال کر دروازہ کھولنے کے لیے چٹخنی ٹٹولنے لگا۔

"نہیں ہے جگہ، بول دیا! اُتر جاؤ گاڑی پر سے۔۔۔" بابو چلایا، اور اُسی لمحے لپک کر دروازہ کھول دیا۔

"یااللہ!" اُس آدمی کی مبہم سی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلنے پر جیسے اُس نے اطمینان کا سانس لیا ہو۔

اور اُسی وقت میں نے بابو کے ہاتھ میں لوہے کی سلاخ کو چمکتے ہوئے دیکھا۔ ایک ہی بھرپور وار بابو نے اُس مسافر کے سر پر کیا تھا۔ میں دیکھتے ہی ڈر گیا اور میری ٹانگیں لرز گئیں۔ مجھے لگا سلاخ کے وار کا اُس آدمی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُس کے دونوں ہاتھ اب بھی زور سے دروازے کے ہینڈل کو پکڑے ہوئے تھے۔ کندھے پر لٹکتی ہوئی گٹھری کھسک کر اُس کی کہنی پر آ گئی تھی۔

اچانک اُس کے چہرے پر خون کی دو تین دھاریں ایک ساتھ پھوٹ پڑیں۔ جھٹ پٹے میں مجھے اُس کے کھلے ہونٹ اور چمکتے دانت نظر آئے۔ وہ دو ایک بار "یااللہ!" بڑبڑایا، پھر اُس کے پیر لڑکھڑا گئے۔ اُس کی آنکھوں نے بابو کی طرف دیکھا، آدھ مُندی سی آنکھیں جو دھیرے دھیرے سکڑتی جا رہی تھیں گویا اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں کہ وہ کون ہے اور اُس سے کس عداوت کا بدلہ لے رہا ہے۔ اس دوران اندھیرا کچھ اَور گہرا ہو گیا تھا۔ اُس کے ہونٹ پھر سے پھڑپھڑائے اور سفید دانت جھلکنے لگے۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ مسکرایا ہو، لیکن حقیقت میں صدمے کی وجہ سے اُس کے ہونٹوں پر بل پڑنے لگے تھے۔

نیچے پٹڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتی ہوئی عورت کوستی جا رہی تھی۔ اُسے ابھی تک معلوم نہیں ہو پایا تھا کہ ہوا کیا ہے۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ شاید گٹھری کی وجہ سے اُس کا شوہر گاڑی پر ٹھیک طرح چڑھ نہیں پا رہا اور اس کا پیر جم نہیں رہا۔ وہ گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتی ہوئی، اپنی دو گٹھریوں کے باوجود، اپنے شوہر کے پیر کو پکڑ پکڑ کر پائیدان پر ٹکانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک اُس آدمی کے دونوں ہاتھ ڈبے کے ہینڈل سے چھوٹ گئے اور وہ۔ کٹے ہوئے درخت کی طرح نیچے جا گرا۔ اُس کے گرتے ہی عورت نے بھاگنا بند کر دیا، جیسے دونوں کا سفر ایک ساتھ ہی ختم ہو گیا ہو۔

بابو اب بھی میرے قریب ڈبے کے کھلے دروازے میں بُت بنا کھڑا تھا۔ لوہے کی سلاخ اُسی طرح اس کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ سلاخ کو پھینک دینا چاہتا ہے لیکن پھینک نہیں پا رہا، اُس کا ہاتھ جیسے

Scanned with CamScanner

اُٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی اور ڈبے کے اندھیرے کونے میں کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوا میں اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

پھر وہ کھڑے کھڑے بلا اور کسی انجانی قوت کے بس میں آ کر وہ ایک قدم آگے بڑھ آیا اور دروازے میں سے باہر، پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ گاڑی آگے نکلتی جا رہی تھی۔ دور پٹری کے کنارے اندھیرا ابھیولا سا نظر آ رہا تھا۔

بابو کا جسم حرکت میں آیا۔ ایک جھٹکے سے اُس نے لوہے کی سلاخ کو ڈبے سے باہر پھینک دیا۔ پھر گھوم کر ڈبے کے اندر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ سب مسافر سوئے پڑے تھے۔ میری طرف اُس کی نظر نہیں اٹھی۔

تھوڑی دیر تک وہ وہیں کھڑا رہا، پھر اس نے گھوم کر دروازہ بند کر دیا۔ اُس نے غور سے اپنے کپڑوں کو دیکھا، دونوں ہاتھوں کو دیکھا، پھر باری باری اپنے ہاتھوں کو ناک کے قریب لا کر سونگھا، جیسے جاننا چاہتا ہو کہ کہیں اس کے ہاتھوں میں سے خون کی بُو تو نہیں آ رہی۔ پھر وہ دبے پاؤں چلتا ہوا آ کر میری بغل والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

دھیرے دھیرے دھندلکا چھٹنے لگا اور صبح پھوٹ پڑی۔ چاروں طرف روشنی پھیلنے لگی۔ کسی نے زنجیر کھینچ کر گاڑی کو نہیں روکا تھا اور لوہے کی سلاخ کی چوٹ کھا کر گری ہوئی اُس آدمی کی لاش میلوں پیچھے رہ گئی تھی۔ سامنے گیہوں کے کھیتوں میں پھر وہی ہلکی ہلکی لہریں سی اٹھتی نظر آنے لگی تھیں۔

سردار جی اپنا بدن کھجلاتے اٹھ بیٹھے۔ میری بغل میں بیٹھا بابو اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے سامنے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ رات بھر میں اُس کے چہرے پر داڑھی کے چھوٹے چھوٹے بال بھی اُگ آئے تھے۔ اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر سردار جی اس سے باتیں کرنے لگے۔ "بڑے جی دار ہو بابو، دبلے پتلے ہو لیکن ہو بڑے دل والے۔ بڑی ہمت دکھائی تم نے۔ تم سے ڈر کر ہی وہ پٹھان ڈبے میں سے نکل گئے۔ یہاں رہتے تو ایک نہ ایک کی کھوپڑی تم ضرور درست کر دیتے۔" اور سردار جی ہنسنے لگے۔

جواب میں بابو مسکرایا، ایک خوف ناک مسکراہٹ، اور دیر تک سردار جی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

**

نرمل ورما

ہندی سے ترجمہ: خورشید قائم خانی۔ تاج قائم خانی

ایک دن کا مہمان

اُس نے اپنا سوٹ کیس دروازے کے آگے رکھ دیا۔ گھنٹی کا بٹن دبایا اور انتظار کرنے لگا۔ مکان میں خاموشی تھی۔ کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے اُسے گمان ہوا کہ شاید گھر میں کوئی نہیں ہے اور وہ خالی مکان کے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے رومال نکال کر پسینا پونچھا، اپنا ایر بیگ سوٹ کیس کے اوپر رکھ دیا۔ دوبارہ بٹن دبایا اور کان لگا کر سننے لگا۔ برآمدے کے پیچھے کوئی کھلی کھڑکی ہوا میں ہچکولے کھا رہی تھی۔

وہ پیچھے ہٹ کر اوپر دیکھنے لگا۔ وہ دومنزلہ مکان تھا۔ گلی کے دوسرے مکانوں کی طرح، کالی چھت، انگریزی کے "وی" کی شکل میں دونوں طرف سے ڈھلان والا، اور بیچ میں پتھر کی دیوار جس کی پیشانی پر مکان کا نمبر ایک کالی بندی کی طرح چمک رہا تھا۔ اوپر کی کھڑکیاں بند تھیں اور پردے گرے ہوئے تھے۔ کہاں جا سکتے ہیں اِس وقت؟ اس نے سوچا۔

وہ مکان کے پچھواڑے گیا۔ وہی لان، فینس اور جھاڑیاں تھیں جو اُس نے دو سال پہلے دیکھی تھیں۔ بیچ میں ولو اپنی ٹہنیاں جھکائے کسی کالے بوڑھے ریچھ کی طرح اُونگھ رہا تھا۔ لیکن گراج کھلا اور خالی پڑا تھا۔ وہ کار میں کہیں گئے تھے۔ ممکن ہے انھوں نے ساری صبح اُس کا انتظار کیا ہو اور اب کسی کام سے باہر نکل گئے ہوں۔ لیکن دروازے پر اُس کے لیے ایک چِٹ تو چھوڑ ہی سکتے تھے۔

وہ پھر سامنے کے دروازے پر لوٹ آیا۔ اگست کی چلچلاتی دھوپ اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ سارا جسم پسینے سے چُور رہا تھا۔ وہ برآمدے ہی میں اپنے سوٹ کیس پر بیٹھ گیا۔ اچانک اُسے لگا سڑک کے پار مکانوں کی کھڑکیوں سے کچھ چہرے باہر جھانک رہے ہیں، اُسے دیکھ رہے ہیں۔ اُس نے سنا تھا انگریز لوگ دوسروں کی نجی چِنتاؤں میں دخل نہیں دیتے، لیکن وہ مکان سے باہر برآمدے میں بیٹھا تھا جہاں

Scanned with CamScanner

پرائیویسی کا کوئی مطلب نہیں تھا؛ اسی لیے وہ لوگ بلا جھجکے، پوری بے باکی سے اُسے گھور رہے تھے۔ لیکن شاید اُن کے تجسس کی ایک دوسری وجہ تھی؛ اُس چھوٹے سے انگریزی قصباتی شہر میں لگ بھگ سب ایک دوسرے کو پہچانتے تھے اور وہ نہ صرف اپنی شکل صورت سے بلکہ ڈھیلے ڈھالے ہندوستانی سوٹ میں کافی عجیب مخلوق دکھائی دے رہا ہوگا۔ اس کے تڑے مڑے لباس اور گرد اور پسینے سے لت پت چہرے سے کوئی یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ ابھی تین دن پہلے اس نے فرینکفرٹ کی کانفرنس میں پیپر پڑھا تھا۔ میں ایک لُٹا پٹا ایشین امیگرینٹ دکھائی دے رہا ہوں گا، اس نے سوچا اور اچانک کھڑا ہو گیا۔ جیسے کھڑے ہو کر انتظار کرنا زیادہ آسان ہو۔ اس بار بنا سوچے سمجھے اس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک دم ہکا بکا ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہاتھ لگتے ہی دروازہ پٹ سے کھل گیا تھا۔ سیڑھیوں پر پیروں کی چاپ سنائی دی۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ اُس کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئی تھی اور اُس سے چمٹ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پوچھتا، "کیا تم اندر تھیں؟" اور وہ پوچھتی، "تم باہر کھڑے تھے؟"، اس نے اپنے دھول بھرے قسم پشتم ہاتھوں سے اس کے دبلے کندھوں کو پکڑ لیا اور لڑکی کا سر نیچے جھک آیا اور اس نے اپنا منہ اس کے بالوں پر رکھ دیا۔

پڑوسیوں نے ایک ایک کر کے اپنی کھڑکیاں بند کر دیں۔

لڑکی نے دھیرے سے اُسے اپنے سے الگ کر دیا۔ "باہر کب سے کھڑے تھے؟"

"پچھلے دو سال سے۔"

"واہ!" لڑکی ہنسنے لگی۔ اسے اپنے باپ کی ایسی ہی باتیں بوڑھم جان پڑتی تھیں۔

"میں نے دو بار گھنٹی بجائی۔ تم لوگ کہاں تھے؟"

"گھنٹی خراب ہے۔ اسی لیے میں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔"

"تمہیں مجھے فون پر بتانا چاہیے تھا۔ میں پچھلے ایک گھنٹے سے آگے پیچھے دوڑ رہا ہوں۔"

"میں آپ تمہیں بتانے والی تھی، لیکن بیچ میں لائن کٹ گئی۔ تم نے اور پیسے کیوں نہیں ڈالے؟"

"میرے پاس صرف دس پیسے تھے۔۔۔ وہ عورت کافی چڑیل تھی۔"

"کون عورت؟" لڑکی نے اُس کا بیگ اٹھایا۔

"وہی جس نے ہمیں بیچ میں کاٹ دیا۔"

آدمی اپنا سوٹ کیس بیچ ڈرائنگ روم میں گھسیٹ لایا۔ لڑکی شوق سے بیگ کے اندر جھانک رہی تھی۔ سگریٹ کے پیکٹ، اسکاچ کی لمبی بوتل، چاکلیٹ کے بنڈل ۔۔ وہ ساری چیزیں جو اس نے اتنی ہڑبڑی میں فرینکفرٹ کے ایرپورٹ پر ڈیوٹی فری شاپ سے خریدی تھیں، اب بیگ سے اوپر جھانک رہی تھیں۔

"تم نے اپنے بال کٹوا لیے؟" آدمی نے پہلی بار چین سے لڑکی کا چہرہ دیکھا۔
"ہاں، صرف چھٹیوں کے لیے۔ کیسے لگتے ہیں؟"
"اگر تم میری بیٹی نہ ہوتیں تو میں سمجھتا کوئی لفنگی گھر میں گھس آئی ہے۔"
"اوہ پاپا!" لڑکی نے ہنستے ہوئے بیگ سے چاکلیٹ نکالی، ریپر کھولا، پھر اُس کی طرف بڑھا دی۔
"سوئس چاکلیٹ،" اس نے اسے ہوا میں جھلاتے ہوئے کہا۔
"میرے لیے ایک گلاس پانی لا سکتی ہو؟"
"ٹھہرو، میں چائے بناتی ہوں۔"
"چائے بعد میں---" وہ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں کچھ ٹٹولنے لگا -- نوٹ بک، والٹ، پاسپورٹ، سب چیزیں باہر نکل آئیں، آخر میں اسے ٹیبلٹس کی ڈبیا ملی جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا۔
لڑکی پانی کا گلاس لے کر آئی اور اس سے پوچھا، "کیسی دوائی ہے؟"
"جرمن،" اس نے کہا۔ "بہت اثر کرتی ہے۔"
اس نے ٹیبلٹ پانی کے ساتھ نگل لی، پھر سوفے پر بیٹھ گیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا اُس نے سوچا تھا: وہی کمرہ، شیشے کا دروازہ، کھلے ہوئے پردوں کے درمیان سے نظر آتا وہی چوکور ہرے رومال جیسا لان، ٹی وی کے اسکرین پر اُڑتے ہوئے پرندوں کا سایہ جو باہر اُڑتے تھے پر گمان یہ ہوتا تھا جیسے اندر ہی ہوں۔
وہ کچن کی دہلیز پر آیا۔ گیس کے چولھوں کے پیچھے لڑکی کی پیٹھ دکھائی دے رہی تھی۔ کاڈرائے کی کالی جینز اور سفید قمیص جس کی آستینیں کہنیوں پر جھول رہی تھیں۔ وہ بہت ہلکی پھلکی اور چھوئی موئی سی دکھائی دے رہی تھی۔
"ماما کہاں ہیں؟" اُس نے پوچھا۔ شاید اُس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ لڑکی نے اسے نہیں سنا، لیکن اُسے لگا جیسے لڑکی کی گردن کچھ اوپر اٹھی تھی۔ "ماما کیا اوپر ہیں؟" اس نے دوبارہ کہا اور لڑکی ویسے ہی ساکت کھڑی رہی تو اُسے یوں لگا کہ اُس نے پہلی دفعہ بھی اس کے سوال کو سن لیا تھا۔
"کیا وہ باہر گئی ہیں؟" اُس نے پوچھا۔ لڑکی نے بہت دھیرے، ہلکے انداز میں سر ہلایا، جس کا مطلب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔
"پاپا، تم کچھ میری مدد کرو گے؟"
وہ لپک کر کچن میں چلا آیا۔ "بتاؤ، کیا کام ہے؟"
"تم چائے کی کیتلی لے کر اندر جاؤ، میں ابھی آتی ہوں۔"
"بس!" اس نے مایوس سے لہجے میں کہا۔
"ہاں، پیالے اور پلیٹیں بھی لیتے جاؤ۔"
وہ سب چیزیں لے کر اندر کمرے میں چلا آیا۔ وہ دوبارہ کچن میں جانا چاہتا تھا لیکن لڑکی کے ڈر سے وہیں سوفے پر بیٹھا رہا۔ کچن سے کچھ تلنے کی خوشبو آ رہی تھی۔ لڑکی اُس کے لیے کچھ بنا رہی تھی، اور وہ اس

Scanned with CamScanner

کی کوئی مدد نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک بار خیال آیا کچن میں جا کر اُسے منع کر آئے کہ وہ کچھ نہیں کھائے گا، لیکن دوسرے ہی لمحے بھوک نے اُسے پکڑ لیا۔ صبح سے اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بوسٹن اسٹیشن کے کیفے ٹیریا میں اتنی لمبی کیو لگی تھی کہ وہ ٹکٹ لے کر سیدھا ٹرین میں گھس گیا تھا۔ سوچا تھا ڈائننگ کار میں کچھ کھا پی لے گا، لیکن وہ دوپہر سے پہلے نہیں کھلتی تھی۔ سچ پوچھا جائے تو اُس نے آخری کھانا کل شام فرینکفرٹ میں کھایا تھا اور جب رات کو لندن پہنچا تو اپنے ہوٹل کی بار میں پیتا رہا تھا۔ تیسرے گلاس کے بعد اُس نے جیب سے نوٹ بک نکالی، نمبر دیکھا اور باہر کے ٹیلی فون بُوتھ میں جا کر فون ملایا۔ پہلی دفعہ میں پتا نہیں چلا، اس کی بیوی کی آواز ہے یا بچی کی۔ اُس کی بیوی نے فون اٹھایا ہو گا، کیوں کہ کچھ دیر تک فون کا سناٹا اُس کے کان میں جھنجھناتا رہا تھا۔ پھر اُس نے سنا وہ اوپر سے بچی کو بلا رہی ہے۔ اور اُسی وقت اس نے گھڑی دیکھی۔ اسے خیال آیا، اس وقت وہ سو رہی ہو گی۔ وہ فون نیچے رکھنا چاہتا تھا کہ اسی وقت اسے بچی کی آواز سنائی دی۔ وہ آدھی نیند میں تھی؛ کچھ دیر تک اُسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ انڈیا سے بول رہا ہے یا فرینکفرٹ یا لندن سے۔ وہ اُسے اپنی جگہ بتا ہی رہا تھا کہ تین منٹ ختم ہو گئے، اور اس کے پاس اتنی ریزگاری بھی نہیں تھی کہ لائن کو کٹنے سے بچا سکتا۔ اُسے تسلی صرف اتنی تھی کہ وہ نیند، گھبراہٹ اور نشے کے باوجود یہ بتانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ کل اُن کے شہر پہنچ رہا ہے۔ کل یعنی آج۔

وہ اچھے لمحے تھے۔ باہر انگلینڈ کی پیلی اور ملائم دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ گھر کے اندر تھا۔ اُس کے دل میں گرمی کی لہریں اٹھنے لگیں۔ ہوائی اڈوں کی بھاگ دوڑ، ہوٹلوں کی حیل حجت، ٹرینوں ٹیکسیوں کی ہڑبڑاہٹ --- وہ ان سب سے دور ہو گیا تھا۔ وہ گھر کے اندر تھا؛ اپنا خود کا گھر نہ سہی، پھر بھی ایک گھر۔ کھڑکیاں، پردے، سوفا، ٹی وی۔ وہ عرصے تک ان چیزوں کے بیچ رہا تھا اور ہر چیز کی تاریخ سے واقف تھا۔ ہر دو تین سال بعد جب وہ آتا تو سوچتا تھا، بچی کتنی بڑی ہو گئی ہو گی۔ اور بیوی؟ وہ کتنی بدل گئی ہو گی! لیکن یہ چیزیں اُس دن سے ایک ہی جگہ ٹھہر گئی تھیں جس دن اس نے گھر چھوڑا تھا۔ گویا وہ اُس کے ساتھ جاتی تھیں اور ساتھ ہی لوٹ آتی تھیں۔

"پاپا، تم نے چائے نہیں ڈالی؟" وہ کچن سے دو پلیٹیں لے کر آئی۔ ایک میں ٹوسٹ اور مکھن تھا اور دوسری میں تلے ہوئے ساسیجز۔

"میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"چائے ڈالو نہیں تو بالکل ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

وہ اُس کے ساتھ سوفے پر بیٹھ گئی۔ "ٹی وی کھول دوں؟ دیکھو گے؟"

"ابھی نہیں --- سنو، تمہیں میرے اسٹیمپس مل گئے تھے؟"

"ہاں پاپا، تھینکس!" وہ ٹوسٹوں پر مکھن لگا رہی تھی۔

"لیکن تم نے چٹھی ایک بھی نہیں لکھی!"

"میں نے ایک لکھی تھی، لیکن جب تمہارا ٹیلیگرام آیا تو میں نے سوچا، اب تم آ رہے ہو تو چٹھی

بھیجنے کی کیا ضرورت۔"

"تم سچ مچ کا گاہو!"

لڑکی نے اُس کی طرف دیکھا اور ہنسنے لگی۔ یہ اُس کا چڑوالا نام تھا جو باپ نے برسوں پہلے، اُس وقت رکھا تھا جب وہ اُس کے ساتھ گھر میں رہتا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی اور اُس نے ہندوستان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

بچی کی ہنسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اُس کے قریب جھک آیا جیسے وہ کوئی شوخ چڑیا ہو جس کو صرف محفوظ لمحے کے دھوکے میں پکڑا جا سکتا ہو۔

"ممی کب لوٹیں گی؟"

سوال اتنا اچانک تھا کہ لڑکی جھوٹ نہیں بول سکی۔ "وہ اوپر اپنے کمرے میں ہیں۔"

"اوپر؟ لیکن تم نے تو کہا تھا۔۔۔"

کرچ، کرچ، کرچ۔ وہ جلے ہوئے ٹوسٹ کو چاقو سے کرید رہی تھی جیسے اس کے ساتھ ساتھ اُس کے سوال کو بھی کھرچ دینا چاہتی ہو۔

ہنسی اب بھی تھی لیکن اب وہ برف میں جمے ہوئے کیڑے کی طرح اُس کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی تھی۔

"کیا اُنھیں معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں؟"

لڑکی نے ٹوسٹ پر مکھن لگایا، پھر جیم۔ پھر پلیٹ اُس کے سامنے رکھ دی۔

"ہاں، معلوم ہے۔"

"کیا وہ نیچے آ کر ہمارے ساتھ چائے نہیں پئیں گی؟"

لڑکی دوسری پلیٹ میں ساسیج سجانے لگی۔ پھر اُسے کچھ یاد آیا۔ وہ باورچی خانے میں گئی اور اپنے ساتھ مسٹرڈ اور کیچپ کی بوتلیں لے آئی۔

"میں اوپر جا کر پوچھ آتا ہوں۔" اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا جیسے اُس سے اپنی کارروائی کی تائید چاہتا ہو۔ جب وہ کچھ نہیں بولی تو وہ زینے کی طرف جانے لگا۔

"پلیز پاپا!"

اُس کے پاؤں ٹھٹک گئے۔

"آپ پھر اُن سے لڑنا چاہتے ہیں؟" لڑکی نے کچھ غصے سے اُسے دیکھا۔

"لڑنا؟" وہ شرم کے مارے جھینپ کر ہنسنے لگا۔ "میں یہاں دو ہزار میل چل کر ان سے لڑنے آیا ہوں؟"

"پھر آپ میرے پاس بیٹھیے۔" لڑکی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں کی طرف تھی، لیکن باپ کے لیے بھی سنگ دل نہیں تھی۔ وہ اسے پرچاتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ "میں تمھارے پاس

Scanned with CamScanner

ہوں- کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

وہ کھانے لگا، ٹوسٹ، ساسیجز، ٹن کے اُبلے ہوئے مٹر- اُس کی بھوک اُڑ گئی تھی، لیکن لڑکی کی نگاہیں اُس پر لگی تھیں- وہ اُسے دیکھ رہی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی- کبھی کبھی ٹوسٹ کا ایک ٹکڑا منھ میں ڈال لیتی اور پھر چائے پینے لگتی- پھر اُس کی طرف دیکھتی اور چپ چاپ مسکرانے لگتی- اُسے دلاسا دیتی، سب کچھ ٹھیک ہے، تمھاری ذمے داری مجھ پر ہے اور جب تک میں ہوں ڈرنے کی کوئی بات نہیں-

ڈر نہیں تھا- ہاں، ٹیبلٹ کا اثر رہا ہوگا یا پھر سفر کی تھکن- وہ کچھ دیر کے لیے لڑکی کی نظروں کے سامنے سے ہٹنا چاہتا تھا، اپنے آپ کو دور رکھنا چاہتا تھا-

"میں ابھی آتا ہوں،" اُس نے کہا- لڑکی نے شک بھری نظروں سے اُسے دیکھا- "کیا باتھ روم جاؤ گے؟" وہ اُس کے ساتھ ساتھ غسل خانے تک چلی آئی اور جب اُس نے دروازہ بند کرلیا تو بھی اُسے لگا کہ وہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہے-

اُس نے بیسن میں اپنا منھ ڈال دیا اور نلکا کھول دیا- پانی جھر جھر کرتا اُس کے چہرے پر بہنے لگا- وہ سکنے سا لگا، ادھورے سے الفاظ اُس کے کھوکھلے سینے سے باہر نکلنے لگے، جیسے اندر جمی ہوئی کائی باہر نکال رہا ہو- اُلٹی، جو سیدھی دل سے باہر آتی ہے- وہ ٹیبلٹ جو کچھ دیر پہلے کھائی تھی، اب پیلے چورے کی طرح بیسن کے سنگِ مرمر پر تیر رہی تھی- پھر اُس نے نل بند کر دیا اور رومال نکال کر منھ صاف کیا- باتھ روم کی کھونٹی پر عورت کے میلے کپڑے لٹکے ہوئے تھے- پلاسٹک کی ایک چھوٹی بالٹی میں انڈرویئر اور برِیزیئر صابن میں ڈوبے ہوئے تھے- کھڑکی کھلی تھی اور باغ کا پھوارا دھوپ میں چمک رہا تھا- کہیں کسی دوسرے باغ سے گھاس کٹنے کی دھیمی سی گھُرر گھُرر کی آواز قریب آرہی تھی-

وہ جلدی سے باتھ روم کا دروازہ بند کر کے کمرے میں چلا آیا- سارے گھر میں سناٹا تھا- وہ کچن میں آیا تو لڑکی دکھائی نہیں دی- وہ ڈرائنگ روم میں لوٹا تو وہ بھی خالی پڑا تھا- اُسے شک ہوا کہ وہ اوپر والے کمرے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہے- ایک عجیب سے خوف نے اُسے جکڑ لیا- گھر جتنا پُرسکون تھا اُتنا ہی اسے اندیشے سے بھرا ہوا محسوس ہونے لگا- وہ کونے میں گیا جہاں اُس کا سوٹ کیس رکھا تھا- وہ جلدی جلدی اسے کھولنے لگا- اُس نے اپنے کانفرنس کے نوٹس اور کاغذات الگ کیے، اُن کے نیچے سے وہ سارا سامان نکالنے لگا جو دلی سے اپنے ساتھ لایا تھا- ایمپوریم کا راجستھانی لہنگا (لڑکی کے لیے)، تانبے اور پیتل کے ٹرنکٹس جو اُس نے فٹ پاتھ پر تبتی لاماؤں سے خریدے تھے، پشمینے کی کشمیری شال (بچی کی ماں کے لیے)، ایک لال گجراتی زری دار سلیپر جسے بچی اور ماں دونوں پہن سکتے تھے، ہینڈلوم کے بیڈ کور، ہندوستانی ٹکٹوں کا البم، اور ایک بہت بڑی باتصویر کتاب "بنارس دی اٹرنل سٹی"- فرش پر ڈھیرے ڈھیرے ایک چھوٹا سا ہندوستان جمع ہو گیا تھا جسے وہ ہر دفعہ یوروپ جاتے وقت اپنے ساتھ اٹھا لاتا تھا-

اچانک اُس کے ہاتھ ٹھٹھک گئے- وہ کچھ دیر تک چیزوں کے ڈھیر کو دیکھتا رہا- کمرے کے فرش پر پڑی وہ بالکل یتیم اور قابلِ رحم دکھائی دے رہی تھیں- اُس کے دل میں پاگلوں جیسی ایک خواہش پیدا

Scanned with CamScanner

ہوئی کہ وہ ان کو کمرے میں جوں کا توں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہو۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ لڑکی تھوڑا بہت ضرور حیران ہو گی، لیکن وہ بھی برسوں سے ایسے ہی اچانک اُس سے ملتی رہی تھی اور بلاوجہ بچھڑتی بھی رہی تھی۔ "You are a coming and going man"، وہ اُس سے کہا کرتی تھی۔ پہلے ناراضگی سے، اور بعد میں ہنسی مذاق کے طور پر۔ اُسے کمرے میں بیٹھا نہ پا کر لڑکی کو زیادہ صدمہ نہیں ہو گا۔ وہ اوپر جائے گی اور ماں سے کہے گی، "اب تم نیچے آ سکتی ہو۔ وہ چلے گئے۔" پھر وہ دونوں ایک ساتھ نیچے آئیں گی اور انہیں سکون ہو گا کہ اب اُن دونوں کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔

"پاپا!" وہ چونک گیا جیسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ اس نے کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے کی دہلیز پر کھڑی تھی اور کھلے ہوئے سوٹ کیس کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی جادو کی پٹاری ہو جس نے اپنے پیٹ سے اچانک رنگ برنگی چیزوں کو اُلٹ دیا ہو۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں کوئی خوشی نہیں تھی، ایک شرم سی تھی۔ جب بچے اپنے بڑوں کو کوئی ایسی ٹرک کرتے دیکھتے ہیں جس کا راز اُنہیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے تو وہ اپنی جھینپ کو چھپانے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے تاب ہو جاتے ہیں۔

"اتنی چیزیں؟" وہ آدمی کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ "کیسے لانے دیں؟ سنا ہے آج کل کسٹم والے بہت تنگ کرتے ہیں۔"

"نہیں اِس دفعہ انھوں نے کچھ نہیں کیا،" آدمی نے جوش میں آ کر کہا۔ "شاید اس لیے کہ میں سیدھا فرینکفرٹ سے آ رہا تھا۔ اُنہیں صرف ایک چیز پر شک ہوا تھا۔" اس نے مسکراتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا۔

"کس چیز پر؟" لڑکی نے اس بار سچ مچ بے چین ہو کر پوچھا۔

اُس نے اپنے بیگ سے دال سیو کا ڈبا نکالا اور اُسے کھول کر میز پر رکھ دیا۔ لڑکی نے جھجکتے ہوئے دو چار دانے اٹھائے اور انہیں سونگھنے لگی۔ "کیا ہے یہ؟" اس نے بڑے تجسس کے ساتھ آدمی کی طرف دیکھا۔

"وہ بھی اِسی طرح سونگھ رہے تھے۔" وہ ہنسنے لگا۔ "اُنہیں ڈر تھا کہ کہیں اس میں چرس گانجا تو نہیں ہے۔"

"ہَیش؟" لڑکی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "کیا اس میں سچ مچ ہَیش ملی ہوئی ہے؟"

"چکھا کر دیکھو۔"

لڑکی نے کچھ دال مونھ منھ میں ڈالی اور اُسے چبانے لگی۔ پھر پریشان ہو کر سی سی کرنے لگی۔

"مرچیں ہوں گی۔ تھوک دو!" آدمی نے کچھ گھبرا کر کہا۔

لیکن لڑکی نے انہیں نگل لیا تھا اور وہ چھلکتی ہوئی آنکھوں سے باپ کو دیکھنے لگی۔

"تم بھی پاگل ہو۔ سب نگل بیٹھیں!" آدمی نے جلدی سے اُسے پانی کا گلاس دیا جو وہ اُس کے لیے

لائی تھی۔

"مجھے پسند ہے یہ!" لڑکی نے جلدی سے پانی پیا اور اپنی قمیص کی مڑی ہوئی آستینوں سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ پھر مسکراتے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا۔ "I love it!" وہ کئی باتیں صرف اُس آدمی کا دل رکھنے کے لیے کرتی تھی؛ اُن کے درمیان بہت کم وقفہ ہوتا تھا اور وہ اُس کے پاس پہنچنے کے لیے ایسے شارٹ کٹ لیتی تھی جنھیں پار کرنے میں دوسرے بچوں کو مہینے لگ جاتے ہیں۔

"کیا اُنھوں نے بھی اِسے چکھ کر دیکھا تھا؟" لڑکی نے پوچھا۔

"نہیں، اُن میں اتنی ہمت کہاں تھی۔ انھوں نے صرف میرا سوٹ کیس کھولا، کاغذات کو اُلٹا پلٹا، اور جب انھیں پتا چلا کہ میں کانفرنس سے آ رہا ہوں تو انھوں نے کہا: "Mister, you may go

"کیا کہا اُنھوں نے؟" لڑکی ہنس رہی تھی۔

"انھوں نے کہا: "Mister, you may go. Like an Indian crow

آدمی نے پُراسرار نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

"کیا ہے یہ؟" لڑکی ہنستی رہی۔

جب وہ بہت چھوٹی تھی اور آدمی کے ساتھ پارک میں گھومنے جاتی تھی تو وہ یہ سرپھرا کھیل کھیلتے تھے۔ وہ درخت کی طرف دیکھ کر پوچھتا: "Oh dear, is there anything to see?" اور لڑکی چاروں طرف دیکھ کر کہتی: "Yes dear, there is a crow over the tree." آدمی تعجب سے اُس کی طرف دیکھتا۔ "کیا ہے یہ؟" اور وہ فتح مندانہ جوش سے کہتی: "A poem!"

"A poem!" جیسے بڑھتی ہوئی عمر میں چھوٹے ہوئے بچپن کا سایہ سرک آیا ہو۔ پارک کی ہوا، درخت اور ہنسی مذاق۔ وہ باپ کی انگلی پکڑ کر اچانک ایک ایسی جگہ آ گئی جسے وہ مدت ہوئی چھوڑ چکی تھی، ہاں کبھی کبھار، رات کو سوتے ہوئے، خوابوں میں ضرور دکھائی دے جاتی تھی۔

"میں تمھارے لیے کچھ انڈین سکے لایا ہوں۔ تم نے پچھلی بار کہا تھا نا؟"

"دکھاؤ کہاں ہیں!" لڑکی نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی شوق دکھاتے ہوئے کہا۔

آدمی نے سلمہ ستاروں سے جڑی ہوئی ایک لال تھیلی اٹھائی جیسی ہپّی لوگ اپنے پاسپورٹ رکھنے کے لیے خریدتے تھے۔ لڑکی نے اُسے اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور ہوا میں جھُلانے لگی۔ تھیلی میں رکھی چونیاں اٹھنیاں چھنچھنانے لگیں۔ پھر اُس نے تھیلی کا منھ کھولا اور سارے پیسوں کو میز پر بکھیر دیا۔

"کیا ہندوستان میں سب لوگوں کے پاس ایسے ہی سکے ہوتے ہیں؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "اور کیا سب کے لیے الگ الگ بنیں گے؟"

"لیکن غریب؟" اُس نے آدمی کو دیکھا۔ "میں نے ایک رات ٹی وی پر انھیں دیکھا تھا---" وہ سکوں کو بھول گئی اور کچھ تعجب سے فرش پر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگی۔ اُس وقت پہلی بار آدمی کو لگا جیسے وہ لڑکی جو اُس کے سامنے بیٹھی ہے کوئی غیر ہے۔ پہچان کا فریم وہی ہے جو اُس نے دو سال پہلے دیکھا

Scanned with CamScanner

تھا، لیکن اندر کی تصویر بدل گئی ہے۔ مگر وہ بدلی نہیں تھی، صرف کہیں اور چلی گئی تھی۔ وہ ماں باپ جو اپنے بچوں کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتے، اُن انجانی منزلوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جو اُن کی غیر موجودگی کی بنیادوں پر اوپر ہی اوپر بنتی رہتی ہیں۔ لڑکی اپنے بچپن کے تہہ خانے میں جا کر ہی اپنے باپ سے مل سکتی تھی، لیکن کبھی کبھی اُسے چھوڑ کر دوسرے کمروں میں چلی جاتی تھی جن کے بارے میں آدمی کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

"پاپا!" لڑکی نے اُس کی طرف دیکھا۔ "کیا میں اِن چیزوں کو سمیٹ کر رکھ دوں؟"

"کیوں، اتنی جلدی کیا ہے؟"

"نہیں جلدی نہیں--- لیکن ماما آ کر دیکھیں گی تو---" اُس کی آواز میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی جیسے وہ ہوا میں چھپا کوئی خطرہ دیکھ رہی ہو۔

"آئیں گی تو کیا؟" آدمی نے کچھ تعجب سے لڑکی کی طرف دیکھا۔

"پاپا، دھیرے بولو!" لڑکی نے اوپر کمرے کی طرف دیکھا۔ وہاں سناٹا تھا۔ جیسے گھر کا جسم دو حصوں میں بٹا ہوا تھا، ایک حصہ سنسان پڑا ہوا اور دوسرا وہ جس میں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ اس وقت اسے ایسا لگا جیسے لڑکی ناٹک کی کٹھ پتلی ہے اور اوپر کسی دھاگے سے بندھی ہوئی ہے۔ جیسے جیسے وہ دھاگا کھنچتا ہے، ویسے ویسے ہی وہ ہلتی ہے۔ لیکن وہ خود نہ دھاگے کو دیکھ سکتا ہے نہ اُسے جو دھاگا ہلاتا ہے---

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی نے خوف زدہ ہو کر اُسے دیکھا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"وہ نیچے نہیں آئیں گی؟" اُس نے پوچھا۔

"اُنہیں معلوم ہے آپ یہاں ہیں،" لڑکی نے کچھ خفگی سے کہا۔

"اسی لیے وہ نہیں آنا چاہتیں؟"

"نہیں---" لڑکی نے کہا، "بلکہ اس لیے کہ وہ کبھی بھی آ سکتی ہیں۔"

کیسے پاگل ہیں، اتنی چھوٹی سی بات نہیں سمجھ سکتے۔ "آپ بیٹھیے۔ میں ابھی ان سب چیزوں کو سمیٹ لیتی ہوں۔"

وہ فرش پر اکڑوں بیٹھ گئی، بڑی صفائی سے ہر چیز کو اُٹھا کر کونے میں رکھنے لگی۔ مخمل کی جوتی، پشمینے کی شال، گجراتی ایمپوریم کا بیڈ کور۔ اُس کی پیٹھ باپ کی طرف تھی لیکن وہ اُس کے ہاتھ دیکھ سکتا تھا۔ پتلے اور سانولے، بالکل اپنی ماں کی طرح، ویسے ہی بے نیاز اور ٹھنڈے جو اُس کی لائی ہوئی چیزوں کو اپنائیت سے پکڑتے نہیں تھے، بس بے دلی کے انداز میں الگ ہٹا دیتے تھے۔ وہ ایک ایسی بچی کے ہاتھ تھے جس نے صرف ماں کی محدود اور محفوظ شفقت کو چھونا سیکھا تھا، مرد کے جذبے اور درد کے وفور کو نہیں جو باپ کے سیکس کی کالی اندھیری گپھا سے اُمڈتے ہوئے باہر آتے ہیں۔

اچانک لڑکی کے ہاتھ ٹھٹک گئے۔ اُسے لگا کوئی دروازے کی گھنٹی بجا رہا ہے، لیکن دوسرے ہی لمحے فون کا خیال آیا جو اپنی مخصوص جگہ رکھا تھا اور زنجیر سے بندھے پلّے کی طرح زور زور سے چیخ رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

لڑکی نے چیزیں ویسے ہی چھوڑ دیں، لپکتی ہوئی سیڑھیوں کے پاس گئی اور فون اٹھایا۔ ایک لمحے تک کچھ سنائی نہیں دیا، پھر وہ چلائی:

"ماما، آپ کا فون!"

نچلی زینے کے بینسٹروں کے ساتھ سہارا لیے کھڑی تھی، ہاتھ میں فون جھلاتی ہوئی۔ اوپر کا دروازہ کھلا اور زینہ ہلنے لگا۔ کوئی نیچے آ رہا تھا۔ پھر ایک سر لڑکی کے چہرے پر جھکا، گندھا ہوا جوڑا، اور فون کے درمیان ایک پورا چہرہ اُبھر آیا۔

"کس کا ہے؟" عورت نے اپنے لٹکتے ہوئے جوڑے کو پیچھے کی طرف ہٹاتے ہوئے لڑکی کے ہاتھ سے فون کھینچ لیا۔ آدمی کرسی سے اٹھا۔ لڑکی نے اُس کی طرف دیکھا۔ "ہیلو!" عورت نے کہا۔ "ہیلو، ہیلو!" عورت کی آواز اونچی ہوئی اور تب اُسے پتا چلا کہ یہ اُس عورت کی آواز ہے جو اُس کی بیوی تھی۔ وہ اسے برسوں بعد بھی سیکڑوں آوازوں کی بھیڑ میں پہچان سکتا تھا: اونچی پچ پر ہلکا سا کپکپاتی ہوئی، ہمیشہ ہی سخت، زخمی، پریشان۔ اُس کے جسم کی واحد چیز جو جسم سے پرے آدمی کی روح پر خون کی کھرونچ سی کھینچ جاتی تھی۔ وہ جیسے اٹھا تھا ویسے ہی بیٹھ گیا۔

لڑکی مسکرا رہی تھی۔ وہ بینگر کے آئینے میں آدمی کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اور وہ چہرہ کچھ ویسا ہی بے ڈول دکھائی دے رہا تھا جیسے عمر کے آئینے میں عورت کی آواز۔ اُلٹا، ٹیڑھا، پہیلی جیسا پُراسرار۔ یہ تینوں افراد انجانے میں چار اکائیوں میں بٹ گئے تھے: لڑکی، اُس کی ماں، وہ خود اور اُس کی بیوی۔ گھر جب گرہستی میں بدلتا ہے تو اپنے آپ پھیلتا جاتا ہے۔۔۔

"تم جینی سے بات کرو گی؟" عورت نے لڑکی سے کہا، اور لڑکی جیسے اسی لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اُچھل کر اوپر والی سیڑھی پر آئی اور ماں سے ٹیلی فون لے لیا۔ "ہیلو جینی، اِٹس می!"

وہ دو سیڑھیاں نیچے اُتری۔ اب آدمی اُسے پورے کا پورا دیکھ سکتا تھا۔

"بیٹھو۔۔۔" آدمی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی آواز میں ایک بے بس سی التجا تھی، جیسے اُسے ڈر ہو کہ کہیں اُسے دیکھ کر وہ اُلٹے پاؤں لوٹ نہ جائے۔

لمحہ بھر وہ تذبذب میں کھڑی رہی۔ اب واپس مڑنا بے معنی تھا، لیکن اس طرح اُس کے سامنے کھڑے رہنے کی بھی کوئی تک نہیں تھی۔ وہ اسٹول کھینچ کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔

"کب آئے؟" اُس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ آدمی کو ٹیلی فون پر کوئی اور عورت بول رہی تھی۔

"کافی دیر ہو گئی۔۔۔ مجھے تو پتا بھی نہ تھا کہ تم اوپر کمرے میں ہو۔"

عورت چپ چاپ اُسے دیکھتی رہی۔

آدمی نے جیب سے رومال نکالا، پسینا پونچھا اور مسکرانے کی کوشش میں مسکرانے لگا۔ "میں بہت دیر باہر کھڑا رہا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ گھنٹی خراب ہے۔ گراج خالی پڑا تھا۔ میں نے سوچا تم دونوں کہیں باہر گئے ہو۔۔۔ تمہاری کار؟" اُسے معلوم تھا، پھر بھی اُس نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

"سروسنگ کے لیے گئی ہے،" عورت نے کہا۔ وہ ہمیشہ سے اُس کی چھوٹی، بے کار کی باتوں سے نفرت کرتی آئی تھی، جب کہ آدمی کے لیے یہ باتیں کچھ ایسے تنکوں کا کام دیتی تھیں جن کے سہارے ڈوبنے سے بچا جا سکتا ہو۔ کم سے کم کچھ دیر کے لیے۔

"تمھیں میرا ٹیلیگرام مل گیا تھا؟ میں فرینکفرٹ آیا تھا، اُسی ٹکٹ پر یہاں آ گیا۔ کچھ پاؤنڈ زیادہ دینے پڑے۔ میں نے تمھیں وہاں سے فون بھی کیا لیکن تم دونوں کہیں باہر تھے۔۔۔"

"کب؟" عورت نے ہلکے سے جوش کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا۔ "ہم دونوں گھر میں تھے۔"

"گھنٹی بج رہی تھی لیکن کسی نے اُٹھایا نہیں۔ ہو سکتا ہے آپریٹر میری انگریزی نہ سمجھ سکی ہو اور غلط نمبر دے دیا ہو۔ لیکن سنو۔۔۔" وہ ہنسنے لگا۔ "ایک عجیب بات ہوئی۔ ہیتھرو ایرپورٹ پر مجھے ایک عورت ملی جو پیچھے سے بالکل تمھاری طرح دکھائی دے رہی تھی۔ یہ تو اچھا ہوا میں نے اُسے بلایا نہیں۔۔۔ ہندوستان سے باہر ہندوستانی عورتیں ایک جیسی ہی دکھائی دیتی ہیں۔۔۔" وہ بولے جا رہا تھا۔ وہ اُس آدمی کی طرح تھا جو آنکھوں پر پٹی باندھ کر تنی ہوئی رسی پر چلتا ہے۔ عورت کہیں بہت نیچے تھی، ایک خواب میں، جسے وہ بہت پہلے جانتا تھا لیکن اب اُسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ اُس کے سامنے کیوں بیٹھا ہے۔

وہ چپ ہو گیا۔ اُسے خیال آیا اتنی دیر سے وہ صرف اپنی ہی آواز سن رہا ہے۔ اس کے سامنے بیٹھی عورت بالکل چپ تھی۔ وہ اُس کی طرف بہت ٹھنڈی اور مایوس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" آدمی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"میں نے تم کو منع کیا تھا۔ تم سمجھتے کیوں نہیں؟"

"کاہے کے لیے؟ تم نے کاہے کے لیے منع کیا تھا؟"

"میں، تم سے کچھ نہیں چاہتی۔۔۔ تم میرے گھر یہ سب کیوں لاتے ہو؟ کیا فائدہ ہے ان کا؟"

ایک لمحے کو وہ نہیں سمجھا کہ کون سی چیزیں۔ پھر اُس کی نگاہیں فرش پر پڑیں۔ شانتی نکیتن کا پرس، ڈاک ٹکٹوں کا البم، دال موٹھ کا ڈبا۔ وہ چیزیں اب بہت لٹی پٹی دکھائی دے رہی تھیں۔ جس حال میں وہ کرسی پر بیٹھا تھا، اُسی طرح وہ فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ "کون سی زیادہ ہیں؟" اُس نے کھسیاتے ہوئے کہا۔ "انھیں نہ لاتا تو آدھا سوٹ کیس خالی پڑا رہتا۔"

"لیکن میں تم سے کچھ نہیں چاہتی۔۔۔ تم کیا اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟"

عورت کی آواز کانپتی ہوئی اوپر اٹھی، جس کے پیچھے نہ جانے کتنے جھگڑوں کا درد اور کتنی نرکوں کا پانی بھرا تھا جو بند ٹوٹتے ہی جیسے پاس آنے لگا، ایک ایک انچ آگے بڑھتا ہوا۔ اُس نے رومال نکالا اور پسینے میں شرابور اپنا چہرہ پونچھنے لگا۔

"کیا تمھیں میرا اتنی سی دیر کے لیے آنا بھی بُرا لگتا ہے؟"

"ہاں۔" اُس کا چہرہ تن گیا۔ پھر وہ ایک عجیب تکان کے ساتھ ڈھیلی پڑ گئی۔ "میں تمھیں دیکھنا نہیں چاہتی، بس!"

Scanned with CamScanner

کیا یہ اتنا آسان ہے؟ وہ کسی ضدی لڑکے کی طرح اُسے دیکھنے لگا جو بات سمجھ لینے کے بعد بھی بہانہ کرتا ہے کہ اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"وکو!" اُس نے دھیرے سے کہا۔ "پلیز!"

"مجھے معاف کرو---" عورت نے کہا۔

"تم چاہتی کیا ہو؟"

"لیومی اَلون--- اس سے زیادہ میں کچھ اَور نہیں چاہتی۔"

"میں بچی سے ملنے بھی نہیں آسکتا؟"

"اس گھر میں نہیں۔ تم اس سے کہیں باہر مل سکتے ہو۔"

"باہر؟" آدمی نے چونک کر سر اٹھایا۔ "باہر کہاں؟"

اُس لمحے وہ بھول گیا کہ باہر پوری دنیا پھیلی ہوئی ہے، پارک، سڑکیں، ہوٹل کے کمرے، اُس کی اپنی دنیا۔ بچی کہاں کہاں اُس کے ساتھ گھسٹے گی!

وہ فون پر ہنس رہی تھی، کچھ کہہ رہی تھی۔ "نہیں، میں آج نہیں آسکتی۔ ڈیڈی گھر میں ہیں، ابھی ابھی آئے ہیں--- نہیں، مجھے معلوم نہیں--- میں نے پوچھا نہیں---" کیا نہیں معلوم؟ شاید اُس کی سہیلی نے پوچھا تھا کہ وہ کتنے دن رہے گا۔ سامنے بیٹھی عورت بھی شاید یہی جاننا چاہتی تھی: کتنا وقت، کتنی گھڑیاں، کتنی تکلیف ابھی اَور اس کے ساتھ بھگتنی پڑے گی؟

شام کی آخری دھوپ اندر آرہی تھی۔ ٹی وی کا اسکرین چمک رہا تھا، لیکن وہ خالی تھا اور اس میں صرف عورت کا سایہ بیٹھا تھا، جیسے خبریں شروع ہونے سے پہلے اناؤنسر کی پرچھائیں دکھائی دیتی ہے، پہلے کم زور اور دھندلی، پھر دھیرے دھیرے "برائٹ" ہوتی ہوئی۔ وہ سانس روکے انتظار کر رہا تھا کہ وہ کچھ کہے گی، حالاں کہ اُسے معلوم تھا کہ پچھلے برسوں سے صرف ایک نیوزریل ہے جو ہر بار ملنے پر ایک پرانے درد کا ٹیپ کھولنے لگتی ہے جس کا تعلق کسی دوسری زندگی سے ہے۔ چیزیں اور لوگ کتنے مختلف ہیں۔ برسوں بعد بھی گھر، کتابیں اور کمرے ویسے ہی رہتے ہیں جیسا تم چھوڑ گئے تھے۔ لیکن لوگ؟ وہ اُسی دن سے مرنے لگتے ہیں جس دن سے الگ ہو جاتے ہیں۔ مرتے نہیں، بلکہ ایک دوسری زندگی جینے لگتے ہیں جو دھیرے دھیرے اُس زندگی کا گلا گھونٹ دیتی ہے جو تم نے ایک ساتھ گزاری تھی---

"میں صرف بچی سے نہیں---" وہ ہکلانے لگا۔ "میں تم سے بھی ملنے آیا تھا۔"

"مجھ سے؟" عورت کے چہرے پر ہنسی، حقارت، حیرانی ایک ساتھ اُمڈ آئیں۔ "تمہاری جھوٹ کی عادت ابھی تک نہیں گئی؟"

"تم سے جھوٹ بول کر اب مجھے کیا ملے گا؟"

"معلوم نہیں تمہیں کیا ملے گا۔ مجھے جو ملا ہے اُسے میں بھگت رہی ہوں۔" اُس نے ایک ٹھہری ہوئی ٹھنڈی نظر سے باہر دیکھا۔ "مجھے اگر تمہارے بارے میں پہلے سے کچھ معلوم ہوتا تو میں کچھ کر سکتی

تھی۔"

"کیا کر سکتی تھیں؟" ایک ٹھنڈی سی جھرجھری نے آدمی کو پکڑ لیا۔

"کچھ بھی۔ میں تمھاری طرح اکیلی نہیں رہ سکتی۔ لیکن اب، اس عمر میں۔۔۔ اب کوئی میری طرف دیکھتا بھی نہیں۔"

"وکو!" اُس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

"مت لو میرا نام۔۔۔ وہ سب ختم ہو گیا۔"

وہ رو رہی تھی۔ بالکل بے نیاز، اس کا گزرے ہوئے آدمی اور آنے والی امید سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ آنسو جو کسی ایک وجہ سے نہیں بلکہ پورا بند ٹوٹ جانے سے آتے ہیں، ایک ڈھلتی ہوئی زندگی میں نالے کی طرح بہتے ہوئے۔ عورت بار بار اُنھیں اپنے ہاتھ سے جھٹک دیتی تھی۔۔۔

بچی کب سے فون کے پاس چپ بیٹھی تھی۔ وہ زینے کی سب سے نچلی سیڑھی پر بیٹھی، خشک آنکھوں سے روتی ہوئی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کی سب کوششیں ناکام ہو گئی تھیں، لیکن اُس کے چہرے پر ناامیدی نہیں تھی۔ ہر کنبے کے اپنے بدخواب ہوتے ہیں جو ایک پہیے میں مستواتر گھومتے ہیں۔ وہ اس میں ہاتھ نہیں ڈالتی تھی۔ اتنی کم عمر میں وہ اتنی بڑی سچائی کو جان گئی تھی کہ انسان کے اندر اور باہر کے منظر میں ایک عجیب یکسانی ہے۔ وہ جب تک اپنا چکر پورا نہیں کر لیتے، انھیں روکنا بے معنی ہے۔

وہ آدمی کی طرف دیکھے بغیر ماں کے پاس گئی؛ کچھ کہا، جو اُس کے لیے نہیں تھا۔ عورت نے اُسے اپنے پاس بٹھا لیا، بالکل اپنے سے لگا کر۔ کاؤچ پر بیٹھی وہ دونوں دو بہنیں سی لگ رہی تھیں۔ وہ اُسے بھول گئی تھیں۔ کچھ دیر پہلے جو جوار اٹھا تھا اس میں گھر ڈوب گیا تھا، لیکن اب پانی واپس لوٹ گیا تھا اور اب آدمی وہیں تھا جہاں اُسے ہونا چاہیے تھا۔۔ کنارے پر۔ اُسے یہ ایشور کا کرم محسوس ہوا: وہ دونوں کے بیچ بیٹھا ہے، نظر سے اوجھل۔ برسوں سے اُس کی یہ تمنا رہی تھی کہ وہ ماں اور بیٹی کے بیچ نظر سے اوجھل بیٹھا رہے۔ صرف ایشور ہی اپنی دَیا میں پوشیدہ رہتا ہے، یہ اُسے معلوم تھا۔ مگر جو آدمی گڑھے میں سب سے نچلی سطح پر جیتا ہے، اُسے بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ ماں اور بچی نے اُسے الگ چھوڑ دیا تھا؛ اس کا مطلب اُسے نظر انداز کرنا نہیں تھا۔ اُس کی طرف سے منھ موڑ کر انھوں نے اُسے اپنے پر چھوڑ دیا تھا، ٹھیک وہیں جہاں اُس نے برسوں پہلے گھر چھوڑا تھا۔

لڑکی ماں کو چھوڑ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"ہمارا باغ دیکھنے چلو گے؟" اُس نے کہا۔

"ابھی؟" اس نے کچھ تعجب سے لڑکی کو دیکھا۔ وہ کچھ بے تاب اور اُتاولی سی دکھائی دے رہی تھی، جیسے اُس سے کچھ کہنا چاہتی ہو جسے کمرے کے اندر کہنا ناممکن ہو۔

"چلو،" آدمی نے اُٹھتے ہوئے کہا، "لیکن پہلے اِن چیزوں کو اوپر لے جاؤ۔"

"ہم انھیں بعد میں سمیٹ لیں گے۔"

Scanned with CamScanner

"بعد میں کب؟" آدمی نے کچھ شک کے ساتھ پوچھا۔
"آپ چلیے تو!" لڑکی نے لگ بھگ اُسے گھسیٹتے ہوئے کہا۔
"ان سے کہو اپنا سامان سوٹ کیس میں رکھ لیں،" عورت کی آواز سنائی دی۔
اُسے لگا جیسے کسی نے اچانک پیچھے سے دھکا دیا ہو۔ وہ چونک کر پیچھے مڑا۔ "کیوں؟"
"مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"
اُس کے اندر شدید آندھی اُٹھنے لگی۔ "میں نہیں لے جاؤں گا۔ تم چاہو تو انہیں باہر پھینک سکتی ہو۔"
"باہر؟" عورت کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ "میں ان کے ساتھ تمہیں بھی باہر پھینک سکتی ہوں۔"
رونے کے بعد اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ گالوں کا گیلاپن سُوکھے کانچ سا جم گیا تھا جو پوچھے ہوئے نہیں سوکھے ہوئے آنسوؤں سے اُبھر کر آتا ہے۔
"کیا ہم باغ دیکھنے نہیں چلیں گے؟" بچی نے اُس کا ہاتھ کھینچا اور وہ اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ گھاس کی کیاریاں اور درخت کسی گونگی فلم کی طرح چل رہے تھے۔ صرف اُس کی بیوی کی آواز کرخت کمنٹری کی طرح گونج رہی تھی -- باہر، باہر۔
"آپ ممی کے ساتھ بحث کیوں کرتے ہیں؟" لڑکی نے کہا۔
"میں نے بحث کہاں کی ہے؟" اُس نے بچی کو دیکھا، جیسے وہ بھی اُس کی دشمن ہو۔
"آپ کرتے ہیں!" لڑکی کا لہجہ عجیب ہٹیلا سا ہو گیا تھا۔ وہ انگریزی میں "یُو" کہتی تھی جس کا مطلب پیار میں "تم" ہوتا تھا اور ناراضگی میں "آپ"۔ انگریزی میں پروناؤن کا یہ دُہرا پن باپ بیٹی کے رشتے کو ہوا میں لٹکائے رکھتا تھا، کبھی بہت قریب کبھی بہت دور جس کا صحیح اندازہ اُسے لڑکی کی ٹون کو ٹٹول کر کرنا پڑتا تھا۔ ایک عجیب سے ڈر نے آدمی کو پکڑ لیا۔ وہ ایک ہی وقت میں ماں اور بچی دونوں کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔
"بڑا پیارا باغ ہے،" اُس نے اُس کو پھُسلاتے ہوئے کہا۔ "کیا مالی آتا ہے؟"
"نہیں، مالی نہیں ہے،" لڑکی نے پُرجوش ہو کر کہا۔ "میں شام کو پانی دیتی ہوں اور چھٹی کے دن ممی گھاس کاٹتی ہیں--- ارے ادھر آؤ! میں تمہیں ایک چیز دکھاتی ہوں۔"
وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ لان بہت چھوٹا تھا، ہرا، پیلا، مخملی۔ پیچھے گراج تھا اور دونوں طرف جھاڑیوں کی فینس لگی ہوئی تھی۔ بیچ میں ایک گھنا بوڑھا "ولو" کا پیڑ کھڑا تھا۔ لڑکی پیڑ کے پیچھے چھپ سی گئی، پھر اُس کی آواز سنائی دی، "کہاں ہو تم؟"
وہ چپ چاپ دبے پاؤں پیڑ کے پیچھے چلا آیا اور حیران سا کھڑا رہا۔ ولو اور فینس کے بیچ کالی لکڑی کا باڑا تھا جس کے دروازے سے ایک خرگوش باہر جھانک رہا تھا۔ دوسرا خرگوش لڑکی کی گود میں تھا۔ وہ اُسے یوں سہلا رہی تھی جیسے وہ اُون کا گولا ہو جو کبھی بھی ہاتھ سے چھُوٹ کر جھاڑیوں میں گم ہو جائے گا۔

Scanned with CamScanner

"یہ ہم نے ابھی پالے ہیں--- پہلے دو تھے، اب چار۔"

"باقی کہاں ہیں؟"

"باڑے کے اندر۔ وہ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔"

پہلے اُس کا جی بھی خرگوش کو چھونے کو ہوا، مگر اُس کا ہاتھ اپنے آپ بچی کے سر پر چلا گیا اور وہ دھیرے دھیرے اُس کے بھورے، چھوٹے بالوں سے کھیلنے لگا۔ لڑکی چپ کھڑی رہی۔ خرگوش اپنی ناک سکیڑتا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"پاپا؟" لڑکی نے سر اٹھائے بغیر دھیرے سے کہا۔ "کیا آپ نے ڈے ریٹرن کا ٹکٹ لیا ہے؟"

"نہیں۔ کیوں؟"

"ایسے ہی۔ یہاں واپسی کا ٹکٹ بہت سستا مل جاتا ہے۔"

کیا اُس نے یہی پوچھنے کے لیے اسے یہاں بلایا تھا۔ اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ لڑکی کے سر سے ہٹا لیا۔

"آپ رات کو کہاں رہیں گے؟" لڑکی کا لہجہ بالکل جذبات سے عاری تھا۔

"اگر میں یہاں رہوں تو؟"

لڑکی نے دھیرے سے خرگوش کو باڑے میں رکھ دیا اور کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔

"میں مذاق کر رہا تھا۔" اُس نے ہنس کر کہا۔ "میں آخری ٹرین سے لوٹ جاؤں گا۔"

لڑکی نے مڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ "یہاں دو تین اچھے ہوٹل بھی ہیں--- میں ابھی فون کر کے پوچھ لیتی ہوں۔" بچی کا لہجہ بہت کومل ہو گیا۔ یہ جانتے ہی کہ وہ رات کو گھر میں نہیں ٹھہرے گا، وہ ماں سے ہٹ کر آدمی کے ساتھ ہو گئی؛ دھیرے سے اُس کا ہاتھ پکڑا، اُسے ویسے ہی سہلانے لگی جیسے ابھی کچھ دیر پہلے خرگوش کو سہلا رہی تھی۔ لیکن آدمی کا ہاتھ پسینے میں تر بتر تھا۔

"سنو، میں اگلی چھٹیوں میں انڈیا آؤں گی۔ اس بار پکا ہے۔"

اُسے کچھ تعجب ہوا کہ آدمی نے کچھ نہیں کہا۔ صرف باڑے میں خرگوشوں کی کھٹر پٹر سنائی دے رہی تھی۔

"پاپا--- تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟"

"تم ہر سال یہی کہتی ہو۔"

"کہتی ہوں--- لیکن اس بار میں آؤں گی، ڈونٹ یُو بیلیو می؟"

"اندر چلیں؟ ممی حیران ہو رہی ہوں گی کہ ہم کہاں رہ گئے۔"

اگست کا اندھیرا چپ چاپ چلا آیا تھا۔ ہوا میں ویلو کی پتیاں سرسرا رہی تھیں۔ کمروں کے پردے گرا دیے گئے تھے لیکن کچن کا دروازہ کھلا تھا۔ لڑکی بھاگتی ہوئی اندر گئی اور سنک کا نل کھول کر ہاتھ دھونے لگی۔ وہ اُس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ سنک کے اوپر آئینے میں اُس نے اپنا چہرہ دیکھا--- رُوکھی گرد، بڑی

Scanned with CamScanner

ہوئی داڑھی اور سُرخ آنکھوں کے بیچ اُس کی طرف حیرت سے دیکھتا ہوا۔۔ نہیں، تمہارے لیے کوئی امید نہیں۔۔۔

"پاپا، کیا تم اب بھی اپنے آپ سے بولتے ہو؟" لڑکی نے پانی میں بھیگا اپنا چہرہ اٹھایا۔ وہ شیشے میں اُسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، لیکن اب مجھے کوئی سنتا نہیں۔" اُس نے دھیرے سے بچی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "کیا فرِج میں سوڈا ہو گا؟"

"تم اندر چلو، میں ابھی لاتی ہوں۔"

کمرے میں کوئی نہ تھا۔ اُس کی چیزیں بٹور دی گئی تھیں۔ سوٹ کیس کونے میں کھڑا تھا۔ جب وہ باغ میں تھے، اُس کی بیوی نے شاید ان سب چیزوں کو دیکھا ہو گا، انہیں چھوا ہو گا۔ وہ اس سے چاہے کتنی ناراض کیوں نہ ہو، چیزوں کی بات الگ تھی۔ وہ اُنہیں اوپر نہیں لے گئی تھی، لیکن انہیں دوبارہ سوٹ کیس میں ڈالنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اس نے انہیں اپنی قسمت پر چھوڑ دیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب بچی سوڈا اور گلاس لے کر آئی تو اسے فوراً پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔۔ پورا اندھیرا نہیں، صرف اتنا جس میں کمرے میں بیٹھا آدمی چیزوں کے بیچ چیز جیسا دکھائی دیتا ہے۔ "پاپا، تم نے بتّی نہیں جلائی؟"

"ابھی جلاتا ہوں۔" وہ اٹھا اور سوئچ کو ڈھونڈنے لگا۔ بچی نے سوڈا اور گلاس میز پر رکھ دیا اور ٹیبل لیمپ جلا دیا۔

"ممی کہاں ہیں؟"

"وہ نہا رہی ہیں۔ ابھی آتی ہیں۔"

اُس نے اپنے بیگ سے وِسکی نکالی جو فرینکفرٹ کے ایرپورٹ پر خریدی تھی۔ گلاس میں ڈالتے ہوئے اُس کے ہاتھ ٹھٹھک گئے۔ "تمہاری جنجرایل کہاں ہے؟"

"میں ابھی اصلی بیئر پیتی ہوں۔" لڑکی نے ہنس کر اُس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں برف چاہیے؟"

"نہیں۔ لیکن تم جا کہاں رہی ہو؟"

"باڑے میں کھانا ڈالنے۔ نہیں تو وہ ایک دوسرے کو مار کھائیں گے۔"

وہ باہر گئی تو کھلے دروازے سے باغ کا اندھیرا دکھائی دیا، تاروں کی پہلی تلچھٹ میں جھلملاتا ہوا۔ ہوا نہیں تھی۔ باہر کا سناٹا گھر کی دکھائی نہ دینے والی آوازوں کے اندر سے چھَن کر آتا تھا۔ اُسے لگا وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہے، اور جو کبھی برسوں پہلے ہوتا تھا وہی اب ہو رہا ہے۔ وہ شاور کے نیچے گنگناتی رہتی تھی اور جب بالوں پر تولیا صافے کی طرح باندھ کر باہر نکلتی تھی تب پانی کی بوندیں باتھ روم سے لے کر اس کے کمرے تک ایک لکیر بناتی جاتی تھیں۔ پتا نہیں وہ لکیریں بیچ میں کہاں سوکھ گئیں؟ کون سی جگہ، کس خاص موڑ پر وہ چیز ہاتھ سے چھُوٹ گئی جسے وہ دوبارہ کبھی نہیں پکڑ سکا۔

Scanned with CamScanner

اُس نے کچھ اَور وسکی ڈالی، حالاں کہ گلاس ابھی خالی نہیں ہوا تھا۔ اُسے کچھ عجیب لگا کہ پچھلی رات بھی یہی گھڑی تھی جب وہ پی رہا تھا، لیکن تب وہ ہوا میں تھا۔ جب اُسے ایر ہوسٹس کی آواز سنائی دی کہ ہم چینل پار کر رہے ہیں، تو اس نے ہوائی جہاز کی کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا، نہ سمندر، نہ لائٹ ہاؤس، صرف اندھیرا، اندھیرے میں بہتا ہوا اندھیرا، پھر کچھ بھی نہیں۔ اور تب نیچے اندھیرے میں جھانکتے ہوئے اُسے خیال آیا کہ وہ چینل جو نیچے کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا، اصل میں کہیں اندر ہے۔ اُس کی ایک زندگی سے دوسری زندگی تک پھیلا ہوا، جسے وہ ہمیشہ پار کرتا رہے گا، کبھی اِدھر کبھی اُدھر، کہیں کا بھی نہیں، نہ کہیں سے آتا ہوا نہ کہیں پہنچتا ہوا۔۔۔

وہ الگ کھڑی تھی زینے کے نیچے۔ نہانے کے بعد اس نے ایک لمبی میکسی پہن لی تھی۔ بال کھلے تھے۔ چہرہ بہت دھلا ہوا اور چمکیلا سا لگ رہا تھا۔ وہ میز پر رکھے اُس کے گلاس کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کا چہرہ شانت تھا، جیسے شاور نے نہ صرف اس کے چہرے کو بلکہ اس کے اضطراب کو بھی دھو ڈالا تھا۔

"برف بھی رکھی ہے،" اُس نے کہا۔

"نہیں، میں نے سوڈا لے لیا۔ تمہارے لیے ایک بنا دوں؟"

اُس نے سر ہلایا، جس کا مطلب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ گرم پانی سے نہانے کے بعد اُسے کچھ ٹھنڈا پینا اچھا لگتا تھا۔ اتنے عرصے بعد بھی وہ اُس کی عادتیں نہیں بھولا تھا، بلکہ ان عادتوں ہی کے سہارے اُن دونوں کے درمیان پرانی پہچان لوٹ آتی تھی۔ وہ کچن میں گیا اور اُس کے لیے ایک گلاس لے آیا۔ اس میں تھوڑی سی برف ڈالی۔ جب وسکی ملانے لگا تو اُس کی آواز سنائی دی۔ "بس، اتنی کافی ہے۔"

وہ دھلی ہوئی آواز تھی جس میں کوئی رنگ نہیں تھا، نہ پیار کا نہ ناراضگی کا۔ ایک پُرسکون اور ٹھہری ہوئی آواز۔ وہ سیڑھیوں سے ہٹ کر کرسی کے پاس چلی آئی تھی۔

"تم بیٹھو گی نہیں؟" اس نے کچھ فکرمند ہو کر پوچھا۔

اُس نے اپنا گلاس اٹھایا اور وہیں اسٹول پر بیٹھ گیا جہاں دوپہر کو بیٹھی تھی؛ ٹی وی کے پاس لیکن ٹیبل لیمپ سے دور، جہاں صرف روشنی کی ایک باریک سی جھلک اُس تک پہنچ رہی تھی۔ کچھ دیر تک دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔ پھر عورت کی آواز سنائی دی۔ "گھر میں سب لوگ کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔ یہ ساری چیزیں انھوں نے ہی بھیجی ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے،" عورت نے کچھ تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیوں اُن بے چاروں کو تنگ کرتے ہو؟ تم ڈھونڈھ کر ان چیزوں کو یہاں لاتے ہو اور وہ یہاں بے کار پڑی رہتی ہیں۔"

"وہ یہی کر سکتے ہیں،" اُس نے کہا۔ "تم برسوں سے وہاں نہیں گئیں۔ وہ بہت یاد کرتے ہیں۔"

"اب جانے کا کچھ فائدہ ہے؟" اس نے گلاس سے لمبا گھونٹ لیا۔ "میرا اب اُن سے کوئی رشتہ نہیں۔"

"تم بچی کے ساتھ تو آ سکتی ہو۔ اُس نے اب تک ہندوستان نہیں دیکھا۔"

Scanned with CamScanner

وہ کچھ دیر چپ رہی، پھر دھیرے سے کہا، "اگلے سال وہ چودہ سال کی ہو جائے گی۔ قانون کے مطابق تب وہ کہیں بھی جا سکتی ہے۔"

"میں قانون کی بات نہیں کر رہا۔ تمہارے بغیر وہ کہیں نہیں جائے گی۔"

عورت نے گلاس کی بھیگی سطح سے آدمی کو دیکھا۔

"میرا بس چلے تو اُسے کبھی وہاں نہ بھیجوں۔"

"کیوں؟" آدمی نے اُس کی طرف دیکھا۔

وہ دھیرے سے ہنسی۔ "کیا ہم دو ہندوستانی اُس کے لیے کافی نہیں ہیں؟"

وہ بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد کچن کا دروازہ کھلا، لڑکی اندر آئی۔ چپ چاپ دونوں کو دیکھا اور پھر زینے کے پاس چلی گئی جہاں ٹیلی فون رکھا تھا۔

"کسے کر رہی ہو؟" عورت نے پوچھا۔

لڑکی چپ رہی۔ فون کا ڈائل گھمانے لگی۔

آدمی اٹھا، اُس کی طرف دیکھا۔ "تھوڑا سا اَور لو گی؟"

"نہیں۔" اُس نے سر ہلایا۔ آدمی دھیرے دھیرے اپنے گلاس میں ڈالنے لگا۔

"کیا بہت پینے لگے ہو؟" عورت نے کہا۔

"نہیں---" آدمی نے سر ہلا کر کہا۔ "سفر میں کچھ زیادہ ہو جاتا ہے۔"

"میں نے سوچا تھا، اب تک تم نے گھر بسا لیا ہو گا۔"

"کیسے؟" اُس نے عورت کو دیکھا۔ "تمہیں یہ گمان کیسے ہوا؟"

عورت کچھ دیر خالی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی۔ "کیوں، اُس لڑکی کا کیا ہوا؟ وہ تمہارے ساتھ نہیں رہتی؟" عورت کے لہجے میں کوئی تیزی نہیں تھی، نہ جھگڑے کا کوئی سایہ تھا۔ جیسے دو آدمی مدّت بعد کسی ایسے واقعے کا ذکر کر رہے ہوں جس نے ایک جھٹکے میں دونوں کو الگ الگ کناروں پر پھینک دیا تھا۔

"میں اکیلا رہتا ہوں--- ماں کے ساتھ،" اُس نے کہا۔

عورت نے ذرا تعجب سے اُسے دیکھا۔ "کیا بات ہوئی؟"

"کچھ نہیں--- میں شاید ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔" اس کا لہجہ غیر معمولی طور پر دھیما ہو گیا، جیسے وہ اُسے اپنی کسی پوشیدہ بیماری کے بارے میں بتا رہا ہو۔ "تم حیران ہو؟ لیکن ایسے لوگ ہوتے ہیں---" وہ کچھ اَور کہنا چاہتا تھا، محبّت کے بارے میں، وفاداری کے بارے میں، اعتماد اور دھوکے کے بارے میں، کوئی بہت بڑا سچ جو بہت سے جھوٹوں سے مل کر بنتا ہے، وِسکی کی دھند میں بجلی کی طرح کوندتا ہے اور دوسرے ہی لمحے ہمیشہ کے لیے اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے۔

لڑکی شاید اسی لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ٹیلی فون سے اٹھ کر آدمی کے پاس آئی۔ ایک بار ماں کو دیکھا، وہ ٹیبل لیمپ کے پیچھے اندھیرے کے آدھے کونے میں چھپ گئی تھی۔ اور آدمی؟ وہ گلاس کے

Scanned with CamScanner

صرف ایک ڈبڈباتا ہوا دھبا بن کر رہ گیا تھا۔

"پاپا!" لڑکی کے ہاتھ میں کاغذ کا پُرزہ تھا۔ "یہ ہوٹل کا نام ہے۔ ٹیکسی تمہیں دس منٹ میں پہنچا دے گی۔"

اُس نے لڑکی کو اپنے پاس کھینچ لیا اور کاغذ جیب میں رکھ لیا۔ کچھ دیر تک تینوں چپ بیٹھے رہے جیسوں پہلے، سفر پر نکلنے سے پہلے، گھر کے سب افراد ایک ساتھ سمٹ کر چپ بیٹھ جاتے تھے۔ باہر سے تارے نکل آئے تھے جن میں بوڑھا ولو، جھاڑیاں اور خرگوشوں کا باڑا ایک ساکت پیلے منظر میں پاس سرک آئے تھے۔

اُس نے اپنا گلاس میز پر رکھا، پھر دھیرے سے لڑکی کو چوما، اپنا سوٹ کیس اٹھایا، اور جب لڑکی دروازہ کھولا تو وہ لمحہ بھر کو دہلیز پر ٹھٹک گیا۔ "میں چلتا ہوں،" اُس نے کہا۔ پتا نہیں یہ بات اُس نے کہی تھی، مگر جہاں وہ بیٹھی تھی وہاں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ وہاں اتنی ہی گھنی خاموشی تھی جتنی حیرے میں، جہاں وہ جا رہا تھا۔

**

شانی

ہندی سے ترجمہ: ولی رام ولبھ

دوزخی

میں دبے پاؤں داخل ہوا۔ باہر کا گیٹ میں نے دھیرے سے کھولا، ایسے کہ آواز نہ ہو۔ گھر کے سامنے کا دروازہ اُڑکا ہوا تھا، ہمیشہ کی طرح۔ میں نے اُسے بھی دھیرے سے دھکیلا۔ اصل میں مَیں جمیل کے سامنے بالکل اچانک آنا چاہتا تھا، دل کے دورے کی طرح۔

یہ بھوپال جیسے شہر کی دوپہری تھی، ڈھلتی ہوئی۔ دن میں سُونا پن اور آلکس تھا کہ اکثر لوگ سو رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ جمیل کے گھر پر ملنے کا وقت ہے۔ شہر اور اس کے اپنے مزاج ہی کے لحاظ سے نہیں، اس کے کام کے اعتبار سے بھی۔ اس کا کالج صبح شام لگتا تھا اور ساری دوپہر خالی رہتی تھی۔

جمیل دیوان پر لیٹا ہوا تھا، دیوار کی طرف منہ کیے۔ آہٹ سے چونک کر جب اس نے دیکھا تو ایک آدھ پل بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ حیران۔ پھر "ارے" کہتا ہوا ہڑبڑا کر اٹھا اور ہم دونوں لپٹ گئے۔ اس کی جکڑ زبردست تھی۔ بانہیں اس کی لمبی اور مضبوط تھیں اور ہتھیلیاں جیسے میری پیٹھ میں دھنس جانا چاہتی تھیں، گوشت پوست کو چھیدتی ہوئی۔ پہلی بار لگا کہ ہاتھ کی انگلیاں بھی بولتی ہیں۔

"کب آیا؟" کئی پل بعد اُس نے گردن ہٹا کر پوچھا، لگ بھگ رُندھے ہوئے لہجے میں۔ اس کا چہرہ اَب بھی میرے اتنے پاس تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پا رہے تھے۔

"صبح،" میں نے کہا۔ "دکھن ایکسپریس سے۔"

الگ ہوئے۔ بیٹھے۔

"میں آج صبح ہی یاد کر رہا تھا،" وہ بولا، اور گاؤ تکیے سے ٹک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایسی بھرپور نظر تھی جس میں آپ سمو لینا چاہتے ہیں سب کچھ۔ تبھی بغل والے کمرے کا پردہ ہٹا کر بیوی کنیز آئی،

Scanned with CamScanner

ہنستی ہوئی۔ سلام کیا۔ پاس بیٹھی۔ بولی۔ پوچھا۔ خوش ہوئی۔

"باجی کیسی ہیں؟" میں نے کنیز سے کہا۔ "اُن سے میرا سلام۔۔۔"

"نماز پڑھ رہی ہیں،" وہ اندر دیکھتی ہوئی بولی۔ "اور تمھارے لیے کیا لاؤں؟ پہلے کھانا کھالو۔"

"اس وقت؟" میں ہنسنے لگا، ہمیشہ کی طرح۔ میں جانتا تھا کہ آخر وہ کھانا لائے گی اور میں کھاؤں گا۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

"اب باجی کی طبیعت کیسی رہتی ہے؟" میں نے جمیل سے پوچھا۔

باجی کا تخت باہر ہی سے دکھتا ہے، اور گھر میں داخل ہوتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ سوال جیسے بے چین کر دینے والا تھا۔ جمیل سگریٹ کا پیکٹ ٹٹولنے لگا۔ ملا تو ایک جلائی اور میری طرف دیکھ کر سر ہلا دیا، یعنی بس ٹھیک ہے، اور پھیکے پن سے مسکرایا۔ باجی، بھائی جان، یعنی ماں، باپ۔ باجی کئی مہینوں سے بیمار چل رہی تھیں، گھر پر ہوئے نئے حادثے سے بھی پہلے۔ شاید سبھی سے جب ایک دن بھائی جان اچانک نہیں رہے تھے۔ رات کو وہ ٹھیک ٹھاک آئے تھے، لیکن صبح نہیں اٹھے، بس۔

"کون ہے اُلن؟" بھیتر سے آواز آئی۔ وہ شاید مصلے سے اٹھ رہی تھیں۔ اُلن، یعنی جمیل۔ جمیل نے میرا نام بتایا۔ کہا کہ میں دلّی سے آیا ہوں، سلام کر رہا ہوں۔ انھوں نے وہیں سے دعائیں دیں۔ بہت تھکی ہوئی آواز میں۔ پھر کچھ دیر بڑبڑاتی سی رہیں۔ کیا؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سامنا کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

"اور؟" تھوڑی دیر بعد جمیل نے مجھے واپس لاتے ہوئے کہا، کہیں اَور لے جانے کے لیے۔

"تیری دلّی کیسی ہے؟"

"میری؟"

جمیل مسکرایا۔

دلّی ایک دوزخ ہے، میں پہلے اکثر کہا کرتا تھا۔ چار سال پہلے جب میں اِس شہر سے نکالا گیا تھا تو میرے من میں بہت تلخی تھی۔ یہ دیس نکالا پچھلی سرکار کی عنایت تھی، اور میرے لیے یہ بھولنا مشکل تھا کہ میں دلّی آیا نہیں، پھینکا گیا ہوں۔ اب وہ بات نہیں رہی، لیکن نہ تو میں دلّی کا ہو سکتا ہوں اور نہ دلّی میری۔ جمیل یہ جانتا تھا۔

"چل، میرٹھ کی مارکاٹ کی سہی۔ کیا حال ہیں؟"

"وہاں فساد کی تاریخ بہت پرانی ہے،" میں نے کہا۔ "سن سینتالیس سے بھی پُرانی۔ نیا میں کیا بتاؤں؟ وہی کہہ سکتا ہوں جو اخباروں میں ہے۔ ہاں، سنا ہے مراد آباد اور علی گڑھ میں بہت تناؤ ہے۔"

"تجھے اخباروں پر بھروسا ہوتا ہے؟"

میں چپ ہو گیا۔

"جو لوگ دبانے پر بیٹھے ہیں وہ جانتے ہیں،" اس نے کہا۔

Scanned with CamScanner

"کہاں ہے دبانہ؟"

"دلّی دبانہ نہیں ہے؟ ملک کا، میرٹھ کا، جمشید پور یا بھاگل پور کا؟"

میں کمرے کی دیواروں کو دیکھنے لگا جن میں کئی طرح کی پینٹنگز لٹکی ہوئی تھیں، کنیز کی بنائی ہوئی۔ ان میں حسین اور بیبار کا ملاجلا اثر واضح تھا۔ ظاہر ہے کہ میں بچنا چاہتا تھا۔ شاید ہم دونوں بچنا چاہتے تھے، اُس بات سے جس کے چھڑ جانے کا ڈر ہم دونوں ہی کو تھا۔

"تیری پرانی شکل لوٹ آئی ہے،" جمیل نے بات پلٹتے ہوئے کہا۔ "پچھلی بیماری میں جانے وہ کہاں چلی گئی تھی۔"

"یہ بارٹ اٹیک کی دین ہے،" میں نے کہا اور بناوٹی ہنسی ہنسنے لگا جیسے میں کوئی قلعہ جیت لیا ہوں۔

"اب تو تُو بالکل ٹھیک ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل کا تو پتا نہیں۔ ہاں، ٹھیک ضرور ہوں۔ اُتنا ہی ٹھیک جتنا دل کے مریض رہتے ہیں۔"

اور یہ کہنے کے ساتھ ہی مجھے لگا کہ میرے لہجے میں خودرحمی آ گئی ہے۔ میں نے پرانے بے نیازی کے انداز پر لوٹتے ہوئے کہا، "اصل میں اب میں نے پروا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ جب آنا ہے آ جائے گی۔ تب نہ ڈاکٹروں کے چلتے رکے گی نہ میرے رُکے۔"

"بہت دنوں تک یہاں کسی کو پتا نہیں تھا،" جمیل نے کہا۔ "افواہ کی طرح خبر آئی تھی کچھ اُلٹی سیدھی۔ ہم لوگوں نے گھبرا کر دلّی فون کیا تھا، لیکن تمہارے وہاں کے دوستوں نے کہا کہ ویسی کوئی بات نہیں ہے۔ اسپتال میں ضرور ہے، انٹنسو کیئر یونٹ میں بھی ہے، لیکن ہارٹ وارٹ کا معاملہ نہیں ہے۔ وہ تو دلّی سے تجھے دیکھ کر لوٹے پنکج نے بتایا کہ سب کچھ کتنا سیریس تھا۔ یہ ہوا کیسے؟"

"اُسی طرح جیسے ہوتا ہے۔ اچانک۔"

"گھر پر؟"

"نہیں، دفتر میں۔"

"کیسے؟"

"میں باتیں کر رہا تھا ایک ملنے والے سے۔ یکایک مجھے بے چینی سی ہوئی۔ سینے میں جکڑن اور درد کے بگولے اٹھ آئے اور میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ میری آواز بالکل مدھم ہو گئی تھی۔ دل ڈوبنے لگا تھا۔ میں اٹھنا چاہتا تھا مگر مجھ میں دم نہیں تھا۔ میں بیٹھے رہنا چاہتا تھا لیکن اتنی بے چینی اور گھبراہٹ کہ۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں میں فرش پر لیٹا چھٹپٹا رہا تھا۔۔۔"

کہتے کہتے میں رک گیا، کیوں کہ جمیل کے چہرے پر ایک رنج میں صاف صاف دیکھ رہا تھا، جو میں چاہتا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میری جس اذیت کو یہاں معمولی ڈھنگ سے لیا گیا تھا، میں اُس کا حساب برابر کر رہا ہوں۔ دلّی کے اپنے دوستوں کے رویّے پر غصہ آ رہا تھا سو الگ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک مصلحت کے تحت میری بیماری کی سنجیدگی کو چھپایا گیا تھا، لیکن اُس مصلحت نے مجھے اُس سب سے یہاں محروم کر دیا

تھا جو میں چاہتا تھا۔ لگ بھگ ایک سال کے بعد میں اس شہر میں وارد ہوا تھا، ایک ایسے آدمی کی طرح جو نایاب ہوتے ہوتے یکایک رہ گیا تھا۔

"تمھیں یاد ہے میں نے تعزیت کا خط تمھیں کب لکھا تھا؟ وہ سات اپریل کا دن تھا، اور کوئی گھنٹا بھر پہلے میں نے تمھیں لکھا تھا۔ تب میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد میں بھی اُسی راستے پر پہنچ جاؤں گا جہاں سے حسین کبھی نہیں آیا۔"

سبھی اندر سے کنیز نکل آئی اور میرے سامنے کباب، روٹیاں، رکابی رکھتے ہوئے بولی، "لو کھاؤ!" پھر ایک اسٹول کھینچ کر سامنے ہی بیٹھ گئی۔ پہلا ہی لقمہ توڑتے ہوئے مجھے لگا کہ حسین کا نام مجھے نہیں لینا چاہیے تھا۔ شاید میں چاہتا بھی نہیں تھا، بس بات کی رَو تھی۔ لیکن کیوں نہیں؟ کیا میں پُرسے کے لیے نہیں آیا تھا؟ پرسہ، وہ بھی حسین کا! یہ وہ آدمی تھا جو ابھی کل تک اسی شہر میں دوسروں کے پُرسے کے لیے جایا کرتا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اُسے کیا کہنا چاہیے۔ وہ چپ چاپ بیٹھ جایا کرتا تھا، سُونی آنکھوں سے ایک طرف دیکھتا رہتا۔

خبر یہ بھی مجھے دفتر سے ملی تھی، دلّی میں۔ جمیل نے نہیں دی تھی۔ اِس شہر سے بھی نہیں گئی تھی۔ بُرہان پور سے سیّد محمود نے لکھا تھا۔

"تمھیں یہ جان کر بہت صدمہ ہو گا،" اس نے خط میں کہا تھا، "کہ ہم دونوں کے عزیز دوست حسین احمد صدیقی کا ناسیجیریا میں انتقال ہو گیا۔ اُن کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ نسرین بھابھی ان کی میّت لے کر بھوپال آئی تھیں اور اُسے دفنا کر میں کل لوٹا ہوں۔ ہم لوگوں کا جو ہونا تھا وہ ہوا، لیکن سوچو کہ تین چھوٹے چھوٹے بچّوں کے ساتھ رہ گئی ایک جوان عورت کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے کیا اُس کی کوئی تلافی ہو سکتی ہے۔"

بڑی دیر تک میں خط لیے بیٹھا رہ گیا تھا۔ میں نے اسے کوئی تین بار پڑھا تھا اور حسین کے نام پر پانچ بار نظر ڈالی تھی۔ میں یقین کرنا چاہتا تھا، لیکن ہو نہیں رہا تھا۔ اور جب ہوا تو اُس پل کے ہزاروں میں راحت اور چھٹکارے کی سانس تھی۔ پھر میں نے دکھ کو دھیرے دھیرے سمیٹ کر اپنے بھیتر اکٹھا کیا تھا اور ایک دم دکھی ہو گیا تھا۔

"یہ بھی کوئی بات ہوئی!" میں اس کے بعد ہر آنے والے کو بتا کر کہہ رہا تھا۔ "کیا یہ اُس کی جانے کی عمر تھی، اور وہ بھی دل کے دورے سے! وہ تو مجھ سے بھی دو سال چھوٹا تھا۔ وہ خدا سے خوف کھانے والا اور پرہیزگار آدمی تھا اور سگریٹ تک نہیں پیتا تھا۔"

یہ سب کہتے ہوئے یا تو میں ڈرا ہوا تھا یا شاید اپنے ڈر کو دور کر رہا تھا، حالاں کہ دفتر سے گھر لوٹنے تک بھی اُس سے پیچھا نہیں چھُوٹا تھا۔ وہ کہیں اتنے اندر پہنچ کر بیٹھ گیا تھا کہ اس نے مجھے ایکا ایک چپ کر دیا۔ خبر یہ گھر کے لیے بھی بڑی تھی، لیکن میں نے اُس دن بیوی سے بھی نہیں کہا۔ اس ڈر سے کہ گھر پر بھی دیر تک وہی ذکر ہوتا رہے گا اور رات کو حسین کا چہرہ مجھے سونے نہیں دے گا۔ اُس رات میں سو تو

گیا، لیکن حسین نے تنگ برابر کیا۔ اس کا چہرہ چاروں طرف سے آ کر مجھ پر حملہ کرتا تھا اور خواب ساری رات اُس کی میت دکھائی دی، کئی دن پرانی میت۔ یہ اُس دن ہی نہیں، اگلے دن بھی ہوا تھا کے اگلے دن بھی، حالاں کہ میں کسی سے کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ تعزیت کا خط بھی تین دن ٹالنے میں نے جمیل کو لکھا تھا، اور میں بھی حسین کی طرح نہیں جانتا تھا کہ پُرسے میں کیا کہنا چاہیے۔

بات عجیب سہی لیکن سچ یہ ہے کہ حسین میرا دوست نہیں رہ گیا تھا، خاص کر ادھر کے برسوں جب وہ نائجیریا چلا گیا تھا، یا شاید اس سے بھی پہلے جب مَیں دھیرے دھیرے اس کے چھوٹے بھائی کا دوست ہو گیا تھا۔

پندرہ برس پہلے جب میں بھوپال آیا تھا تو دوستی اُسی سے ہوئی تھی۔ دونوں بھوپال میں باہر آئے ہوئے تھے اور وہاں ہمارا کوئی گھر نہیں تھا۔ حسین میں ایک خاص طرح کی مردانہ کشش تھی، سب اپنی طرف کھینچ لینے والی۔ وہ لمبا اور چھریرا تھا اور ہلکے ہلکے گنجا ہو رہا تھا۔ پہلے ہی دن مَیں نے دیکھ لیا تھا ایک مہین احساسات والا ایسا غصیل اور خود پسند آدمی ہے جو اپنے آپ پر بھی ہنس سکتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے اور خوب صورت مبالغے کرتا تھا کہ کوئی بھی ہنستا ہنستا اُس کا ہو جاتا تھا۔ تب ہم پُرانے بھوپال کی امیر گنج گلی میں رہتے تھے اور جوان تھے۔ حسین ایک پرائیویٹ کالج میں سائنس پڑھاتا تھا اور میں ایک دفتر میں قلم گھسیٹ رہا تھا۔ محلّہ پرانے رئیسوں اور امیروں کا تھا اور ہم جیسے پھٹے حال اکا دکا بھی پڑے ہوئے تھے اپنے اپنے منھ چھپائے ہوئے۔

اصل میں ہم دونوں کی دوستی دو تنگ دست، کند ذہن اور غصیل آدمیوں کا ایسا میل تھا جو دونوں کو راحت دیتا تھا۔ رہجا پہلے میں تھا، بعد میں اُسے رِجھا لیا تھا، حالاں کہ ہم دونوں الگ الگ قماش کے لوگ تھے۔ وہ سائنس پڑھاتا تھا، دقیانوسی اور مذہبی تھا اور ہنسی ہنسی میں اپنے کو جنّتی کہتا تھا۔ میرا سائنس سے کوئی لینا دینا نہیں تھا، لیکن میں اُسی کی سہارے اپنے کو جدید لگتا تھا اور ترقی پسند بنا ہوا تھا، حسین کا فتویٰ سرہانے پر لیے ہوئے کہ میں دوزخی ہوں۔ سچائی یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دوزخی سمجھتے تھے اور دونوں مل کر اُس تیسرے کو جو ہمارے بیچ نہیں تھا اور جسے ہم قادو کہتے تھے۔

"تم مکار ہو،" ایک بار اُس نے غصے سے دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔ "اوّل درجے کے پاکھنڈی دوغلے۔۔۔"

"کیوں، کیا تم سے بھی بڑا؟"

"ہاں، میں تو تمھارے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہوں۔"

"وہ تو تم ویسے بھی نہیں ہو!" میں نے ہنس کر اُڑانا چاہا تھا۔

"تم دونوں جہانوں کے مزے مارنا چاہتے ہو،" اس نے قریب قریب بال نوچتے ہوئے کہا تھا "دہریے وہریے کچھ ہو نہیں، سب تمھارا ڈھونگ ہے!"

"تمھارے جنّتی ہونے سے بھی بڑا ڈھونگ؟" میں نے مخالفت کی تھی۔ "کیوں ناحق فاقے کرتے

ہو یار!"

میں اکثر کہا کرتا تھا کہ جو سچ مچ روزے دار ہوتے ہیں وہ سحری کے بعد افطار اور افطار کے بعد سحری کی فکر نہیں کیا کرتے۔ جو لوگ رمضان کے دنوں میں صبح شام تھیلی لیے بازار بھاگتے نظر آتے تھے، کبھی مرغ تو کبھی تیتر کے لیے، کبھی لوے تو کبھی بٹیر، کبھی مچھلی تو کبھی بریانی کے لیے، میں ان کا مذاق اڑاتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے حسین کو چوٹ لگتی ہے، کیوں کہ میں یہی چاہتا تھا۔

"تم نہ ہیسوں میں نہ شیعوں میں، نہ یہاں نہ وہاں۔ اللہ تم پر رحم کرے!" وہ مجھ سے کہتا تھا۔

یہ صرف ایک دن کی بات نہیں تھی۔ اکثر ہم دونوں کسی نہ کسی ایسی بات پر لڑتے تھے۔ غصے میں ایک دوسرے سے کبھی نہ بولنے کی دھمکی دیتے تھے، لیکن اگلے ہی دن پھر ملتے تھے، پھر سے لڑنے کے لیے۔

یہ وہ دور تھا جب ملک میں فساد کی فصل آئی تھی اور ایک کے بعد ایک کئی شہروں میں دنگے ہو رہے تھے۔ جبل پور، الہ آباد، جل گاؤں، احمد آباد، جمشید پور اور۔۔۔

ہم لوگ بھوپال جیسے شہر میں رہ رہے تھے، جس میں فساد کی کوئی تاریخ نہیں تھی، پھر بھی ڈرے ہوئے تھے کیوں کہ شہر میں تناؤ تھا۔ سرکار چوکس ہو گئی تھی۔ جگہ بے جگہ پولیس اور ہوم گارڈ کے جوان تعینات تھے۔ روز افواہیں اڑتی تھیں اور باہر سے روز خبریں آتی تھیں، ہیبت ناک خبریں۔ برسوں سے ساتھ رہتے آئے ہندو مسلمان ایک دوسرے کو شک بھری نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ گئے تھے۔

"دیکھ لو،" ایک ایسی ہی شام حسین نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ "حیوان کے بچوں نے ملک کا بٹوارا کر کے کیا کر دیا ہے!"

اُس نے صبح سے اخبار میں کچھ اور دل دہلانے والی خبریں پڑھ لی تھیں۔ اُس کا شیو بڑھا ہوا تھا اور بال روکھے تھے، اُڑے اُڑے سے۔ وہ اور دنوں سے زیادہ گنجا لگ رہا تھا۔

"اب یہ ملک رہنے لائق نہیں رہا!" وہ بولا۔ "کسی دن ہم لوگ بھی کاٹ کر پھینک دیے جائیں گے اور کوئی رونے والا نہیں ہو گا۔"

"کیوں، میں جو ہوں!" میں نے ہنس کر کہا۔ دراصل میں اپنے اور اُس کے ڈر کو ہنس کر اڑانا چاہتا تھا، اندھیرے میں گائے جانے والے گیت کی طرح۔

"تم بھی نہیں ہو گے،" اس نے آنکھ تریر کر تلخی سے جواب دیا۔ "کل جب کافروں کا جتھا گنڈاسے اور خنجر لے کر تمہارے دروازے پر آئے گا، تب کوئی نہیں پوچھے گا کہ تم کیا سوچتے ہو یا تمہارے خیالات کیا ہیں! پہچان کے لیے تمہارا نام کافی ہے۔"

"تم تو کہہ رہے تھے کہ پہچان کے لیے صرف نام کافی نہیں ہوتا؟"

"وہ اور بات تھی۔ دوسرے سلسلے میں کہی گئی تھی۔ مسئلوں کو گڈمڈ مت کیا کرو۔ میں جانتا ہوں تم

چالاکی کر رہے ہو۔"

ہاں، میں چالاکی کر رہا تھا، جان بوجھ کر انجان بنے رہنے کی چالاکی، سچائی سے ڈر کر بھاگ کھڑے ہونے کی چالاکی۔ میں حسین سے بالکل متفق نہیں ہونا چاہتا تھا، کیوں کہ اُس کی بات ماننا اپنے پاؤں کے نیچے کے اُس ٹیلے کو کاٹنا تھا جس پر میں کھڑا تھا۔

اس بیچ ایک ایسی بات ہوئی جس کے بارے میں مَیں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ حسین اچانک میرے لیے نایاب ہو گیا تھا۔ صبح اُس کا کالج ہوا کرتا تھا، دوپہر میں میرا دفتر۔ ایک شام ہی کا وقت تھا جس میں ہم اکثر ملا کرتے تھے، لیکن اِدھر وہ کئی شاموں سے غائب تھا۔ میرے لیے حسین کا گھر اجنبی نہیں تھا۔ جمیل بھی میرے لیے نیا نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ حسین کا چھوٹا بھائی ہے اور اُسی کالج میں پڑھتا ہے۔ جب جب میں حسین کے یہاں گپ شپ، چائے یا کھانے پر ہوتا، اکثر جمیل بھی ہوا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے باپ (بھائی جان) بھی۔ وہ اس لحاظ سے عجیب گھر تھا کہ یہاں پہنچ کر کسی بھی دوست یا مہمان سے پورا گھر ملتا تھا اور سبھی لوگ بات چیت میں شریک ہوتے تھے۔ مجھے بھائی جان کا اپنے بیچ ہونا کئی بار کھٹکتا تھا، کیوں کہ اس سے ہماری آزادی چھنتی تھی، لیکن جمیل کا ہونا مجھے اچھا لگتا تھا۔ دراصل مَیں جمیل کو شروع سے پسند کرتا تھا۔

اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ جمیل کا پہلے مجھ سے نہ ٹکرانا یا حسین کے وسیلے سے ملنا محض ایک اتفاق تھا، ورنہ شاید میں سیدھے اُسی کا دوست ہوتا۔ یہ بات تب بھی لگی تھی جب میں حسین کا اتا پتا کرنے کئی بار اُس کے گھر گیا تھا اور وہ مجھے نہیں ملا تھا۔ پھر میں دھیرے دھیرے حسین سے کٹ گیا تھا۔

"حسین بھائی سے آج کل شام کو ملنا مشکل ہے،" میری دو تین بار کی مایوسی کے بعد جمیل نے بتایا تھا۔ "دراصل یہ اور سیّد محمود اُسی چکّر میں ہیں۔"

"کس چکّر میں؟"

"تعجب ہے کہ آپ کو پتا نہیں! کیا آپ نہیں جانتے کہ دونوں باہر نکلنے کی جُگاڑ میں ہیں؟"

"باہر یعنی؟"

"باہر یعنی کہیں بھی۔ مڈل ایسٹ، لیبیا، افریقا، وہاں جہاں جاب ملے، اچھے پیسے ملیں۔ سیّد محمود کی تو مجبوری ہے، ایسے کالج کی ماسٹری میں وہ ویسے ہی کنگال ہے۔ چار چار بیٹیاں سر پر بیٹھی ہیں اور بیٹا پولیو کا شکار ہے۔ حسین بھائی کا یہ ہے کہ وہ بہتر زندگی چاہتے ہیں۔"

سیّد محمود تب بھوپال میں تھا اور اُسی کالج میں پروفیسر تھا۔ وہ ہم تینوں کا دوست تھا، لیکن کسی کے ساتھ نہیں آتا تھا کیوں کہ وہ ہر وقت جلدی میں ہوتا تھا، ایک ایسی بے چینی بھری جلدی جو اُسے کہیں دو پل سے زیادہ ٹکنے نہیں دیتی تھی۔ وہ آتا تو بیٹھتا نہیں تھا، بیٹھتا تو پر تولنے لگتا تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ اُس کے آتے ہی یہ دھڑکا لگ جاتا تھا کہ وہ کسی بھی پل چلا جائے گا۔ حسین کی اس سے دوستی ایک حد تک پیشے

کی وجہ سے تھی، لیکن مزاج کے لحاظ سے وہ میرے زیادہ نزدیک پڑتا تھا۔ پھر بھی مجھے تعجب نہیں ہوا، کیوں کہ دونوں ایک ہی مقصد کے لیے اکٹھے تھے، بھلے ہی کارن الگ الگ ہوں۔

"کیوں، بھاگ لیے؟" کئی دنوں کے بعد جب حسین پکڑ میں آیا تو میں نے اُسے دھر دبوچا۔ حسین نے مجھے اُسی انداز سے دیکھا جس میں اس کی چھوٹی موٹی آنکھیں گول ہو کر نکیلی ہو جاتی تھیں اور مغرور لگتی تھیں۔

"کون بھاگ رہا ہے؟"

"تم، اور کون!"

"میں بھاگ نہیں رہا، جا رہا ہوں۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"ایک ہی بات نہیں ہے!" اس نے زور دے کر کہا۔ "بھاگنے والے پاکستان میں ہیں اور وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔"

"تم کون لوٹ کر آنے والے ہو!"

"کیوں، کیا میں کالے حبشیوں کے بیچ مرنے جا رہا ہوں؟"

"کیا پتا؟"

"تم جیسے دوست تو یہی دعا کریں گے۔ کرو!"

"میدان تو چھوڑ ہی رہے ہو۔"

"دو چار سال کے لیے گھر سے نکلنا میدان چھوڑنا ہے؟ بھاگنا ہے؟" اس نے بوکھلا کر کہا۔ "میں اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہ سوچوں؟ یہیں پڑا سڑتا رہوں؟ اپنے آس پاس لچوں، لفنگوں، بدکاروں اور بدمعاشوں کو پنپتا ہوا دیکھتا رہوں؟ روز کڑھوں؟ روز لہو جلاؤں؟"

"مستقبل اور بچے تو میرے بھی ہیں،" میں نے کہا۔

"تم اگر کیچڑ میں پڑے رہنا چاہتے ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے!" وہ بولا۔ "نہ تو تم اوپر اٹھ سکتے ہو نہ اٹھنا چاہتے ہو۔"

"پیسوں کے پیچھے بھاگنا اوپر اٹھنا ہے؟"

"یہ بیماروں، نکموں اور بزدلوں کی فلاسفی ہے!" اس نے چلا کر کہا۔ "اِسے تم اپنے ہی پاس رہنے دو۔"

اور وہ تیزی سے چلا گیا۔

نائجیریا جانے سے پہلے حسین سے یہ میری آخری بات چیت تھی، کم سے کم اس سلسلے میں۔ اس کے بعد ہم ملے ضرور، لیکن ہر ملاقات سرسری تھی اور ہماری باتوں کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ ویسے بھی

Scanned with CamScanner

تب تک ہم ایک دوسرے سے کٹ چکے تھے۔ پھر ایک دن سُنا کہ وہ چلا گیا، مجھ سے ملے بنا اور مجھے کہیں گہرائی میں زخمی کرتا ہوا۔ گیا سیّد محمود بھی، لیکن اُس کا جانا ایک امید پر لگائی ہوئی چھلانگ تھی۔ وہ بیوی کے بچے کھچے زیور اور موروثی زمین بیچ کر سعودی عرب گیا تھا، جبکہ حسین کو نائجیریا کے کسی اسکول میں باقاعدہ کام ملا تھا اور اس کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ آیا تھا۔

"اَور کچھ لاؤں؟" کنیز مجھ سے کہہ رہی تھی، میرے سامنے کھڑی اور رکابی کی طرف بڑھتی ہوئی۔ میں جیسے چونکا۔

"اَور کیا؟"

"کباب یا ایک آدھ روٹی؟"

"بس بس،" میں نے کہا۔ "اوّل ہی بہت ہو چکا۔ قاعدے سے مجھے کھانا ہی نہیں کھانا چاہیے تھا۔ دوپہر کا کھانا اکثر میں ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں، خاص کر باہر۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اسے معمول بنا لو۔"

"اور تم نے مان لیا؟" جمیل نے مسکرا کر ٹوکا، اور میں ہنسنے لگا۔ جمیل جانتا تھا کہ دلّی کے یہ تین چار برس میں نے ڈاکٹروں کے پیچھے کتنی ایڑیاں رگڑی ہیں۔ ابھی دلّی میں پاؤں بھی نہیں جمے تھے کہ معلوم ہوا میں ایک مہلک بیماری کی چپیٹ میں ہوں۔ کیا کرتا؟ نفرت یا اُن کے خلاف اپنے بڑبولے پن نے میری کوئی مدد نہیں کی اور میں اسپتال پہنچ کر ایک فائل بن گیا تھا۔ کیس نمبر سی ۵۳۵۔

وہ دوزخ کے دن تھے۔

رکابی اٹھا کر کنیز گئی نہیں۔ کھڑی رہی۔ پھر دو پل مجھے گھور کر پوچھا، "ابھی پچھلے دنوں تمہارا کیا بارٹ وارٹ کا کچھ۔۔۔"

میں نے چونک کر دیکھا۔ ہاں، چوٹ لگی تھی۔ کیا کنیز کو خبر نہیں تھی؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس گھر میں کبھی میرے لیے نیم ماتم کا ماحول بنا ہوگا اور جب پہنچوں گا تو مجھے ایسے لیا جائے گا جیسے لگ بھگ کھویا ہوا آدمی اچانک برآمد ہو گیا ہو۔

"اِس کی بُری حالت ہو گئی تھی،" جمیل کنیز سے کہنے لگا۔ "میسو بارٹ اٹیک تھا۔ کوئی پچاس گھنٹے زندگی اور موت کے بیچ جھولتا رہا۔ وہ تو دلّی جیسی جگہ تھی، پیس میکر لگا کر بچا لیا، ورنہ خدا جانے کیا ہوتا!"

کنیز کا چہرہ ایک پل کے لیے سفید ہو گیا، خوف سے۔ اُس کے بہنوئی اِسی سے گئے تھے، سُسر اِسی سے، اور اب جیٹھ بھی۔ جیٹھ، یعنی حسین بھائی۔ جانے سے پہلے وہ سنبھلتے ہوئے بولی:

"اور سگریٹ پینا بھر مت چھوڑنا، اچھا!"

تھوڑی دیر بعد میری تپائی کے سامنے چائے کی ٹرے آ گئی۔ اسٹول کھینچ کر کنیز میرے سامنے بیٹھ گئی اور چائے بنانے لگی۔ اندر کے کمروں میں باجی تھیں، لیکن ان کے وہاں ہونے کا احساس یہاں سے مشکل تھا۔ پہلے تو خیر وہ نماز پڑھ رہی تھیں، لیکن اِتنی دیر میں نہ تو وہ باہر آئی تھیں اور مجھ میں ہی اتنی ہمّت تھی کہ اٹھ کر ان سے مل لوں۔ میں پھر دیواروں کو دیکھنے لگا جن پر کنیز کی پینٹنگز لگی ہوئی تھیں،

Scanned with CamScanner

برسوں سے انھیں جگہوں پر اور ویسی ہی۔ لیکن جیسے پہلی بار دھیان آیا کہ وہ طغروں کے آس پاس ہیں۔ ایک طغرہ تھا اللہ، دوسرا تھا محمدؐ۔ اُس دروازے کے اوپر جو گھر کے بھیتر کھُلتا تھا، قرآن کی ایک آیت تھی: انّ اللہ مع الصّبرین، یعنی صبر کرنے والوں کے ساتھ خدا ہے۔

کیا میں نے صبر کیا ہے؟ چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے سوچا۔ کیا میں نے اُن دوستوں کو معاف نہیں کیا تھا جو اسپتال میں مجھے دیکھنے یا مجھ سے ملنے نہیں آئے تھے؟ اور کیوں اُن دشمنوں کے لیے بھی میں نرم ہو گیا تھا جو میرے پلنگ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے؟

"یا اللہ!" تبھی اندر سے باجی کی گھبراتی ہوئی آواز آئی۔ "رضائے ربی!"

کنیز نے برتنوں کو ضرورت سے زیادہ آواز کرتے ہوئے سمیٹا اور ٹرے میں رکھنے لگی، ایک کے بعد ایک۔ پھر اٹھ کر چلی گئی۔

"باجی کو کیسے سنبھالا تھا؟" کچھ پل کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔

"سب اپنے آپ سنبھل جاتے ہیں،" وہ بولا۔ "جس وقت حسین بھائی کی خبر نائجیریا سے ملی تھی، باجی سخت بیمار تھیں۔ لگتا تھا بچیں گی نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ ڈاکٹر سے پوچھا تو کہنے لگا، پتا نہیں ایسی حالت میں یہ صدمہ برداشت بھی کر پاتی ہیں یا نہیں، لیکن انھیں نہ بتانا بھی تو زیادتی ہو گی۔ آخر کب تک چھپاؤ گے؟ میں دو دنوں تک سب سے لڑتا رہا کہ انھیں نہ بتایا جائے۔ تم تو جانتے ہو، وہ حسین بھائی کو ہم سب سے زیادہ چاہتی تھیں۔ میرا کہنا تھا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ انھیں کبھی پتا ہی نہ چلے۔ جھوٹی چٹھیاں منگوائی جا سکتی ہیں، یا ایسا ہی کچھ۔ زیادہ سے زیادہ انھیں اتنی ہی چوٹ تو لگتی نا کہ لڑکے نے آنکھیں پھیر لیں اور نالائق نکل گیا؟ لیکن آخر مجھے ہی ہارنا پڑا۔ پھر انھیں بتایا گیا، اور اب سب کچھ تمھارے سامنے ہے۔۔۔"

میں نے پوچھ تو لیا، لیکن پوچھنے کے ساتھ ہی مجھے اپنے سوال کے بےتُکے پن کا دھیان آیا۔ یہ وہی سوال تھا جو ہر ملنے والا مجھ سے بھی پوچھتا تھا اور مجھے جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ میں کہنے لگا، "میرا مطلب ہے کہ اس سے پہلے کچھ۔۔۔"

"نہیں، کبھی کچھ نہیں۔ دو ایک دن پہلے اپنی طبیعت کے ٹھیک نہ ہونے کی شکایت ضرور کر رہے تھے۔ بھابھی سے کہہ رکھا تھا کہ شام کو ڈاکٹر کے پاس چلے چلیں گے۔ شام کو وہ تیار بھی ہو گئے تھے، لیکن اُسی وقت ان کا ایک پاکستانی دوست آ گیا، ایک وڈیو کیسٹ کے لیے، اور وہ ٹی وی دیکھنے لگے۔ شاید تم نہیں جانتے کہ ادھر انھوں نے ہندی فلم کے کیسٹوں اور ہندوستانی سنگیت کے ایل پیز (LPs) کا کتنا بڑا ذخیرہ کر رکھا تھا۔"

ہاں، میں نہیں جانتا تھا۔ سات سال پہلے جب حسین یہاں تھا تو وہ ہندی فلموں سے نفرت کرتا تھا اور اسے ہندوستانی سنگیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"اپنے پاکستانی دوست کو ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر وہ اندر ایک کیسٹ لینے گئے تھے، لیکن کیسٹ

Scanned with CamScanner

دیکھتے دیکھتے انہیں بے چینی ہوئی اور وہ لیٹ گئے۔ بس، مشکل سے دو منٹ لگے ہوں گے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ان کا کفن دفن وہیں ہو چکا ہو گا۔ ہم لوگ رو دھو کر چپ بھی ہو چکے تھے۔ کوئی دس بارہ دنوں بعد جب بھابھی اور بچوں کو لینے بمبئی پہنچا تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ نائیجیریا سے حسین بھائی کا تابوت لے کر آئی ہیں۔ پھر سب کے زخم کھلے، پھر ایک بار نئے سرے سے ماتم ہوا۔۔۔"

"اور نصیب کی سنگ دلی تو دیکھو،" تھوڑی دیر ٹھہر کر جمیل کہنے لگا، "اسے تب ہونا تھا جب وہ لوٹنے ہی کو تھے۔ ابھی چھ مہینے پہلے جب وہ یہاں آئے تھے تو کہنے لگے، بس کچھ دنوں کی بات اور ہے، اس کانٹریکٹ کے ختم ہونے کے بعد میں ہندوستان لوٹ آؤں گا۔ کہنے لگے، اب اور وہاں نہیں رہا جاتا۔ کچھ بھی کہو، اپنا ملک پھر اپنا ملک ہے۔۔۔ انھوں نے یہاں شملہ ہلز میں اپنی پسند کا شان دار مکان بنوا لیا تھا۔ لوٹنے کے بعد وہ یہاں کیا کریں گے، یہ طے ہو چکا تھا، اور وہ بہت خوش تھے۔ تب انھوں نے کبھی نہیں سوچا ہو گا کہ جس گھر کی ایک ایک اینٹ انھوں نے اتنے پیار سے رکھوائی تھی، اس میں وہ کبھی نہیں رہ پائیں گے۔۔۔ پچھلی بار ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ جب میں انہیں ایرپورٹ چھوڑنے گیا تھا تو زندگی میں پہلی بار ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ ایکا ایک جی میں آیا تھا کہ انہیں بہت زور سے بھینچ لوں، ایک دم کلیجے سے لگا کر، لیکن پھر لگا کہ یہ کوری جذباتیت ہو گی۔ حسین بھائی کون ہمیشہ کے لیے جا رہے ہیں! اور اپنے کو روک کر میں نے وہ موقع ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ اب وہی تکلیف اتنی بڑی کسک بن گئی ہے کہ ہر وقت مجھے تنگ کرتی رہتی ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ ہم اکثر کسی زعم، کسی سیانے پن، یا کسی نامعلوم سی ضد کے تحت ایسے موقعوں کو کھوتے رہتے ہیں جن میں اکثر وہ آدمی چھپا ہوتا ہے۔ ہم انھیں آگے کے لیے ملتوی کر دیتے ہیں، بنا یہ جانے کہ وہ ہماری زندگی میں پھر کبھی نہیں آئیں گے۔۔۔"

کنیز نے پان کی طشتری میری طرف بڑھا دی۔ وہ کب پاندان لے کر آ بیٹھی تھی، مجھے پتا نہیں تھا۔ میں نے چپ چاپ پان لے لیا۔

میں جانتا تھا کہ جمیل نے مجھے کہیں گہرے چھو لیا ہے۔ لیکن کیا وہ صرف چھونا تھا، اپنی گرفت میں لے کر نچوڑنا نہیں؟ میں سامنے کی دیوار کی طرف دیکھنے لگا جس پر طغرہ لگا ہوا تھا: اللہ، اللہ، اللہ۔ دیکھتے ہوئے۔

پھر تصویریں آئیں حسین کی۔ حسین بھائی اپنے باغ میں تینوں چھوٹے بچوں کے ساتھ، حسین بھائی اپنی گاڑی میں اسٹیئرنگ کے سامنے جبکہ بھابھی کار کا دروازہ پکڑے کھڑی ہیں۔ میں نے وہ تصویر اٹھا لی جو ادھر حال کی تھی، شاید یہاں کی۔ اس میں صرف حسین تھا، صرف اُس کا ہنستا ہوا چہرہ۔ تصویر میں وہ بہت تیزی سے بڑھاتا ہوا لگا اور یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کے چہرے پر طمانیت کی کوئی چھاپ نہیں تھی۔ اُلٹے وہ کسی پیڑ کی طرح سُوکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ گنجا ہو گیا تھا اور اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔

"یہ تو یہیں کی لگتی ہے،" میں نے کہا۔

Scanned with CamScanner

"ہاں، وہ اسی جگہ لیٹے تھے اور میں نے تصویر لے لی تھی۔ ابھی پچھلی بار۔"

"اس میں حجامت کیوں بڑھی ہوئی ہے؟"

"ادھر انھوں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ تم ان سے کب ملے تھے؟"

"تین چار سال پہلے، یہیں پر۔ اُس بار میں دلّی سے آیا تھا تو اتفاق سے وہ یہیں تھا۔ بیچ میں ایک آدھ بار وہ اپنے ویزا وغیرہ کے سلسلے میں دلّی آیا تو اس نے خبر بھیجی تھی اور میرے گھر پہنچا تھا، لیکن میں جانے کہاں اُلجھا ہوا تھا کہ وقت پر نہیں پہنچ سکا اور وہ بنا ملے چلا گیا۔"

میں جمیل سے صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں حسین سے ملنا نہیں چاہتا تھا اور اُسے جان بوجھ کر ٹال گیا تھا۔ شاید میں اس سے بچنا چاہتا تھا، پتا نہیں کیوں۔ حالاں کہ میں اُسی کی تصویر ہاتھ میں لیے بڑی دیر سے دیکھ رہا تھا اور مجھے ایک بے چین کرنے والی اور نامعلوم سی تکلیف ہو رہی تھی۔

"معلوم ہے جب مجھے دورہ پڑا تو ڈاکٹروں نے کیا پوچھا تھا؟"

جمیل میری طرف دیکھنے لگا۔ کنیز وہاں سے جا چکی تھی اور ہم دونوں اکیلے تھے۔

"کہنے لگا: بتائیے، جس دن آپ کو یہ تکلیف ہوئی اُس دن یا اُس سے ایک دو دن پہلے کیا ہوا تھا؟ کسی طرح کا تناؤ، کوئی صدمہ، کوئی ایسی ویسی خبر جس نے آپ کو ڈسٹرب کیا ہو؟ میں نے کہا: نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرٹھ میں فساد ہو رہے تھے، لیکن وہاں میرا کوئی عزیز نہیں تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ پرانی دلّی میں تناؤ تھا اور کرفیو لگا ہوا تھا، لیکن میں تو نئی دلّی میں رہ رہا تھا۔ پھر میں نے کچھ سوچ کر حسین کا بتا دیا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ وہ میرا دوست ضرور تھا لیکن اِدھر کئی برسوں سے ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے تھے۔ اب لگتا ہے کہ پتا نہیں اُس بات میں کہاں تک سچائی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ سب کچھ کے باوجود حسین ایک صاف، ایمان دار اور نیک آدمی تھا، اور میں اُس سے بہت پیار کرتا تھا، بہت۔۔۔"

اور یہ کہتے کہتے میں نے دیکھا کہ میرا گلا رُندھ گیا ہے، آنکھیں بھر آئی ہیں اور میں سچ مچ رونے لگا ہوں۔۔۔

ہاں، سچ مچ۔

**

اصغر وجاہت

ہندی سے ترجمہ: عبدالعظیم سومرو

کیک

انھوں نے میز پر ایک زوردار گھونسا مارا اور میز بہت دیر تک ہلتی رہی۔

"میں کہتا ہوں کہ جب تک ایٹ اے ٹائم پانچ سو لوگوں کو گولی سے نہیں اُڑا دیا جائے گا، حالات ٹھیک نہیں ہو سکتے!" اپنی خاصی اسپیکنگ پاور برباد کر کے وہ ہانپنے لگے۔ پھر انھوں نے اپنا اوپری ہونٹ نچلے ہونٹ سے دبا کر مجھے گھورنا شروع کیا۔ وہ یقیناً سمجھ گئے تھے کہ میں مسکرا رہا ہوں۔ پھر انھوں نے گھورنا بند کر دیا اور اپنی پلیٹ پر پل پڑے۔

روز ہی رات کو سیاست پر بات ہوتی ہے۔ دن کے دو بجے سے رات کے آٹھ بجے تک پروف ریڈنگ کا گھٹیا کام کرتے کرتے وہ کافی کھسیا اٹھتے ہیں۔

میں نے کہا، "ان پانچ سو لوگوں میں آپ اپنے کو بھی جوڑ رہے ہیں؟"

"اپنے کو کیوں جوڑوں؟ کیا میں کُروک پالیٹیشن ہوں، یا اسمگلر ہوں، یا کروڑوں کی چور بازاری کرتا ہوں؟" وہ پھر مجھے گھورنے لگے تو میں ہنس دیا۔ وہ اپنی پلیٹ کی طرف دیکھنے لگے۔

"آپ لوگ تو کسی بھی چیز کو سیریسلی نہیں لیتے ہیں۔"

کھانا ختم ہونے کے بعد انھوں نے جوٹھی پلیٹیں اٹھائیں اور کچن میں چلے گئے۔ کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے مسز ڈی سوزا نے کہا، "ڈیوڈ، میرے لیے پانی لیتے آنا۔"

ڈیوڈ جگ بھر کر پانی لے آئے۔ مسز ڈی سوزا کو ایک گلاس دینے کے بعد بولے، "پی لیجیے مسٹر، پی لیجیے!"

میرے انکار کرنے پر جلے کٹے طریقے سے بولے، "تھینکس ٹو گاڈ! یہاں دن بھر پانی تو مل جاتا

ہے۔ اگر اندر پوری میں رہتے تو پتا چل جاتا۔ خیر، آپ نہیں پیتے تو میں ہی پی لیتا ہوں۔ "کہہ کر وہ تین گلاس پانی پی گئے۔

کھانے کے بعد اسی میز پر ڈیوڈ صاحب کام شروع کر دیتے ہیں۔ آج بھی وہ پروف کا پلندا کھول کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے میز صاف کی۔ میز کے ایک پائے کی جگہ رکھی اینٹوں کو ہاتھ سے ٹھیک کیا تاکہ میز ہل نہ سکے۔ پھر ٹوٹی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اچانک اکڑ گئے اور ناک پر چشمہ اس طرح فٹ کیا جیسے بندوق میں گولیاں بھر لی ہوں۔ ہونٹ خاص طرح سے دبا لیے۔ پروف مسوّدے سے ملانے لگے۔ گولیاں چلنے لگیں۔ اسی طرح ڈیوڈ صاحب رات بارہ بجے تک پروف دیکھتے رہتے ہیں۔ اس بیچ وہ کم سے کم پچاس بار چشمہ اتارتے اور لگاتے ہیں۔ بندوق میں کچھ خرابی ہے۔ پانچ سال پہلے آنکھ ٹیسٹ کروائی تھی اور چشمہ خریدا تھا۔ اب آنکھ زیادہ کمزور ہو چکی ہے، لیکن چشمے کا نمبر نہیں بڑھ پایا ہے۔ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو وہ اگلے مہینے آنکھ ٹیسٹ کروا کے نیا چشمہ خریدنے کی بات کرتے ہیں۔ بندوق کی قیمت بہت بڑھ چکی ہے۔ پروف دیکھنے کے درمیان پانی پییں گے تو "باسو کی جے" کا نعرہ لگائیں گے۔ باسو ان کا باس ہے جس سے انھیں کئی درجن شکایتیں ہیں۔ جہاں تک میری سمجھ میں آتا ہے، وہ سب جائز ہیں۔ ویسی ہی تین درجن شکایتیں مجھے بھی ہیں۔ ایسی شکایتیں بیشتر چھوٹا کام کرنے والوں کو ہوتی ہیں۔

"بڑا جان لیوا کام ہے صاحب،" وہ دو ایک بار سر اٹھا کر مجھ سے کہتے ہیں۔ میں ہُوں ہاں میں جواب دے کر بات آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ لیکن وہ چپ نہیں ہوتے۔ چشمہ اتار کر آنکھوں کی رگڑائی کرتے ہیں۔ "بڑی ہائی لیول ہنگنگ ہوتی ہے۔ اب تو چھوٹے موٹے کرپشن کیس پر کوئی چونکتا تک نہیں۔ پوری مشینری سڑ گل چکی ہے۔ یہ آدمی نہیں کتے ہیں کتے! میں بھی آزادی سے پہلے گاندھی کا اسٹانچ سپورٹر تھا اور سمجھتا تھا کہ نان وائلنس از دی بیسٹ پالیسی۔ لیکن اب سوچتا ہوں کہ وہ چوتیا پا ہے۔ وائلنس از دی بیسٹ پالیسی! لٹکا دو پانچ سو آدمیوں کو سُولی پر! ارے، ان سالوں کا پبلک ٹرائل ہونا چاہیے، پبلک ٹرائل!"

"پبلک ٹرائل کون کرے گا ڈیوڈ صاحب؟" میں جھلا جاتا ہوں۔ اتنی دیر سے وہ لگاتار بکواس کر رہے ہیں۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

"ماسز ہیں اگر لیفٹ فورسز۔۔۔" وہ دھیرے دھیرے بہت دیر تک بڑبڑاتے رہتے ہیں۔

میں جاسوسی ناول کے ہیرو کو ایک بار پھر گولیوں کی بوچھار سے بچا دیتا ہوں۔

وہ کہتے ہیں، "آپ بھی کیا دو ڈھائی سو روپے کے لیے گھٹیا ناول لکھا کرتے ہیں۔" میں مسکرا کر اُن کے پروف کے پلندے کی طرف دیکھتا ہوں، اور وہ چپ ہو جاتے ہیں۔ گمبھیر ہو جاتے ہیں۔

"میں سوچتا ہوں برادر، کیا ہم تم اسی طرح پروف پڑھتے اور جاسوسی ناول لکھتے رہیں گے؟ سوچو تو یار، دنیا کتنی بڑی ہے۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ کتنی اچھی طرح سے زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ کتنا آرام

ور سکہ ہے، کتنی بیوٹی ہے۔۔۔"

"پریشانی تو میرے لیے ہے ڈیوڈ صاحب۔ آپ تو بہت سے کام کر سکتے ہیں۔ مرغی خانہ کھول سکتے ہیں، بیکری لگا سکتے ہیں۔۔۔"

وہ آنکھیں بند کر کے بے یقینی کی ہنسی ہنسنے لگتے ہیں اور کمرے کی ہر ٹھوس چیز سے ٹکرا کر ان کی ہنسی ان کے منھ میں واپس چلی جاتی ہے۔

اکثر کھانے کے بعد وہ ایسی ہی باتیں چھیڑ دیتے ہیں۔ کام میں من نہیں لگتا اور وقت بوجھ لگنے لگتا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ لوہے کی ایک بڑی سی راڈ لے کر کسی فیشن ایبل علاقے میں نکل جاؤں۔ ڈیوڈ صاحب تو ساتھ چلنے پر تیار ہو ہی جائیں گے۔ پھر وہ بولنے لگتے ہیں، اور ان کے پیارے الفاظ "بچ"، "کروک"، "نان سنس"، "بنگلنگ"، "پبلک ٹرائل"، "ایکسپلائٹیشن"، "کلاس اسٹرگل" وغیرہ بار بار سنائی پڑتے ہیں۔ بیچ بیچ میں وہ ہندوستانی گالیاں فراٹے سے بولتے ہیں۔

"اب کیا ہو سکتا ہے؟ پچیس سال تک پروف ریڈری کے بعد اب اور کیا کر سکتا ہوں؟ سن ۱۹۴۸ میں دلی آیا تھا۔ ارے صاحب، ڈ۔۔ ں کالونی کی زمین تین روپے گز میرے سامنے بکی ہے جس کا دام آج چار سو روپے ہے۔ نظام الدین سے اوکھلا تک جنگل تھا جنگل۔ کوئی شریف آدمی رہنے پر تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ اگر اُس وقت نظام الدین میں زمین خرید لی ہوتی تو آج لکھ پتی ہوتا۔ لیکن اُس وقت اتنا پیسا نہیں تھا، اور آج۔۔۔ سینیئر کیمبرج میں میرے ساتھ پونٹی پڑھتا تھا۔ اب اگر آپ آج اُسے دیکھ لیں تو مان ہی نہیں سکتے کہ میں اس کا کلاس فیلو اور دوست تھا۔ گورا چٹا رنگ، اے کلاس صحت، ایک جیپ، یمبیسیڈر اور ٹریکٹر ہے اس کے پاس۔ مرزاپور کے پاس فارمنگ کرواتا ہے۔ اُس زمانے میں دس روپے بیگھا زمین خریدی تھی اس نے۔ مجھ سے بہت کہا تھا کہ تم بھی لے لو ڈیوڈ بھائی جا، پانچ سو بیگھے۔ بالکل اسی کے فارم کے سامنے پانچ سو بیگھے کا پلاٹ تھا۔ اے کلاس فرٹائل زمین! لیکن اس زمانے میں مَیں کچھ اور تھا۔" وہ کھسیانی ہنسی ہنسے۔ "آج اُس کی آمدنی تین لاکھ روپے سال ہے۔ اپنی ڈیری، اپنا مرغی خانہ۔ ٹھاٹھ ہے صاحب ٹھاٹھ۔" ڈیوڈ صاحب خوش ہو گئے جیسے وہ سب انھیں کا ہو۔ پروف کے پلندے کو اٹھا کر ایک کونے میں رکھتے ہوئے بولے، "میری تو قسمت میں اِس شاندار کمرے میں مسز ڈی سوزا کا کرایہ دار ہونا لکھا تھا۔"

مسز ڈی سوزا کو پچاس روپے دو، کمرہ مل جائے گا۔ پچیس روپے اور دو تو صبح ناشتا مل جائے گا، اور تیس روپے دو رات کا کھانا، جسے مسز ڈی سوزا انگریزی کھانا کہتی ہیں، مل جائے گا۔ مسز ڈی سوزا کے کمرے میں لگی تصویروں کو، جو اکثر اُن کے جوانی کے دنوں کی ہیں، کرایہ دار ہٹا نہیں سکتا۔ کسی تصویر میں وہ موم بتی کے سامنے بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہیں تو کسی میں اپنے بال گود میں رکھے خلا میں دیکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ تصویروں میں سے کچھ لوگوں کا تعارف انگریزی افسر کے طور پر کراتی ہیں، پر دیکھنے میں وہ سب ہندوستانی لگتے ہیں۔ ایک تصویر مسز ڈی سوزا کی لڑکی کی بھی ہے جو ڈیوڈ صاحب کی ۔۔ پر

رکھی رہتی ہے۔ لڑکی حقیقت میں کنٹاپ ہے۔ چھنال پنا اس کے چہرے سے ایسا ٹپکتا ہے کہ اگر سامنے کوئی برتن رکھ دے تو دن میں دسیوں بار خالی کرنا پڑے۔ اسے صرف دیکھ کر اچھے اچھے دونوں ہاتھوں سے دبا لیتے ہوں گے۔ کچھ پڑوس والوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسی تصویر کو دیکھ دیکھ کر ڈیوڈ صاحب نے شادی کرنے اور بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے ہاتھ دھو لیے ہیں۔ مسز ڈیمی سوزا دیسی عیسائیوں کی کئی لڑکیاں ان کے لیے کھوج چکی ہیں۔ مگر سب بے کار۔ وہ تو ڈھائی سو وولٹیج کے کرنٹ سے جل بھن کر راکھ ہو چکے ہیں۔ اور ایک دن تنگ آ کر مسز ڈیمی سوزا نے محلے میں ان کے نامرد ہونے کا اعلان کر دیا اور ان کے سامنے کپڑے بدلنے لگیں۔

صبح کا دوسرا نام ہوتا ہے جلدی۔ جلدی جلدی بنا دودھ کی چائے کے کچھ کپ۔ رات کے دھوئے کپڑوں پر الٹی سیدھی پریس۔ جوتے پر پالش۔ اور دن بھر پروف کریکٹ کرتے رہنے کے لیے آنکھوں کی ساج۔ پروف کے پلندے، کریکٹ کیے ہوئے اور پریس سے آئے ہوئے۔ پھر کریکٹ کیے ہوئے اور پھر آئے ہوئے۔ دھم! سالا زور سے گیلی دے مارتا ہے۔ "دیکھ لو بابو، جلدی دیکھ دو۔ بڑا صاحب کالم دیکھنا نکتا ہے!" پوری زندگی گھٹیا قسم کے کاغذ پر چھپا پروف ہو گئی ہے جسے ہم لگاتار کریکٹ کر رہے ہیں۔

گھر سے باہر نکل کر جلدی جلدی بس اسٹاپ کی طرف دوڑنا، جیسے کسی کو پکڑنا ہو۔ ہم دونوں ایک نمبر کی بس پکڑتے ہیں۔ راستے میں ڈیوڈ صاحب مجھ سے روز ایک سی باتیں کرتے ہیں: ہری سبزیوں ، کیا فائدہ ہے۔ کس سبزی میں کتنا اسٹارچ ہوتا ہے۔ انڈے اور مرغی کھاتے رہیں تو اسی سال کی عمر بھی لڑکا پیدا کر سکتے ہیں۔ بکری اور بھینس کے گوشت کا نازک فرق انھیں اچھی طرح معلوم ہے۔ بڑی کھانے کے بارے میں ان کی معلومات لامحدود ہیں۔ کیک میں کتنا میدہ ہونا چاہیے، کتنے انڈے لے جائیں، میوے اور جیلی کو کیسے ملایا جائے، دودھ کتنا پھینٹا جائے۔ کیک کی سکائی کے بارے میں ان ←ں ترکیبیں ہیں۔ کریم لگانے اور کیک کو سجانے کے ان کے پاس سیکڑوں فارمولے ہیں جن کو ستان میں اب کوئی نہیں جانتا۔ کبھی کبھی کہتے ہیں، "یہ سالے دھوتی باندھنے والے، کھانا کھانا کیا ،۔ ڈھیر ساری سبزی لے لی، تیل میں ڈالی اور کھا گئے۔ بس! کھانا پکانا اور کھانا مسلمان جانتے ہیں یا ۔ انگریز تو چلے گئے، سالے مسلمانوں کے پاس بھینسے کا گوشت کھا کھا کر عقل موٹی کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ بھینسے کا گوشت کھاؤ، بھینسے کی طرح عقل موٹی ہو جائے گی، اور پھر بھینسے ہی کی طرح میں چلے رہو۔ رات گھر آ کر بیوی پر بھینسے کی طرح پل پڑو!"

آج پھر گھوم کر وہ اپنے موضوع پر آ گئے۔

"ناشتا تو بیوی ہونا ہی چاہیے۔"

میں نے ہامی بھری۔ اس بات سے تو کوئی الو کا پٹھا ہی انکار کر سکتا ہے۔

"بیوی اور انرجیٹک۔" چلتے چلتے اچانک رک گئے۔ ایک نئے بنتے ہوئے مکان کو دیکھ کر بولے،

Scanned with CamScanner

"کسی بلیک مارکٹیئر کا معلوم ہوتا ہے!" پھر انھوں نے اکڑ کر جیب سے چشمہ نکالا، آنکھوں پر فٹ کر کے مکان کی طرف دیکھا۔ فائر ہوا، زوردار دھماکے کے ساتھ، اور سارا مکان اڑاڑاد دھم کر کے گر گیا۔

"بس، ایک گلاس دودھ، چار ٹوسٹ اور مکھن، پورج اور دو انڈے!" انھوں نے ایک لمبی سانس کھینچی، جیسے غبارے میں سے ہوا نکل گئی ہو۔

"نہیں، میں آپ سے ایگری نہیں کرتا۔ فروٹ جوس بہت ضروری ہے۔ بنا۔۔۔"

"فروٹ جوس؟" وہ بولے۔ "نہیں، اگر دودھ ہو تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پراٹھے اور انڈے کا ناشتا کیسا رہے گا؟"

"ویری گڈ! لیکن پراٹھے ہلکے اور نرم ہوں۔"

"اور اگر ناشتے پر کیک ہو؟"

وہ سپاٹ اور پھیکی ہنسی ہنسے۔

کئی سال ہوئے، میرے دلّی آنے کے آس پاس، ڈیوڈ صاحب نے اپنی برتھ ڈے پر کیک بنایا تھا۔ پہلے پورا بجٹ تیار کر لیا گیا تھا۔ سب خرچ جوڑ کر کل ستر روپے ہوتے تھے۔ پہلی تاریخ کو ڈیوڈ صاحب میدہ، شکر اور میوہ لینے کھاری باولی گئے تھے۔ سارا سامان گھر میں پھر سے تولا گیا تھا۔ پھر اچھے بیکر کا پتا لگایا گیا تھا۔ ڈیوڈ صاحب کے کئی دوستوں نے دریا گنج کے ایک بیکر کی تعریف کی تو وہ ایک دن اس سے بات کرنے گئے، بالکل اسی طرح جیسے دو ملکوں کے وزیرِ اعظم سنگین مسائل پر مذاکرات کرتے ہیں۔ ڈیوڈ صاحب نے اس کے سامنے ایک ایسا سوال رکھ دیا کہ وہ لاجواب ہو گیا۔ "اگر تم نے سارا سامان کیک میں نہ ڈالا اور کچھ بچا لیا تو مجھے کیسے پتا چلے گا؟" اس مسئلے کا حل بھی انھوں نے خود کھوج لیا۔ کوئی ایسا آدمی ملے جو بیکر کے پاس اس وقت تک بیٹھا رہے جب تک کیک بن کر تیار نہ ہو جائے۔ مسز ڈی سوزا نے اس کام کے لیے اپنے آپ کو کئی بار آفر کیا، مگر اصل میں ڈیوڈ صاحب کو مسز ڈی سوزا پر بھی اعتبار نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے بیکر اور مسز ڈی سوزا مل کر ڈیوڈ صاحب کو چوٹ دے دیں۔ جب پوری دلّی میں معتبر آدمی نہیں ملا تو ڈیوڈ صاحب نے ایک دن کی چھٹی لی۔ میں نے اس کام میں کوئی دل چسپی نہیں دکھائی تھی اس لیے وہ اُن دنوں مجھ سے ناراض تھے اور میری پیٹھ پیچھے انھوں نے مسز ڈی سوزا سے کئی بار کہا کہ "سالا جانتا ہی نہیں کیک کیا ہوتا ہے!" میں جانتا تھا کہ کیک بن جانے کے بعد کسی بھی رات کو کھانے کے بعد مرغی خانہ کھولنے والی بات کر کے ڈیوڈ صاحب کو خوش کیا جا سکتا ہے یا ان کے اُس دوست کے بارے میں بات کر کے انھیں جوش میں لایا جا سکتا ہے جس کا مرزا پور کے پاس بڑا فارم ہے اور وہ وہاں کیسے رہتا ہے۔

کیک برتھ ڈے سے ایک دن پہلے آ گیا تھا۔ اب اُسے رکھنے کا مسئلہ تھا۔ مسز ڈی سوزا کے گھر میں چوہے ضرورت سے زیادہ ہیں۔ اس آڑے وقت میں مَیں نے ان کی مدد کی۔ اپنے ٹین کے بکس میں سے کپڑے نکال کر تولیے میں لپیٹ کر میز پر رکھ دیے اور بکس میں کیک رکھ دیا۔ اور میرا بکس پورے ایک

Scanned with CamScanner

مہینے تک گھر رہا۔

ہم سب کو اس کیک کے بارے میں بات چیت کر لینا اب بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ ڈیوڈ صاحب تو اُسے اپنا سب سے بڑا اچیومنٹ مانتے ہیں۔ اور میں اپنے بکس کو خالی کر دینا کوئی چھوٹا کارنامہ نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک کیک بنوانے کے کئی پروگرام بن چکے ہیں۔ اب ڈیوڈ صاحب کی شرط یہ ہوتی ہے کہ سب شیئر کریں۔ زیادہ مُوڈ میں آتے ہیں تو آدھا خرچ اٹھانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کے بقول بچپن سے انھیں دو چیزیں پسند رہی ہیں: جُولی اور کیک۔ جُولی کی شادی کسی کیپٹن سے ہو گئی تو وہ دھیرے دھیرے اُسے بھولتے گئے۔ پر کیک اب بھی پسند ہے۔ کیک کے ساتھ کون شادی کر سکتا ہے؟ لیکن کھاری باولی کے کئی چکر لگانے پر انھوں نے محسوس کیا کہ کیک کی بھی شادی ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی پسند کرنا بند نہ کر سکے۔

دفتر سے لوٹ کر آیا تو سارا بدن اس طرح درد کر رہا تھا جیسے بُری طرح سے مارا گیا ہو۔ باہر دروازہ کھولنے کے لیے مسز ڈی سوزا آئیں۔ وہ شاید کچن میں اپنے کھٹولے پر سو رہی تھیں۔ اندر آنگن میں ان کے پوشیدہ کپڑے سوکھ رہے تھے۔ "پوشیدہ کپڑے" کے لفظ سوچ کر ہنسی آئی۔ کوئی انگ پوشیدہ ہی کہاں رہ گیا ہے! ڈی ٹی سی کی بسوں میں چڑھتے اترتے پوشیدہ حصوں کے جغرافیے کی اچھی خاصی معلومات ہو گئی ہیں۔ اُن کی گرماہٹ، چکنائی، کھردرے پن، گندے پن اور لُبھاونے پن کے بارے میں خاصا علم ہے۔ "آج جلدی چلے آئے؟" مسز ڈی سوزا پوشیدہ کپڑے اتارنے لگیں۔ "چائے پیو گے؟ میں نے ابھی تک نہیں پی ہے۔"

"ہاں ضرور!" سوچا، اگر سالی نے پی لی ہوتی تو کبھی نہ پوچھتی۔

کمرے کے اندر چلا آیا۔ پتھر کی چھت کے نیچے کھانے کی میز لگی ہے جس کے ایک پائے کی جگہ اینٹیں لگی ہیں۔ دوسرے پایوں کو ٹین کی پٹیوں سے جکڑ کر کیلیں ٹھونک دی گئی ہیں۔ رسی، ٹین، لوہے، تار اور اینٹوں کے سہارے کھڑی میز پہلی نظر میں کوئی قدیم مشین سی لگتی ہے۔ میز کے اوپر مسز ڈی سوزا کی سلائی مشین رکھی ہے۔ کھانے کھاتے وقت مشین کو اٹھا کر میز کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد مشین پھر میز پر آ جاتی ہے۔ رات میں ڈیوڈ صاحب اسی میز پر بیٹھ کر پروف دیکھتے ہیں، کئی گلاس پانی پیتے ہیں اور ایک بجتے بجتے اُٹھتے ہیں تو کمرہ اکیلا ہو جاتا ہے۔ میں اس کمرے میں رکھی سلائی مشین یا میز کی طرح کمرے کا ایک حصہ بن جاتا ہوں۔

"یہ لو نی، گرین لیبل ہے!" مسز ڈی سوزا نے چائے کی پیالی تھما دی۔

وہ کھانوں کے نام انگریزی میں لیتی ہیں۔ روٹی کو بریڈ کہتی ہیں، دال کو پتا نہیں کیوں انھوں نے سُوپ کہنا شروع کر دیا ہے۔ سبزی کو "بوائلڈ ویجی ٹیبلز" کہتی ہیں، کریلوں کو "ہاٹ ڈِش" کہتی ہیں۔ مسز ڈی سوزا تھوڑی بہت گوراشاہی انگریزی بھی بول لیتی ہیں جس سے محلّے کے لوگ کافی متاثر ہوتے ہیں۔ میں

Scanned with CamScanner

نے ٹی لے لی۔ مسز ڈی سوزا آج کے زمانے کا مقابلہ پہلے زمانے سے کرنے لگیں۔ انہیں چالیس سال تک کی چیزوں کے دام یاد ہیں۔ اس کے بعد اپنے مکان کا ذکر ان کا پسندیدہ موضوع ہے، جس کا سیدھا مطلب ہم لوگوں پر رعب ڈالنا ہوتا ہے۔ ویسے رعب ڈالتے وقت یہ بھول جایا کرتی ہیں کہ دونوں کمرے کرائے پر اٹھا دینے کے بعد وہ خود کچن میں سوتی ہیں۔ میں ان کی بکواس سے تنگ آ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ اگر ڈیوڈ صاحب ہوتے تو مزہ آتا۔ وہ مسز ڈی سوزا کو مرغی خانہ کھول کر لکھ پتی ہو جانے کا راز بتاتے اور مسز ڈی سوزا منہ کھول کر اور آنکھیں پھاڑ کر مرغی پالنے کی باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتیں۔

"زیادہ نہیں، صرف دو ہزار روپے سے کام شروع کرے کوئی۔ چار سو مرغیوں سے شاندار کام چالو ہو سکتا ہے۔ چار سو انڈے روز کا مطلب ہے کم سے کم سو روپے روز۔ ایک مہینے میں تین ہزار روپے اور ایک سال میں چھتیس ہزار روپے۔ میں تو آنٹی لائف میں کبھی نہ کبھی ضرور کروں گا کاروبار۔ فائدہ؟ میں کہتا ہوں، چار سال میں لکھ پتی! پھر انڈے مرغی کھانے کا آرام الگ۔ روز ایک مرغی کاٹیے سالی کو! بیس انڈوں کی پڈنگ بنائیے۔ تب یہ مکان آپ چھوڑ دیجیے گا آنٹی۔ یہ بھی کوئی آدمیوں کے رہنے لائق مکان ہے! پھر تو مہارانی باغ یا بسنت وہار میں کوٹھی بنوائیے گا۔ ایک گاڑی لے لیجیے گا۔"

تب تھوڑی دیر کے لیے وہ دونوں بسنت وہار پہنچ جایا کرتے۔ بڑی سی کوٹھی کے پھاٹک کے داہنی طرف پیتل کی چمچماتی ہوئی پلیٹ پر ایرک ڈیوڈ اور مسز جے ڈی سوزا کے حروف اس طرح چمکتے جیسے چھوٹا موٹا سورج۔

میں لوٹ کر آیا تو ڈیوڈ صاحب آ چکے تھے۔ کپڑے بدل کر آنگن میں پلنگ پر بیٹھے وہ باسو کو تھوک میں گالیاں دے رہے تھے۔ مسز ڈی سوزا "باٹ ڈش" پکانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ڈیوڈ صاحب کہہ رہے تھے، "یہ سالا باسو اس لائق ہے کہ اس کا پبلک ٹرائل کیا جائے۔" ان کی آنکھوں میں نفرت اور اکتاہٹ تھی۔ چشمہ تھوڑا نیچے کھسک گیا تھا۔ انھوں نے اپنی گردن اکڑا کر چشمہ چہرے پر فٹ کیا۔ میں نے تلک برج کے سامنے ایک پیڑ کی بڑی سی ڈال پر رسّے کے سہارے باسو کی لاش کو جھولتے ہوئے دیکھا۔ لہریں مارتی بھیڑ، اتھاہ بھیڑ۔ اور کچھ ہی لمحوں بعد ڈیوڈ صاحب کو ایک ننھے سے مرغی خانے میں بند پایا۔ چاروں طرف جالیاں لگی ہوئی ہیں اور اس کے اندر دو سو مرغیوں کے ساتھ ڈیوڈ صاحب دانہ چگ رہے ہیں، گردن ڈال کر پانی پی رہے ہیں اور انڈے دے رہے ہیں۔ انڈوں کے ایک ڈھیر پر بیٹھے ہیں۔ مرغی خانے کی جالیوں سے باہر بسنت وہار صاف دکھائی پڑ رہا ہے۔

میں نے کہا، "آپ کیوں پریشان ہیں ڈیوڈ صاحب؟ چھوڑیے سالی نوکری کو۔ ایک مرغی خانہ کھول لیجیے۔ پھر بسنت وہار میں مکان۔"

"نہیں نہیں، میں بسنت وہار میں مکان نہیں بنوا سکتا۔ وہیں تو باسو کا مکان بن رہا ہے۔ بھائی صاحب، یہ تو دعویٰ ہے، اس دیش میں بغیر چار سو بیسی کیے کوئی آدمی کی طرح نہیں رہ سکتا۔ آدمیوں کی طرح رہنے کے لیے آپ کو بلیک مارکیٹنگ کرنی پڑے گی، لوگوں کو ایکسپلائٹ کرنا پڑے گا۔۔۔ اب

آپ سوچیے، میں کس سالے سے کم کام کرتا ہوں؟ روز آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی، اور دو گھنٹے بس کے انتظار میں---"

"تم بہت گالی بکتے ہو!" مسز ڈی سوزا بولیں۔

"پھر کیا کروں آنٹی؟ گالی نہ بکوں تو یسوع سے دعا کروں جس نے کم سے کم میرے ساتھ بڑا جوک کیا ہے؟"

"چھوڑیے یار ڈیوڈ صاحب، کچھ اور بات کیجیے۔ کہیں پروف کا کام زیادہ تو نہیں ملا؟"

"ٹھیک ہے، چھوڑیے۔ دلی میں ابھی تین سال ہوئے ہیں نا! کچھ جوانی بھی ہے! ابھی شاید آپ نے دلی کی چمک دمک بھی نہیں دیکھی؟ کیا ہمارا کچھ بھی حصہ نہیں ہے اس میں؟ کناٹ پلیس میں بہتے ہوئے پیسے کو دیکھا ہے کبھی؟" وہ ہاتھ چلا چلا کر پیسے کے بہاو کے بارے میں بتانے لگے۔ "لاکھوں کروڑوں روپے لوگ اُڑا رہے ہیں۔ عورتوں کے جسموں پر سے بہتا پیسا، کاروں کی شکل میں تیرتا ہوا---" وہ جوش میں آ گئے۔ "میں کہتا ہوں---" اور انھوں نے جیب سے چشمہ نکالا، گردن اکڑائی اور چشمہ آنکھوں پر فٹ کر لیا۔

مجھے اُکتاہٹ ہونے لگی۔ طبیعت گھبرانے لگی، جیسے اُمس ایک دم بیٹھ گئی ہو۔ سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی۔ لوہے کی سلاخوں دار کمرہ ایسا مرغی خانہ لگنے لگا جس میں سخت بدبو بھر گئی ہو۔ مسز ڈی سوزا کئی بار پیش گوئی کر چکی ہیں کہ ڈیوڈ صاحب ایک دن ہم لوگوں کو اَریسٹ کروائیں گے۔ اور ڈیوڈ صاحب کہتے ہیں کہ میں اس دن کا "ویلکم" کروں گا۔

غصے میں لگاتار ہونٹ دبائے رہنے کی وجہ سے ان کا نچلا ہونٹ کافی موٹا ہو گیا ہے۔ ماتھے پر تین لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ بچپن میں سنا کرتے تھے، ماتھے پر تین لکیریں پڑنے والا راجا ہوتا ہے۔

کچھ ہی دیر میں وہ کافی شانت ہو چکے تھے۔ کھانے کی میز پر انھوں نے "باسو کی جے!" کا نعرہ لگایا اور دو گلاس پانی پی گئے۔ مسز ڈی سوزا کی باٹ ڈِش، سُوپ اور بریڈ تیار تھی۔

"کریلے کی سبزی پکانا بھی آرٹ ہے صاحب!" ڈیوڈ صاحب نے زور زور سے منہ چلایا۔

"تین ڈش کے برابر ایک ڈش ہے!" مسز ڈی سوزا نے احسان لادا۔

ڈیوڈ صاحب اُن کی بات اَن سنی کرتے ہوئے بولے، "کریلے کھانے کا مزہ تو سیتا پور میں آتا تھا آنٹی۔ کوٹھی کے پیچھے کچن گارڈن میں ڈیڈی طرح طرح کی سبزی بُواتے تھے۔ ڈھیر ساری پیاز کے ساتھ ان کریلوں میں اگر قیمہ بھر کر پکایا جائے تو کیا کہنا!"

ہم لوگ سمجھ گئے کہ اب ڈیوڈ صاحب بچپن کے قصے سنائیں گے۔ ان قصّوں کے بیچ نصیبن گورنس کا ذکر بھی آئے گا جو صرف ایک روپیا مہینا تنخواہ پا کر بھی خوش رہا کرتی تھی اور جس کا خاص کام ڈیوڈ بابا کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ نصیبن گورنس ہزار کوشش کے بعد بھی ڈیوڈ بابا کو "دیپک بابا" ہی کہتی رہی۔ اسی سلسلے میں اُس پکنک پارٹی کا ذکر آئے گا جس میں ڈیوڈ بابا نے جمنا کے سلوپ پر گاڑی چڑھا دی تھی۔ تجربہ

کار ڈرائیور اسماعیل خاں کو پسینا چھوٹ آیا تھا۔ ۱۹۳۰ ماڈل کی فورڈ کا انجن سیدھی چڑھائی کے چڑھنے سے انکار کر چکا تھا۔ ڈیوڈ صاحب نے اُس کو ڈانٹ کر گاڑی سے اتار دیا تھا۔ سب لڑکے اور لڑکیاں اتر گئے تھے۔ انگریز لڑکوں کی ہمت چھوٹ گئی تھی۔ لیکن جُولی نے اُترنے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈیوڈ بابا نے گاڑی اسٹارٹ کی، دو منٹ سوچا، گیئر بدل کر ایکسلریٹر پر دباؤ ڈالا اور گاڑی ایک فراٹے کے ساتھ اوپر چڑھ گئی۔ اسماعیل خاں نے اوپر آ کر ڈیوڈ بابا کے ہاتھ چوم لیے تھے۔ وہ بڑے بڑے انگریز افسروں کو گاڑی چلاتے دیکھ چکا تھا، مگر ڈیوڈ بابا نے کمال ہی کر دیا۔ جُولی نے ڈیوڈ بابا کو اسی دن "کِس" دینے کا "پرامز" کیا تھا۔

ان سب باتوں کو سناتے وقت ڈیوڈ صاحب کی بِٹر نس غائب ہو جاتی ہے۔ وہ ڈیوڈ صاحب نہیں دیپک بابا لگتے ہیں۔ ہلکی سی دھُول اڑتی ہے اور سیتاپور کی سِول لائنز پر بنی بڑی سی کوٹھی کے پھاٹک میں سن ۱۹۳۰ کی فورڈ مڑ جاتی ہے۔ پھاٹک کے ایک کھمبے پر صاف حرفوں میں لکھا ہوا ہے: "پیٹر جے ڈیوڈ، ڈپٹی کلکٹر"۔ کوٹھی کی چھت کھپریلوں سے بنی ہوئی ہے۔ کوٹھی کے چاروں طرف کئی بیگھے کا کمپاؤنڈ ہے۔ پیچھے آم اور سنترے کا باغ ہے۔ داہنی طرف ٹینس کورٹ، اور بائیں طرف بڑا سا کچن گارڈن۔ کوٹھی کے اونچے برآمدے میں باوردی چپراسی اونگھتا ہوا دکھائی پڑے گا۔ اندر ہال میں وکٹورین فرنیچر اور چھت پر لٹکتا ہوا ہاتھ سے کھینچنے والا پنکھا۔ دوپہر میں پنکھا قلی پنکھا کھینچتے کھینچتے اُونگھ جاتا ہے تو مسٹر پیٹر جے ڈیوڈ، ڈپٹی کلکٹر، اپنے ولایتی جوتوں کی ٹھوکروں سے اس کے کالے بدن پر نیلے رنگ کے پھول اگا دیتے ہیں۔ بابا لوگ ٹائی باندھ کر کھانے کی میز پر بیٹھ کر چکن سُوپ پیتے ہیں، کھانا کھانے کے بعد آئس کریم کھاتے ہیں، اور ممی ڈیڈی کو "گڈ نائٹ!" کہہ کر پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ ساڑھے نو بجے کے آس پاس سن ۱۹۳۰ کی فورڈ پھر اسٹارٹ ہوتی ہے۔ اب وہ یا تو کلب چلی جاتی ہے یا کسی دیسی رئیس کی کوٹھی کے اندر گھُس کر آدھی رات کو ڈگمگاتی ہوئی لوٹتی ہے۔

مسز ڈی سوزا کے مکان کی چھت کے اوپر سے دلّی کی روشنیاں دکھائی پڑتی ہیں۔ سیکڑوں جنگلی جانوروں کی آنکھیں رات میں چمک اٹھتی ہیں۔ پانی پینے کے لیے نیچے آتا ہوں تو ڈیوڈ صاحب پروف پڑھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہیں، قلم بند کر دیتے ہیں اور بیٹھنے کے لیے کہتے ہیں۔ آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے۔ وہ مجھے دھیرے دھیرے سمجھاتے ہیں۔ اُن کے اس سمجھانے سے میں تنگ آ گیا ہوں۔ شروع شروع میں تو میں ان کو الو کا پٹھا سمجھتا تھا، لیکن بعد میں پتا نہیں کیوں ان کی باتیں میرے اوپر اثر کرنے لگیں۔ "بھاگ جاؤ اس شہر سے، جتنی جلدی ہو سکے بھاگ جاؤ! میں بھی تمہاری طرح کالج سے نکل کر سیدھا اس شہر میں آ گیا تھا، راج دھانی جیتنے۔ لیکن دیکھ رہے ہو؟ کچھ نہیں ہے اس شہر میں، کچھ نہیں۔ میری بات چھوڑ دو۔ میں کہاں چلا جاؤں؟ گانڈ کے راستے یہ شہر میرے اندر گھُس چکا ہے۔"

"لیکن کب تک کچھ نہیں ہو گا ڈیوڈ صاحب؟"

"اُس وقت تک جب تک تمہارے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور میں جانتا ہوں تمہارے

پاس وہ سب کچھ نہیں ہے جو لوگوں کو دیا جا سکتا ہے۔"

میں لوٹ کر اوپر آ جاتا ہوں۔ میرے پاس کیا ہے دینے کے لیے؟ اونچی کرسیاں، کاک ٹیل پارٹیاں، لمبے چوڑے لان، انگریزی میں استقبال، سُوٹ اور ٹائیاں، لڑکیاں، موٹریں، شاپنگ۔ تب یہ لوگ جو تنگ گلیاروں میں مجھ سے وعدے کرتے ہیں، مسکراتے ہیں، کون ہیں؟ اس کے بارے میں پھر سوچنا پڑے گا۔ اور کافی دیر تک میں پھر سوچنے کی ہمت جُٹاتا رہتا ہوں۔ لیکن وہ پیچھے ہٹتا جاتا ہے۔ میں اس کی باہیں پکڑ کر آگے گھسیٹتا ہوں۔ کسی بگڑے ہوئے خچر کی طرح وہ اپنی رسی تُڑا کر بھاگ نکلتا ہے۔

میں پھر پانی کے لیے نیچے اُترتا ہوں۔ اپنی میز پر سر رکھے وہ سو رہے ہیں۔ پروف کا پلندا سامنے پڑا ہے۔ میں ان کا کندھا پکڑ کر جگا دیتا ہوں۔ "اب سو جائیے۔ کل آپ کو سائٹ دیکھنے جانا ہے۔" ان کے چہرے پر مسکراہٹ آتی ہے۔ وہ کل مرغی خانہ کھولنے کی سائٹ دیکھنے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی ہم لوگ کئی سائٹس دیکھ چکے ہیں۔ ڈیوڈ صاحب اٹھ کر پانی پیتے ہیں، پھر اپنے پلنگ پر اس طرح گر پڑتے ہیں جیسے راج دھانی کے پیروں پر پڑ گئے ہوں۔

میں پھر اوپر آ کر لیٹ جاتا ہوں۔ "میں نے کالج میں اتنا پڑھا ہی کیوں؟ اتنا اور اُتنا کی بات نہیں ہے، مجھے کالج میں پڑھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اور اب دو سال تک ڈھائی سو روپے کی نوکری کرتے ہوئے کیا کیا جا سکتا ہے؟ کیوں مسکراتا رہا اور کیوں شانت رہا؟ دو سال سے دوپہر کا کھانا گول کرتے رہنے کے پیچھے کیا تھا؟" نیچے سے بھینس کے گوبر کرنے کی آواز آتی ہے۔ ایک جانی پہچانی بُو پھیل جاتی ہے، اس نیم مانوس قصبے کی بُو جسے میں اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ جہاں مجھے بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں۔ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر اگر میں اتروں تو گاڑی چلی جانے کے بعد کئی لوگ مجھے گھور کر دیکھیں گے اور اگلا گاڑی والے بھی مجھ سے بات کرتے ڈریں گے۔ اُن کا ڈر دور کرنے کے لیے مجھے اپنا تعارف کرانا پڑے گا۔ یعنی اپنے باپ کا تعارف کرانا پڑے گا۔ تب ان کے چہرے پر مسکراہٹ آئے گی اور وہ مجھے اگلے پر بیٹھنے کے لیے کہیں گے۔ دس منٹ اگا چلتا رہے گا تو ساری بستی ختم ہو جائے گی۔ اُس پار کھیت ہیں، جس کا سیدھا مطلب ہے، اُس پار غریبی ہے۔ وہ غریبی کے عادی ہیں۔ پولیس ان کے لیے قادرِ مطلق ہے اور اپنی ہر ہوشیاری میں وہ کافی مور کھ ہیں۔۔۔ اوپر آسمان میں پالم جانے والے ہوائی جہاز کی صاف آواز سنائی دیتی ہے۔ نیچے سڑک پر بالو سے لدے ٹرک گزر رہے ہیں۔ لدی ہوئی بالو کے اوپر مزدور سو رہے ہیں جو کبھی کبھی کسان بن جانے کا خواب دیکھ لیتے ہیں، اپنے گاؤں کی بات کرتے ہیں، اپنے کھیتوں کی بات کرتے ہیں جو کبھی ان کے تھے۔ ٹرک تیزی سے چلتا ہوا اوکھلا موڑ سے متھرا روڈ پر مڑ جائے گا، فرینڈز کالونی اور آشرم ہوتا ہوا "راج دُوت ہوٹل" کے سامنے سے گزرے گا جہاں رات بھر کیبرے ہوتا ہے اور ریستوراں کی اشتہاری لائٹیں مسلسل جلتی بجھتی رہتی ہیں۔ اُسی کے سامنے فٹ پاتھ پر بہت سے دبلے پتلے، کالے اور سوکھے آدمی سوتے ہوئے ملیں گے جن کی نیند ٹرک کی کرخت آواز سے بھی نہیں کھُلتی۔ اوپر تیز بلب کی روشنی میں ان کے جسم بکھرے دکھائی پڑتے ہیں۔ میں اکثر حیران رہتا ہوں کہ وہ اس چوڑے فٹ پاتھ پر

Scanned with CamScanner

چھت کیوں نہیں ڈال لیتے۔ اس کے چاروں طرف کچی ہی سہی، دیوار تو اٹھائی جا سکتی ہے۔ ان سب باتوں پر سرسری نگاہ ڈالی جائے، جیسا کہ ہماری عادت ہے، تو ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بے وقوفی اور جذباتیت سے بھری باتیں۔ لیکن اگر کوئی اوپر سے کیڑے کی طرح فٹ پاتھ پر ٹپک پڑے تو اس کی سمجھ میں سب کچھ آ جائے گا۔

دن اس طرح گزرتے ہیں جیسے کوئی لنگڑا آدمی چلتا ہے۔ اور تب اس مہانگری میں اپنے بہت عام اور بے سہارا ہونے کا احساس سب کچھ کرا لیتا ہے۔ اور بے عزتی، جو اس مہانگر میں لوگ تفریحاً کر دیتے ہیں، اب اتنی بُری نہیں لگتی جتنی پہلے لگتی تھی۔ آفس میں اہلکاروں کی میز پر تیواری کا سوَر کی طرح گندا منھ جو ایک ہی وقت میں پکا سماج وادی (سوشلسٹ) بھی ہے اور پرو امریکن بھی۔ اس کی تنگ بُشرٹ میں سے جھانکتا ہوا حرام کی کمائی پر پلا تندرست جسم اور اس کی سماج وادی پنسل جو ہر دوسری سطر صرف اس لیے کاٹ دیتی ہے کہ وہ دوسرے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا رعب داب، گمبھیر ہنسی، چالاک مسکراہٹ، اور اس کی میز کے سامنے اس کے سامراج میں بیٹھے ہوئے چار کمزور جاندار جو قلم گھسنے کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ ان لوگوں کے چہروں میں ٹائپ رائٹروں کی کھڑکھڑاہٹ۔ ان سب چیزوں کو مٹھی میں دبا کر کرش کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ بھوک بھی کم بخت لگتی ہے تو اس طرح جیسے سارے شہر کا کھانا کھا کر ہی ختم ہو گی۔ شروع میں پیٹ گڑگڑاتا ہے۔ اگر ڈیوڈ صاحب ہوتے تو بات یہیں سے جھٹک لیتے۔ "جی نہیں، بھوک جب زور سے لگتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے بلّیاں لڑ رہی ہوں۔ پھر پیٹ میں ہلکا سا درد شروع ہوتا ہے جو پہلے پہل میٹھا لگتا ہے۔ پھر درد تیز ہو جاتا ہے۔ اس وقت اگر آپ تین چار گلاس پانی پی لیں تو پیٹ کچھ دیر کے لیے شانت ہو جائے گا اور آپ دو ایک گھنٹا کوئی بھی کام کر سکتے ہیں۔"

اتنا سب کچھ سہنے کے بعد وہ ضرور صلاح دیں گے کہ اس مہانگری میں بھوکوں مرنے سے اچھا ہے کہ میں لوٹ جاؤں۔ اور یہاں سے نکل کر وہاں جانے کا مطلب ہے ایک غریبی اور بُھک مَری سے نکل کر دوسری بُھک مَری میں پھنس جانا۔ اسی طرح کی بہت ساری باتیں ایک ساتھ دماغ میں کبڈی کھیلتی رہتی ہیں۔ تنگ آ کر ایسے موقعے پر ڈیوڈ صاحب سے پوچھتا ہوں، "گریٹر کیلاش کی مارکیٹ چل رہے ہیں؟"

وہ مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں، "اچھا، تیار ہو جاؤں۔" میں جانتا ہوں ان کے تیار ہونے میں کافی وقت لگے گا، اس لیے میں پریم سے جوتے پر پالش کرتا ہوں۔ ایک مَیلا کپڑا لے کر جوتے کی گھِسائی کرتا ہوں۔ جوتے میں اپنی شکل دیکھ سکتا ہوں۔ ٹپ ٹاپ ہو کر ڈیوڈ صاحب سے پوچھتا ہوں، "تیار ہیں؟"

ہم دونوں بس اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے ایک دوسرے کے جوتوں کو دیکھ کر اُمنگ بڑھاتے۔ ایک عجیب طرح کی ہمت آ جاتی ہے۔

گریٹر کیلاش کی مارکیٹ کی ہر دکان کا نام ہمیں زبانی یاد ہے۔ بس سے اتر کر ہم دونوں پیشاب خانے میں جا کر اپنے بال ٹھیک کرتے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھتے ہیں۔ دو جوڑی چمچماتے جوتے برآمدے میں گھومتے ہیں۔ میں فرنیچر کی دکان کے سامنے رک جاتا ہوں۔ تھوڑی دیر تک دیکھتا رہتا ہوں۔

Scanned with CamScanner

ڈیوڈ صاحب اندر چلنے کے لیے کہتے ہیں، اور میں ساری ہمت جمع کر کے اندر گھس جاتا ہوں۔ یہاں کے لوگ بڑے مہذب ہیں۔ ایک جملے میں دو بار "سر" بولتے ہیں۔ چمک دار جوتے دکان کے اندر ٹہلتے ہیں۔ ڈیوڈ صاحب یہاں کمال کی انگریزی بولتے ہیں، کندھے اچکا کر اور آنکھیں نکال کر۔ چیزوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ کافی گھٹیا ہوں۔ میں ایسے موقعوں پر ان سے متاثر ہو کر اُنھیں کی طرح بی ہیو کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

کنفیکشنری کی دکان کے سامنے وہ بہت دیر تک رکتے ہیں۔ شوونڈو میں سب کچھ سجا ہوا ہے۔ پہلی بار میں گمان ہو سکتا ہے کہ سارا سامان دکھاوٹی ہے، مٹی کا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

"جلدی چلیے۔ سالا دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔"

"کون؟" ڈیوڈ صاحب پوچھتے ہیں۔ میں آنکھ سے دکان کے اندر اشارہ کرتا ہوں۔ وہ اچانک دکان کے اندر گھس جاتے ہیں۔ میں ہچکچا کر برآمدے میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔ "پکڑے گئے بیٹا! بڑے لاٹ صاحب کی اولاد بنے پھرتے ہیں۔ ان کی جیب سے دس پیسے کا بس کا ٹکٹ اور کل ساٹھ پیسے نکلتے ہیں۔ سارے لوگ ہنس رہے ہیں۔ ڈیوڈ صاحب نے چمچماتا جوتا اُتار کر ہاتھ میں پکڑا اور بھاگے۔" میں ہمت کر کے دکان کے اندر جاتا ہوں۔ ڈیوڈ صاحب دکان دار سے بہت فرّاٹے دار انگریزی بول رہے ہیں اور وہ بے چارہ گھبرا رہا ہے۔ میں خوش ہوتا ہوں۔ "لو سالے، کر دیا نا ڈیوڈ صاحب نے ڈنڈا! بہت مسکرا رہے تھے!" ڈیوڈ صاحب انگریزی میں ایسا کیک مانگ رہے ہیں جس کا نام اس کے باپ دادا پردادا نے بھی کبھی نہ سنا ہو گا۔

باہر نکل کر ڈیوڈ صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

روز کی طرح کھانے کی میز پر یہاں سے وہاں تک ولایتی کھانے سجے ہوئے ہیں۔ مسز ڈی سوزا کا مُوڈ کچھ آف ہے۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ میں اس مہینے کی پہلی تاریخ کو پیسے نہیں دے پایا ہوں۔ ایک آدھ دن منہ پھُولا رہے گا۔ پھر وہ مہنگائی کے قصّے سنانے لگیں گی۔ چیزوں کی بڑھتی قیمتیں سنتے سنتے ہم لوگ تنگ آ جائیں گے۔

بات کرنے کے لیے کچھ ضروری تھا اور چُپ ٹوٹتی نہیں لگ رہی تھی، تو مسز ڈی سوزا نے پوچھا، "آج تم ڈیفنس کالونی جانے والے تھے؟"

"نہیں جا سکا،" ڈیوڈ صاحب نے منہ اٹھا کر کہا۔

"اب تمھارا سامان کیسے آئے گا؟" مسز ڈی سوزا بڑبڑائیں۔ "بے چاری تمھاری بہن کیتھی نے کتنی محبت سے بھیجا ہے۔"

"محبت سے بھجوایا ہے آنٹی؟" ڈیوڈ صاحب چونکے۔ "آنٹی، اُس کا ہسبنڈ دو ہزار روپے کماتا ہے۔ کیتھی ایک دن بازار گئی ہو گی۔ سوا سو روپے کی ایک گھڑی اور دو قمیصیں خرید لی ہوں گی۔ اور ڈینو کے ہاتھ دلی بھجوا دیں۔ اس میں محبت کہاں سے آ گئی؟"

Scanned with CamScanner

"مگر تم انہیں جا کر لے تو آؤ۔"

"ڈینو اس سامان کو یہاں لا سکتا ہے۔"

ڈینو کا ڈیفنس کالونی میں اپنا مکان ہے۔ کار ہے۔ ڈیوڈ صاحب کا بچپن کا دوست ہے۔ وہ اُس شکار پارٹی میں بھی تھا جس میں ہاتھی پر بیٹھ کر ڈیوڈ صاحب نے فلائنگ شاٹ میں چار قازیں گرائی تھیں۔

"ڈیفنس کالونی سے یہاں آنا دور پڑے گا۔ اور وہ بزی آدمی ہے۔"

"میں بزی پروف ریڈر نہیں ہوں؟" وہ ہنسے۔ "وہ تو اپنی کار سے آ سکتا ہے، جبکہ مجھے دو بسیں بدلنی پڑیں گی۔" وہ دال چاول اس طرح کھا رہے تھے جیسے کیک کی یاد میں مُشت زنی کر رہے ہوں۔

"جیسی تمہاری مرضی۔"

کھانا ختم ہونے پر کچھ دیر کے لیے محفل جم گئی۔ مسز ڈی سوزا پتا نہیں کہاں سے اُس بڑے زمین دار کا ذکر لے بیٹھیں جو جوانی کے دنوں میں ان پر دل و جان سے عاشق تھا اور ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ایک دن پتا لگاتا ہوا دلّی میں ان کے گھر آیا تھا۔ وہ پہلا دن تھا جب اِس گھر کے سامنے سیکنڈ ہینڈ ایمبیسیڈر کھڑی ہوئی تھی اور ڈیوڈ صاحب کو کچن میں سونا پڑا تھا۔ اس بڑے زمین دار کا ذکر ڈیوڈ صاحب کو بہت بھاتا ہے۔ میں تو فوراً اُس زمین دار کی جگہ اپنے آپ کو فٹ کر کے موقعے کا پورا مزہ اٹھانے لگتا ہوں۔

کچھ دیر بعد اِدھر اُدھر گھوم گھام کر بات پھر کھانوں پر آ گئی۔ ڈیوڈ صاحب سویّاں پکانے کی ترکیب بتانے لگے۔ پھر سب نے اپنے اپنے پسندیدہ کھانوں کے بارے میں بات کی۔ سب سے پہلے ڈیوڈ صاحب بولے۔

کھانے کی بات ختم ہوئی تو میں نے دھیرے سے کہا، "یار ڈیوڈ صاحب، اس گاؤں میں کبھی کوئی ایسی لڑکی نظر پڑ جاتی ہے کہ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔"

"کیسی تھی، مجھے بتاؤ۔ چھدّو کی بہو ہو گی یا۔۔۔"

"بس ڈیوڈ، تم لڑکیوں کی بات نہ کیا کرو۔ میں نے کتنی خوب صورت لڑکی سے تمہارا انگیجمنٹ طے کیا تھا۔"

"کیا خوب صورتی کی بات کرتی ہیں آنٹی! اگر جُولی کو آپ نے دیکھا ہوتا۔۔۔"

"جُولی؟ خیر اُس کو تو میں نے نہیں دیکھا۔ تم نے اگر میری لڑکی کو دیکھا ہوتا۔" ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ "اگر وہ حاجی اُسے۔۔۔" کچھ دیر بعد بولیں، "اگر وہ ہوتی تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ میں اُس کی شادی کسی ملٹری افسر سے کر دیتی۔ اس سے تو کوئی بھی شادی کر سکتا تھا۔"

"میں شادی کیسے کر لوں آنٹی؟ دو سو پچاس روپے اکیس پیسے سے ایک پیٹ نہیں بھرتا۔ ایک اَور لڑکی کی جان لینے سے کیا فائدہ آنٹی؟ میری زندگی تو گزر ہی جائے گی، مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ اپنے پیچھے ایک غریب عورت اور دو تین پروف ریڈر چھوڑ کر مر جاؤں جو دن رات مشینوں کی کان پھاڑ دینے والی آوازوں میں بیٹھ کر آنکھیں پھوڑا کریں۔" وہ کچھ رکے۔ "یہی بات میں اِن سے کہتا ہوں۔" انھوں نے

Scanned with CamScanner

میری طرف اشارہ کیا۔ "اس آدمی کے پاس گاؤں میں تھوڑی سی زمین ہے جہاں گیہوں اور دھان کی فصل ہوتی ہے۔ اس کو چاہیے کہ اپنے کھیت کے پاس ایک کچا گھر بنا لے۔ اس کے سامنے ایک چھپر ڈال لے۔ بس اس پر لوکی کی بیل چڑھانی پڑے گی۔ دیہات میں آرام سے ایک بھینس پالی جا سکتی ہے۔ کچھ دنوں بعد مرغی خانہ کھول سکتے ہیں۔ کھانے اور رہنے کی کوئی فکر نہیں رہ جائے گی۔ ٹھاٹھ سے کام کریں اور کھائیں۔"

"اس کے بعد آپ وہاں آئیے گا تو کیک بنایا جائے گا، بہت سے انڈے ملا کر،" میں نے مذاق کیا۔

دیپک بابا ہنسنے لگے، بالکل بچوں کی سی معصوم ہنسی۔

**

مَنّو بھنڈاری

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

ترشنکو

"گھر کی چاردیواری آدمی کو جہاں حفاظت فراہم کرتی ہے وہاں کچھ حدیں بھی مقرر کر دیتی ہے۔ اسکول کالج جہاں انسانی ذہن کو جِلا بخشتے ہیں وہیں اصولوں، قاعدوں ضابطوں کے نام پر اُس کی شخصیت کو محدود بھی کرتے ہیں۔ بات یہ ہے بندھُو کہ ہر بات کی مخالفت خود اُس کے اندر ہی ہوتی رہتی ہے۔"

یہ میں کسی کتاب سے ثبوت کے طور پر نہیں پیش کر رہی۔ ایسی بھاری بھر کم کتابیں پڑھنے کی سکت مجھ میں نہیں ہے۔ یہ تو اُن باتوں اور بحثوں کے ٹکڑے ہیں جو رات دن ہمارے گھر میں ہوا کرتی ہیں۔ ہمارا گھر، یعنی دانشوروں کا اکھاڑا۔ یہاں سگریٹ کے دھوئیں اور چائے کے پیالوں کے بیچ باتوں کے بڑے بڑے طومار باندھے جاتے ہیں، بڑے بڑے لفظی انقلاب برپا کیے جاتے ہیں۔ اس گھر میں کام کم اور باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تو نہیں، پر اپنے گھر میں دیکھ کر یہ لگتا ضرور ہے کہ دانشوروں کے لیے کام کرنا شاید منع ہے۔ ماٹو شری اپنی تین گھنٹے کی تفریح نما نوکری کے بعد آزاد: تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کے بعد جو وقت بچتا ہے وہ یا تو بحث مباحثے میں جاتا ہے یا پھر لوٹ لگانے میں۔ اُن کا خیال ہے کہ جسم کے آرام پاتے ہی دماغ اپنا کام تیز کرنے لگتا ہے، اور کیفیت دن کے چوبیس میں سے بارہ گھنٹے رہتی ہے۔ پِتا شری اَور بھی دو قدم آگے ہیں۔ اُن کا بس چلے تو وہ نہائیں بھی اپنی میز پر ہی۔

جس بات کو ہمارے یہاں زیادہ سے زیادہ زیرِ بحث لایا جاتا ہے وہ ہے جدیدیت! پر ذرا ٹھہریے، آپ جدیدیت کا غلط مطلب مت لیجیے۔ یہ بال کاٹنے اور چھُری کانٹے سے کھانا کھانے والی جدیدیت نہیں

ترشنکو: ہندوستانی دیومالا کا ایک کردار جو دو دنیاؤں کے بیچ میں لٹکا ہوا ہے۔

Scanned with CamScanner

ہے۔ قطعی نہیں! یہ ایک دم دانشوروں والی جدیدیت ہے۔ یہ کیا ہوتی ہے، سو تو میں بھی ٹھیک سے نہیں جانتی، ہاں پر اس میں سمت بدلنے کی بات بہت سنائی دیتی ہے۔ آپ راستا تبدیل کرتے جائیے، سر آنکھوں پر، لیکن جہاں آپ لکیر کے فقیر ہوئے تو آ گئی شامت!

بحثوں میں یوں تو دنیاجہان کے موضوعات زیرِ بحث آتے ہیں، پر ایک موضوع جو شاید سبھی کا پسندیدہ ہے وہ ہے شادی۔ شادی یعنی بربادی۔ ہلکے پھلکے ڈھنگ سے شروع ہونے والی بات ایک دم دانشورانہ سطح پر چلی جاتی ہے۔ "شادی کا ادارہ ایک دم کھوکھلا ہو چکا ہے۔۔۔ میاں بیوی کا رشتہ بالکل نقلی اور اوپر سے تھوپا ہوا لگتا ہے۔۔۔" اور پھر دھواں دھار طریقے سے شادی بیاہ کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔ اس بحث میں اکثر خواتین ایک طرف ہو جاتی ہیں اور مرد حضرات ایک طرف، اور بحث کا ماحول کچھ ایسا گرم ہو جاتا ہے کہ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اب ضرور ایک دو لوگ طلاق دے بیٹھیں گے۔ پر میں نے دیکھا کہ ایسا کوئی حادثہ کبھی ہوا نہیں۔ سارے ہی دوست اپنے اپنے بیاہ کو خوب اچھی طرح تہہ سمیٹ کر، اس پر آسن جما کر بیٹھے ہیں۔ ہاں، بحث کی رفتار اور ٹون آج بھی وہی ہے۔

اب سوچیے، شادی بیاہ کو کوسیں گے تو فری لو، فری سیکس کو تو سراہنا ہی پڑے گا۔ اس میں مرد حضرات اُچھل اُچھل کر آگے رہتے؛ کچھ تو اتنے جذباتی کہ جیسے آدھی تسکین تو اس موضوع پر بات کرنے ہی سے حاصل کر رہے ہوں۔ پاپا تو خود سب سے بڑے حامی! پر ہوا یوں کہ گھر میں ہمیشہ چپ چاپ رہنے والی، دور کے رشتے کی ایک دیدی نے کبھی ان بحثوں میں حصہ لیے بغیر ہی اس پر عمل کر ڈالا تو لگا جیسے ساری جدیدیت اڑاڑادھم! وہ تو کہیے ممی نے انتہائی خوش اسلوبی سے ساری بات کو سنبھالا اور بے معنی شادی کو معنی میں پرو کر دیدی کی زندگی کو بامعنی بنایا۔ حالاں کہ یہ بات بہت پُرانی ہے اور میں نے تو بہت بند بند زبان سے اس کا ذکر ہی سنا ہے۔

ویسے پاپا ممی کی بھی لَو میرج ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ہوش سنبھالنے سے اب تک میں نے ان دونوں کو پیار کرتے ہوئے نہیں، بحث ہی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ شادی سے پہلے ممی کو اپنے اس فیصلے پر نانا سے بہت بحث کرنی پڑی تھی، اور بحث کا یہ دور بہت لمبا بھی چلا تھا شاید۔ اس کے باوجود یہ شادی تنازعے کی نہیں بلکہ محبت ہی کی شادی ہے جس کا ذکر ممی بہت فخر سے کیا کرتی ہیں۔ فخر شادی کے معاملے پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ کس طرح انھوں نے نانا سے مورچہ لیا تھا۔ اپنے اور نانا کے درمیان ہوئے ڈائیلاگ وہ اتنی بار دُہرا چکی ہیں کہ مجھے حفظ ہو گئے ہیں۔ آج بھی جب وہ ان باتوں کا ذکر کرتی ہیں تو ایک عجیب اطمینان کی کیفیت اُن کے چہرے پر جھلک اٹھتی ہے۔

بس ایسے ہی گھر میں مَیں پل رہی ہوں، بڑے ہی آزادی اور خودپسندی کے ماحول میں۔ اور پلتے پلتے اچانک ایک دن بڑی ہو گئی۔ بڑے ہونے کا یہ احساس میرے اپنے اندر سے اتنا نہیں پھُوٹا جتنا باہر سے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑا دلچسپ واقعہ جُڑا ہوا ہے۔ ہوا یوں کہ گھر کے ٹھیک سامنے ایک برساتی ہے: ایک کمرہ اور اس کے سامنے پھیلی ہوئی چھت۔ اس میں ہر سال دو تین طالب علم آ کر رہتے ہیں،

Scanned with CamScanner

چھت پر گھوم گھوم کر پڑھتے ہیں۔ مگر کبھی دھیان ہی نہیں گیا۔ شاید دھیان جانے والی میری عمر ہی نہیں تھی۔ اِس بار دیکھا وہاں دو لڑکے آئے ہیں۔ تھے تو وہ دو ہی، مگر شام تک ان کے دوستوں کا ایک جمگھٹا لگ جاتا تھا اور ساری چھت ہی نہیں سارا محلہ گلزار! ہنسی مذاق، گانا بجانا، اور آس پاس کی جو بھی لڑکیاں ان کی نظر کے دائرے میں آتیں ان پر چوٹیں پھبتیاں۔ ان کی نگاہوں کا اصل نشانہ ہمارا گھر تھا، اور صاف کہوں تو مَیں ہی تھی۔ برآمدے میں نکل کر میں کچھ بھی کروں، اُدھر سے ایک نہ ایک ریمارک ہوا میں اُچھلتا ہوا ٹپکتا اور میں اندر تک تھرتھرا اٹھتی۔ مجھے پہلی بار لگا کہ میں ہوں، اور صرف ہوں ہی نہیں، کسی کی کشش کا محور اور مرکز بھی ہوں۔ ایمان داری سے کہوں تو اپنے ہونے کا پہلا احساس بڑا رومینٹک سا لگا اور میں اپنی ہی نظروں میں نئی ہو اُٹھی -- نئی اور بڑی!

عجیب سی کیفیت تھی۔ جب وہ پھبتیاں کستے تو میں غصّے سے بھنّا اٹھتی -- حالاں کہ ان کی پھبتیوں میں بے ہودگی بالکل نہیں ہوتی تھی؛ تھی تو صرف دل میں گدگدی پیدا کرنے والی چھل -- پر جب وہ نہ ہوتے، یا ہو کر بھی آپس میں مشغول ہوتے، تو میں انتظار کرتی رہتی۔ ایک بے نام سی بے چینی اندر ہی اندر کسمساتی رہتی۔ عالم یہ ہوتا کہ دھیان وہیں اٹکا رہتا اور میں کمرہ چھوڑ کر برآمدے ہی میں ٹنگی رہتی۔

پر ان لڑکوں کے اس ہلّے گلّے والے بیوہار نے محلّے والوں کی نیندیں ضرور حرام کر دی تھیں۔ ہمارا محلہ یعنی باتھرس خورجہ کے لالاؤں کی بستی۔ جن کے گھروں میں جوان لڑکیاں تھیں وہ آستینیں چڑھا کر دانت لات توڑ دینے کی دھمکیاں دیتے، کیوں کہ سب کو اپنی لڑکیوں کا مستقبل خطرے میں دکھائی پڑ رہا تھا۔ محلّے میں اتنی ہلچل، اور میرے پاپا ممی کو کچھ خبر ہی نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی حالت ایک جزیرے جیسی بنا رکھی ہے -- سب کے درمیان رہ کر بھی سب سے الگ۔

ایک دن میں نے ممی سے کہا، "ممی، یہ جو سامنے لڑکے آئے ہیں، جب دیکھو مجھ پہ ریمارکس پاس کرتے رہتے ہیں۔ میں چپ چاپ نہیں سنوں گی، مَیں بھی یہاں سے جواب دوں گی۔"

"کون لڑکے؟" ممی نے تعجب سے پوچھا۔

کمال ہے، ممی کو کچھ پتا ہی نہیں! میں نے کچھ کھوج، کچھ خلش اور کچھ اُلجھن بھرے لہجے میں بات بتائی، پر ممی پر اس بات کا کوئی خاص ردعمل ظاہر نہ ہوا۔

"بتانا کون ہیں یہ لڑکے!" بڑے ٹھنڈے لہجے میں انھوں نے کہا اور پھر پڑھنے میں لگ گئیں۔ اپنا چھیڑا جانا مجھے جتنا سنسنی خیز لگ رہا تھا، اس پر ماں کی طرف سے یہ رکھائی مجھے اچھی نہیں لگی۔ کوئی اَور ماں ہوتی تو کمر کس کے نکل جاتی اور ان کی سات پُشتوں کو تار تار کر دیتی، پر ممی پر جیسے کوئی اثر ہی نہیں۔

دوپہر ڈھلے لڑکوں کی مجلس چھت پر جمی تو میں نے ممی کو بتایا۔

"دیکھو، یہ لڑکے ہیں جو سارے وقت اِدھر دیکھتے رہتے ہیں اور میں کچھ بھی کروں تو اس پر جملے کستے ہیں۔" پتا نہیں میرے کہنے میں ایسا کیا تھا کہ ممی ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہیں، پھر دھیرے سے مسکرائیں۔ تھوڑی دیر تک چھت والے لڑکوں کا معائنہ کرنے کے بعد بولیں:

Scanned with CamScanner

"کالج کے لڑکے معلوم ہوتے ہیں، پر یہ تو ایک دم بچے ہیں!"

دل چاہا کہ کہوں، مجھے بچے نہیں تو کیا بوڑھے چھیڑیں گے؟ پر تبھی ممی بولیں، "کل شام کو ان لوگوں کو چائے پر بلا لیتے ہیں اور تم سے دوستی کرائے دیتے ہیں۔"

میں تو حیران!

"تم انھیں چائے پر بلاؤ گی؟" مجھے جیسے ممی کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"ہاں، کیوں؟ کیا ہوا؟ ارے یہ تو ہمارے زمانے میں ہوتا تھا کہ مل تو سکتے نہیں، بس دور ہی سے جملے بازی کر کے خوش ہو لو۔ اب تو زمانہ بدل گیا۔"

میں تو اس خیال ہی سے لجا گئی۔ لگا ماں سچ مچ کوئی اونچی چیز ہیں۔ یہ لوگ ہمارے گھر میں آئیں گے اور مجھ سے دوستی کریں گے! یکایک مجھے لگنے لگا کہ میں بہت اکیلی ہوں اور مجھے کسی کی دوستی کی سخت ضرورت ہے۔

اس محلّے میں میرا کوئی خاص میل جول نہیں، اور گھر میں صرف ممی پاپا کے دوست آتے ہیں۔

دوسرا دن میرا عجیب اُدھیڑبُن میں گزرا۔ پتا نہیں ممی اپنی بات پوری بھی کرتی ہیں یا یوں ہی رو میں کہہ گئیں اور بات ختم! شام کو میں نے یاد دلانے کے لیے کہا:

"ممی، تم سچ مچ ان لڑکوں کو بلانے کے لیے جاؤ گی؟" الفاظ تو میرے یہی تھے، ورنہ اندرونی کیفیت تو یہ تھی کہ ممی، نہ جاؤ، پلیز!

اور ممی سچ مچ ہی چلی گئیں۔ مجھے یاد نہیں ممی دو چار بار سے زیادہ محلّے میں کسی کے یہاں گئی ہوں۔ میں سانس روک کر ان کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگی۔ ایک عجیب سی تھرکن انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ کہیں ممی ساتھ ہی لیتی آئیں تو؟ کہیں وہ ممی کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئے تو؟ پر نہیں، وہ لوگ ایسے لگتے تو نہیں ہیں۔ کوئی گھنٹا بھر بعد ممی لوٹیں۔ بے حد خوش۔

"مجھے دیکھتے ہی ان کی تو سٹی گم ہو گئی۔ انھیں لگا، ابھی تک تو لوگ ہڈی پسلی، ہاتھ دانت توڑنے کی دھمکی اپنے اپنے گھروں سے دے رہے تھے، میں جیسے سیدھے گھر ہی پہنچ گئے ان کی ہڈی پسلی ایک کرنے! مگر پھر تو اتنی خاطر کی بے چاروں نے کہ بس۔ بڑے ہی سویٹ بچے ہیں۔ باہر سے آئے ہیں، ہوسٹل میں جگہ نہیں ملی اس لیے کمرہ لے کر رہ رہے ہیں۔ شام کو جب تمھارے پاپا آئیں گے تب بُلوا لیں گے۔"

انتظار میں وقت اتنا بوجھل ہو جاتا ہے، یہ بھی میرا پہلا تجربہ تھا۔ پاپا آئے تو ممی نے بڑی اُمنگ سے ساری بات بتائی۔ سب سے جدا اپنا رویہ اپنانے کا اطمینان اور فخر ان کے ہر لفظ سے جیسے چھلکتا پڑ رہا تھا۔ پاپا ہی کون پیچھے رہنے والے تھے۔ انھوں نے سنا تو وہ بھی بڑے خوش۔

"بلاؤ لڑکوں کو! ارے کھیلنے کھانے دو اور مزے کرنے دو۔ بچے ہیں۔" ممی پاپا کو اپنے کو ماڈرن ثابت کرنے کا یہ بہت اچھا موقع مل رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

نوکر کو بھیج کر اُنھیں بلوایا گیا تو اگلے ہی لمحے سب حاضر! ممی نے بڑے قاعدے سے تعارف کرایا اور "ہیلو ہائے" کا تبادلہ ہوا۔

"تنو بیٹے، اپنے دوستوں کے لیے چائے بناؤ نا!"

دھت تیرے کی! ممی کے دوست آئیں تب بھی تنو چائے بنائے اور اُس کے دوست آئیں تب بھی۔ پر دل مار کر اٹھی۔

چائے پانی ہوتا رہا، خوب ہنسی مذاق بھی۔ وہ صفائی پیش کرتے رہے کہ محلے والے خواہ مخواہ ہی ان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ وہ تو ایسا کچھ بھی نہیں کرتے۔ "جسٹ فار فن" کچھ کہہ دیا، ورنہ ان سب کا کچھ مطلب نہیں۔

پاپا نے بڑھاوا دیتے ہوئے کہا، "ارے اس عمر میں تو یہ سب کرنا ہی چاہیے۔ ہمیں موقع ملے تو آج بھی ایسا کرنے سے باز نہ آئیں!"

ہنسی کی ایک لہر یہاں سے وہاں تک دوڑ گئی۔ کوئی دو گھنٹے بعد وہ چلنے لگے تو ممی نے کہا، "دیکھو، اسے اپنا ہی گھر سمجھنا۔ جب جی چاہے چلے آؤ۔ ہماری تنو بیٹی کو اچھی کمپنی مل جائے گی۔ کبھی تم لوگوں سے کچھ پڑھ بھی لیا کرے گی۔ اور دیکھو، کبھی کچھ کھانے پینے کو دل چاہے تو بتا دیا کرو، تمھارے لیے بنوا دیا کروں گی۔" اور وہ لوگ پاپا کی بے تکلفی اور ممی کی اپنائیت پر نثار ہو ہو کر چلے گئے۔ بس جس سے دوستی کرانے کے لیے بلایا تھا اس کی حیثیت صرف تماشا دیکھنے والے کی رہی۔

ان کے جانے کے بعد بڑی دیر تک وہ لوگ موضوعِ گفتگو رہے۔ اپنے گھر کی جوان لڑکی کو چھیڑنے والے لڑکوں کو گھر بلا کر چائے پلائی جائے اور لڑکی سے دوستی کرائی جائے، یہ ساری بات بڑی تھرلنگ اور رومینٹک لگ رہی تھی۔ دوسرے دن سے ممی ہر آنے والے سے اس واقعے کا ذکر کرتیں۔ بیان کرنے میں تو ممی کا جواب ہی نہیں۔ روکھی پھیکی اور غیر دلچسپ باتوں میں بھی اپنے بیان کے جادو سے وہ جان ڈال دیتیں کہ سننے والوں کو مزہ آجائے، اور پھر یہ بات تو تھی ہی دلچسپ۔ جو سنتا وہی کہتا، "واہ، یہ ہوئی نا بات! آپ کا رویہ اور آپ کے نظریات بڑے صحت مندانہ ہیں۔ ورنہ لوگ باتیں تو بڑی بڑی کریں گے، پر بچوں کو گھونٹ کر رکھیں گے، اور ذرا سا شک شبہ ہو جائے تو باقاعدہ جاسوسی کریں گے۔" اور ممی اس تعریف سے نہال ہو جاتیں۔ کہتیں، "اور نہیں تو کیا! آزاد رہو اور بچوں کو آزاد رہنے دو۔ ہم لوگوں کو بچپن میں یہ مت کرو، یہاں مت جاؤ، وہاں مت کھڑے ہو کہہ کہہ کر کتنا باندھا گیا تھا۔ ہمارے بچے تو کم سے کم اس گھٹن کا شکار نہ ہوں۔"

پر ممی کا بچہ اُس وقت ایک دوسری گھٹن کا شکار تھا، اور وہ یہ کہ جس ڈرامے کی ہیروئن اُسے بننا تھا اس کی ہیروئن ممی بن بیٹھیں۔

خیر، اس سارے واقعے کا انجام تو یہ ہوا کہ اُن لڑکوں کا بیوہار ایک دم بدل گیا۔ جس شرافت کو ممی نے ان پر لاد دیا تھا، اسی کے مطابق رویہ اختیار کرنا اُن کی مجبوری بن گیا۔ اب وہ جب بھی اپنی چھت پر

ہوتے اور می پاپا کو دیکھتے تو ادب سے ایک نمستے، اور مجھے دیکھتے تو مسکراہٹوں میں لپیٹ کر ایک ہائے اُچھال دیتے۔ پھبتیوں کی جگہ باقاعدہ ہماری گفتگو شروع ہو گئی، بہت ہی کھلی اور بے جھجک۔ ہمارے برآمدے اور اُن کی چھت میں اتنا ہی فاصلہ تھا کہ زور سے بولنے پر بات چیت کی آواز جا سکتی تھی۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ ہماری بات چیت سارا محلہ سنتا تھا اور کافی دل چسپی سے سنتا تھا۔ جیسے ہی ہم لوگ شروع ہوتے، پاس پڑوس کی کھڑکیوں میں چار چھ سر اور دھڑ آ کر چپک جاتے۔ محلوں میں لڑکیوں کے پیار محبت کے قصے نہ ہوں، ایسی بات تو تھی نہیں۔ باقاعدہ لڑکیوں کے بھاگنے تک کے واقعات ہو چکے تھے۔ پر وہ سب کچھ بڑے خفیہ طریقے سے ہوتا تھا، اور محلے والے جب اپنی تیز نظروں سے بھانپ لیتے اور ان رازوں کو جان لیتے تو بڑا اطمینان حاصل ہوتا تھا انھیں۔ مرد مونچھوں پر تاؤ دے دے کر اور عورتیں ہاتھ نچا نچا کر، خوب نمک مرچ لگا کر ان واقعات کی تشہیر کرتی تھیں۔ کچھ اس انداز سے کہ ارے ہم نے دنیا دیکھی ہے، ہماری آنکھوں میں کوئی دھُول نہیں جھونک سکتا۔ پر یہاں معاملہ ہی اُلٹ گیا۔ ہماری گفتگو اتنی کھلے عام ہوتی تھی کہ لوگوں کو کھڑکیوں کی اوٹ میں چھپ چھپ کر سننا پڑتا تھا اور سن کر بھی ان کے ہاتھ ایسا کچھ نہیں لگتا تھا جس سے ان کے دلوں کو کچھ تقویت پہنچتی۔

پر بات تو بڑھنی تھی اور بات بڑھی۔ ہوا یہ کہ دھیرے دھیرے چھت والی محفل میرے اپنے کمرے میں جمنے لگی۔ روز ہی کبھی دونوں، کبھی تین چار لڑکے آ کر جم جاتے اور دنیا بھر کا ہنسی مذاق اور گپ شپ چلتی رہتی۔ گانا بجانا بھی ہوتا اور چائے پانی بھی۔ شام کو می پاپا آتے تو ان لوگوں میں سے کوئی نہ کوئی بیٹھا ہی ہوتا۔ شروع میں جن لوگوں نے "آزاد رہو اور آزاد رہنے دو" کی بڑی طرف داری کی تھی انھوں نے آزاد رہنے کا جو روپ دیکھا تو ان کی آنکھوں میں بھی کچھ عجیب سے شک تیرنے لگے۔ می کی ایک آدھ دوست نے دبی زبان سے کہا بھی: "تنو بہت فاسٹ چل رہی ہے۔" می کا اپنا سارا جوش ماند پڑ گیا تھا اور روایات سے ہٹ کر کچھ کرنے کی تھرل پوری طرح جھڑ چکی تھی۔ اب تو انھیں اس ننگی سچائی کو جھیلنا تھا کہ ان کی نہایت ہی کچی اور نازک عمر کی بیٹی تین چار لڑکوں کے بیچ گھری رہتی ہے، اور می کی حالت یہ تھی کہ وہ نہ تو ان حالات کو پوری طرح قبول کر پا رہی تھیں اور نہ اپنے ہی، جوش میں شروع کیے ہوئے اس سلسلے کو توڑ پا رہی تھیں۔

آخر ایک دن انھوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر کہا، "تنو بیٹے، یہ لوگ روز روز یہاں آ کر جم جاتے ہیں۔ آخر تجھ کو پڑھنا بھی تو ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ اس دوستی کے چکر میں تیری پڑھائی لکھائی سب چوپٹ ہوئی جا رہی ہے۔ اس طرح تو یہ سب چلے گا نہیں۔"

"رات کو پڑھتی تو ہوں۔"

"خاک پڑھتی ہے رات کو! وقت ہی کتنا ملتا ہے؟ ٹھیک ہے، چار چھ دن میں کبھی آ گئے، گپ شپ کر لی، پر یہاں تو ایک نہ ایک روز ہی ڈٹا رہتا ہے۔" می کے لہجے میں غصّے کی جھلک تیز ہو رہی تھی۔

می کی یہ ٹون مجھے اچھی نہیں لگی، مگر میں چپ رہی۔

Scanned with CamScanner

"تو ان سے بہت کھُل گئی ہے۔ کہہ دے کہ وہ لوگ بھی بیٹھ کر پڑھیں اور تجھے بھی پڑھنے دیں۔ اور تجھ سے نہ کہا جائے تو میں کہہ دوں گی۔"

پر کسی کے بھی کہنے کی نوبت نہیں آئی۔ کچھ تو پڑھائی کی مار سے کچھ دلّی شہر کی دوسری رونقوں سے کھنچے، اور اس طرح ہوسٹل کے جو لڑکے اِدھر آتے تھے ان کا آنا جانا کم ہو گیا۔ پر سامنے کے کمرے والا شیکھر روز ہی آجاتا، کبھی دوپہر میں تو کبھی شام کو۔ تین چار لوگوں کی موجودگی میں اُس کی جس بات پر میں نے دھیان نہیں دیا تھا، وہی بات اکیلے میں سب سے زیادہ اُجاگر ہو کر آئی۔ وہ بولتا کم تھا، پر لفظوں سے پرے بہت کچھ کہنے کی کوشش کرتا تھا، اور ایکا ایک ہی میں اُس کی اَن کہی بولی سمجھنے لگی تھی؛ صرف سمجھنے ہی نہیں لگی تھی بلکہ جواب بھی دینے لگی تھی۔ جلد ہی میری سمجھ میں آگیا کہ شیکھر کے اور میرے بیچ پریم جیسی کوئی چیز پنپنے لگی ہے۔ یوں تو شاید میں سمجھ نہ پاتی، پر ہندی فلمیں دیکھنے کے بعد ان باتوں کو سمجھنے میں کوئی خاص مشکل نہیں ہوئی۔

جب تک دل میں کچھ نہیں تھا سب کچھ بڑا کھلا کھلا تھا، مگر جیسے ہی "کچھ" ہوا تو اسے دوسروں کی نظر سے بچانے کی خواہش بھی ہوئی۔ جب کبھی دوسرے لڑکے آتے تو سیڑھیوں ہی سے شور مچاتے ہوئے آتے، زور زور سے بولتے، لیکن شیکھر جب بھی آتا رینگتا ہوا آتا اور پھسپھسا کر ہم باتیں کرتے۔ ویسے باتیں بہت عام سی ہوتی تھیں، اسکول کی، کالج کی، مگر یہ باتیں کبھی کانا پھوسی ہی کے انداز میں اچھی لگتی تھیں۔ پریم کو کچھ پُراسرار، کچھ گپ چُپ بنا دو تو بڑا تھرِل ہو جاتا ہے ورنہ تو ایک دم سیدھا سپاٹ۔ پر ممی کے پاس گھر اور گھر والوں کے ہر راز کو جان لینے کی جو چھٹی حِس ہے -- اور جس میں پاپا بھی کافی طاق ہیں -- اس سے انہیں یہ سب سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ شیکھر کتنا ہی لک چھپ کر آتا اور ممی گھر کے کسی بھی کونے میں ہوتیں، جھٹ سے آموجود ہوتیں یا پھر وہیں سے پوچھتیں، "تنو، کون ہے تمہارے کمرے میں؟"

میں نے دیکھا کہ شیکھر کے اس رویّے سے ممی کے چہرے پر عجیب سی پریشانی جھلکنے لگی ہے۔ پر ممی اس بات پر یوں پریشان ہو اُٹھیں گی، یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جس گھر میں دن رات طرح طرح کی محبتوں ہی کا ذکر چھڑا رہتا ہو -- کنواروں کی محبت، شادی شدہ لوگوں کے افیئرز، دو تین پریمیوں سے ایک ساتھ چلنے والے کیسز -- اس گھر کے لیے تو یہ بات بہت ہی معمولی ہونی چاہیے۔ جب لڑکوں سے دوستی ہو گی تو ایک آدھ سے محبت بھی ہو سکتی ہے۔ ممی نے شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ سب کچھ آج کل کی آرٹ فلموں کی طرح چلے گا -- جن کی وہ نہ صرف قائل ہیں بلکہ دل دادہ بھی -- جن میں شروع سے آخر تک کوئی سنسنی خیز واقعہ ہوتا ہی نہیں۔

جو بھی ہو، ممی کی اس پریشانی نے مجھے بھی ہلکا سا بے چین کر دیا۔ ممی میری ماں ہی نہیں، دوست اور ساتھی بھی ہیں۔ دو گہرے دوستوں کی طرح ہم دنیا جہان کی باتیں کرتے ہیں، ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ وہ اس بارے میں بھی کچھ بات کریں، پر انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ بس جب شیکھر

Scanned with CamScanner

اتا تو وہ اپنی فطری بے پروائی چھوڑ کر بڑی ہوشیاری سے میرے کمرے کے ارد گرد منڈلاتی رہتیں۔

ایک دن ممی کے ساتھ باہر جانے کے لیے نیچے اتری تو دروازے ہی پر پڑوس کی ایک شریف خاتون ٹکرا گئیں۔ نمستے اور حال چال کے تبادلے کے بعد وہ اصل بات پر آئیں۔

"یہ سامنے کی چھت والے لڑکے آپ کے رشتے دار ہیں کیا؟"

"نہیں تو۔"

"اچھا؟ شام کو روز آپ کے گھر میں بیٹھے رہتے ہیں، تو سوچا آپ کے ضرور کچھ لگتے ہوں گے۔"

"تنو کے دوست ہیں،" ممی نے کچھ ایسی بے ساختگی سے اور بے جھجک انداز میں جملہ اُچھالا کہ بے چاری تیر نشانے پر نہ لگنے کا غم لیے ہوئے لوٹ گئیں۔

وہ تو لوٹ گئیں، پر مجھے لگا کہ اس بات کا سرا پکڑ کر ہی ممی اب ضرور تھوڑی میری دھُنائی کر دیں گی۔ کھنے والی کا تو کچھ نہ بگڑا، پر میرا بگڑنے کا ہتھیار تو ممی کے ہاتھ میں آ ہی گیا۔ بہت دنوں سے ان کے اپنے من میں کچھ اُتھل پتھل تو ہے ہی۔ پر ممی نے اتنا کہا:

"لگتا ہے ان کے اپنے گھر میں کوئی دھندا نہیں ہے۔ جب دیکھو دوسروں کے گھر میں چونچ گڑائے بیٹھے رہتے ہیں۔"

مجھے اطمینان ہی نہیں ہوا بلکہ ممی کی طرف سے اسے گرین سگنل سمجھ کر میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ پر اتنا ضرور کیا کہ شیکھر کے ساتھ تین گھنٹوں میں سے ایک گھنٹا ضرور پڑھائی کرتی۔ وہ بہت دل لگا کر پڑھاتا اور میں بہت دل لگا کر پڑھتی۔ ہاں، بیچ بیچ میں وہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پُرزوں پر کچھ ایسے اشعار لکھ کر تھما دیتا کہ میں اندر تک جھنجھنا اُٹھتی اور ان کے ایک ایک لفظ کا تاثر میری رگ رگ میں سنسناتا رہتا اور میں انھیں میں ڈوبی رہتی۔

میرے اندر اپنی ہی ایک دنیا بنتی جا رہی تھی، بڑی بھری پُری اور بڑی رنگین۔ آج کل مجھے کسی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ لگتا جیسے میں اپنے ہی میں پوری ہوں۔ ہمیشہ ساتھ رہنے والی ممی بھی آؤٹ ہوتی جا رہی ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اِدھر میں نے ممی پر دھیان دینا ہی چھوڑ دیا ہے۔ روزمرہ کی باتیں تو ہوتی ہیں، پر صرف باتیں ہوتی ہیں، اس کے پرے کہیں کچھ نہیں۔

دن گزرتے جا رہے تھے اور میں اپنے ہی میں ڈوبی اور اور گہری اُترتی چلی جا رہی تھی، باہر کی دنیا سے ایک طرح بے خبر سی۔

ایک دن اسکول سے لوٹی، کپڑے بدلے، شور شرابے کے ساتھ کھانا مانگا، مین میخ کے ساتھ کھایا، اور جب کمرے میں داخل ہوئی تو ممی نے لیٹے لیٹے ہی بلایا:

"تنو، ادھر آؤ۔"

پاس گئی تو پہلی بار دیکھا کہ ممی کا چہرہ تمتما رہا ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ انھوں نے سائیڈ ٹیبل پر سے ایک کتاب اٹھائی اور اس میں سے کاغذ کے پانچ چھ پُرزے نکال کر سامنے کر دیے۔ توبہ! ممی سے کچھ پڑھنا

Scanned with CamScanner

تھا سو جاتے ہوئے انھیں اپنی کتاب دے گئی تھی۔ غلطی سے شیکھر کی لکھی پرچیاں اس میں رہ گئی تھیں۔

"تو اس طرح چل رہی ہے شیکھر کی اور تمھاری دوستی؟ یہی پڑھائی ہوتی ہے یہاں بیٹھ کر؟ یہی سب کرنے کے لیے آتا ہے وہ یہاں؟"

میں چپ۔ جانتی ہوں غصے میں ممی کو جواب دینے سے بڑھ کر کوئی بےوقوفی نہیں ہو گی۔

"تم کو چھوٹ دی، آزادی دی، پر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اس کا ناجائز فائدہ اٹھاؤ!"

میں پھر بھی چپ۔

"بیٹے بھر کی لڑکی اور کرتوت دیکھو اس کے! جتنی چھوٹ دی اتنے ہی پیر پسرتے جا رہے ہیں۔ ایک جھانپڑ دوں گی تو سارا رومانس جھڑ جائے گا دو منٹ میں۔"

اس جملے پر ایک دم تلملا اٹھی مَیں! تنک کر نظر اٹھائی اور ممی کی طرف دیکھا۔ پر یہ کیا! یہ تو میری ممی نہیں ہیں۔ نہ یہ تیور ممی کے ہیں، نہ یہ زبان۔ پھر بھی یہ جملے بہت جانے پہچانے لگے۔ لگا یہ سب میں نے کہیں سنا ہے، اور کھٹاک سے میرے دماغ میں کوندھا: نانا! پر نانا کو مرے تو کتنے سال ہو گئے۔ پھر یہ زندہ کیسے ہو گئے؟ اور وہ بھی ممی کے اندر، جو ہوش سنبھالنے کے بعد ہمیشہ ان سے جھگڑا ہی کرتی رہیں، ان کی ہر بات کی مخالفت کرتی رہیں۔

ممی کی "نانائی" لہجے والی گفتگو کافی دیر تک جاری رہی، پر وہ مجھے کہیں سے چھو نہیں رہی تھی۔ بس کوئی بات جھنجھوڑ رہی تھی تو یہی کہ ممی کے اندر نانا کیسے آ بیٹھے!

اور پھر گھر میں ایک عجیب سا تناؤ اور خاموشی چھا گئی، خاص کر میرے اور ممی کے بیچ۔ نہیں، ممی تو اس گھر میں رہیں ہی نہیں، میرے اور نانا کے درمیان۔ ممی کو میں اپنی بات سمجھا بھی سکتی ہوں، اُن کی بات سمجھ بھی سکتی ہوں۔ پر نانا؟ میں تو اس زبان سے بھی ناواقف ہوں اور اس کے تیور سے بھی، بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! پاپا ضرور میرے دوست ہیں پر بالکل دوسری طرح کے۔ شطرنج کھیلنا، پنجہ لڑانا، اور جو فرمائش ممی پوری نہ کریں، ان سے پوری کروا لینا۔ بچپن میں ان کی پیٹھ پر لدی رہتی تھی اور اپنی ہر خواہش پوری کروا لیتی تھی۔ پر اتنے "مائی ڈیر فرینڈ" ہونے کے باوجود اپنی نجی باتیں مَیں ممی ہی کے ساتھ کرتی آئی ہوں، اور وہاں ایک دم سناٹا۔ ممی کو پٹخنی دے نانا پوری طرح ان پر سوار جو ہیں۔

شیکھر کو میں نے اشارے ہی سے لال جھنڈی دکھا دی تھی؛ وہ بھی نہیں آ رہا تھا، اور شام کا وقت ہے کہ مجھ سے کاٹے نہیں کٹتا۔

کئی بار من ہُوا کہ ممی سے جا کر بات کروں اور صاف صاف پوچھوں، تم اتنا بگڑ کیوں رہی ہو؟ میری اور شیکھر کی دوستی کے بارے میں تم جانتی تو ہو۔ میں نے تو کبھی کچھ چھپایا نہیں۔ اور دوستی ہے تو یہ سب تو ہو گا ہی۔ تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ ہم لوگ بھائی بہن کی طرح--- پر کبھی خیال آتا، ممی ہیں ہی کہاں جو جا کے کہوں یہ سب؟

چار دن ہو گئے، میں نے شیکھر کی صورت تک نہیں دیکھی۔ میرے بلکے سے اشارے ہی سے اس

Scanned with CamScanner

بے چارے نے گھر تو کیا، چھت پر بھی آنا چھوڑ دیا۔ ہوسٹل میں رہنے والے اس کے ساتھی بھی چھت پر نہیں دکھائی دیے، نہ گھر ہی آئے۔ کوئی آتا تو کم از کم اُس کا حال ہی پوچھ لیتی۔ میں جانتی ہوں، وہ بے وقوفی کی حد تک جذباتی ہے۔ اُسے تو ٹھیک سے یہ بھی نہیں معلوم کہ آخر یہاں ہوا کیا ہے۔ لگتا ہے کہ ان لوگوں نے ممی کے رویّے کو بھانپ لیا۔

ویسے کل سے ممی کے چہرے کا تناؤ کچھ ڈھیلا ضرور ہوا ہے۔ تین دن سے جمی ہوئی سختی جیسے پگھل گئی ہو۔ پر میں نے طے کر لیا ہے کہ بات اب ممی ہی کریں گی۔

صبح نہا دھو کر میں دروازے کے پیچھے اپنی یونیفارم پریس کر رہی تھی۔ باہر میز پر ممی چائے بنا رہی تھیں اور پاپا اخبار میں سر گڑائے بیٹھے تھے۔ ممی کو شاید معلوم ہی نہیں ہوا کہ میں کب نہا کر باہر نکل آئی۔ وہ پاپا سے بولیں:

"جانتے ہو کل رات کو کیا ہوا؟ تب سے طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے۔ میں تو رات بھر سو ہی نہیں سکی۔"

ممی کے لہجے کی کوملتا سے میرا ہاتھ جہاں کا تہاں تھم گیا اور کان باہر لگ گئے۔

"آدھی رات کے قریب میں باتھ روم جانے کے لیے اٹھی۔ سامنے چھت پر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اچانک ایک لال ستارہ سا چمک اٹھا۔ میں چونکی۔ غور سے دیکھا تو دھیرے دھیرے ایک سایہ سا اُبھر آیا۔ شیکھر چھت پر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں چپ چاپ لوٹ آئی۔ کوئی دو گھنٹے بعد پھر گئی تو دیکھا وہ اسی طرح چھت پر ٹہل رہا تھا بے چارہ۔ میرا دل جانے کیسا ہو گیا۔ تنو بھی کیسی بجھی بجھی رہتی ہے۔" پھر جیسے اپنے ہی کو دُھتکارتی ہوئی بولیں، "پہلے تو چھوٹ دو، اور جب آگے بڑھیں تو ہیچ کر چاروں شانے چت کر دو۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا!"

سکون کا ایک گہرا سانس میرے اندر سے نکل پڑا۔ جانے کیسے جذبات اُمڈے کہ جی چاہا دوڑ کر ممی کے گلے سے لگ جاؤں۔ لگا جیسے عرصے کے بعد میری ممی لوٹ کر آئی ہوں۔ پر میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس، اب کھل کر بات کروں گی۔ چار دن سے جانے کیسے کیسے سوال دل میں اُٹھ رہے تھے۔ اب کیا، اب تو ممی ہیں، اور کم سے کم ان سے تو سب کہا سنا جا سکتا ہے۔

پر گھر پہنچ کر جو دیکھا تو حیران! شیکھر ہتھیلیوں پر سر تھامے کرسی پر بیٹھا ہے اور ممی اسی کرسی کے ہتھے پر بیٹھی اُس کی پیٹھ اور ماتھا سہلا رہی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بڑے میٹھے انداز میں بولیں:

"دیکھا اس پگلے کو؟ چار دن سے یہ صاحب کالج نہیں گئے ہیں۔ نہ کچھ کھایا پیا ہے۔ اپنے ساتھ اس کا بھی کھانا لگوانا۔"

اور پھر ممی نے خود بیٹھ کر بڑے پیار بھرے انداز میں اس کو کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد روکنے پر بھی شیکھر ٹھہرا نہیں۔ ممی کے تئیں احسان مندی کے بوجھ سے جھکا جھکا ہی وہ لوٹ گیا اور میرے اندر خوشی کا ایسا جوار بھاٹا اُمڈا کہ اب تک کے اٹھے سارے سوال اسی میں بہہ گئے۔

Scanned with CamScanner

سارے حالات کو قابو میں آنے میں وقت تو لگا، پر آ گئے۔ شیکھر نے بھی اب ایک دو دن چھوڑ کر آنا شروع کر دیا، اور آتا بھی تو ہم زیادہ تر پڑھائی لکھائی ہی کی بات کرتے۔ اپنے کیے پر شرمندگی ظاہر کرتے ہوئے اُس نے ممی سے وعدہ کیا تھا کہ اب کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جس سے ممی کو شکایت ہو۔ جس دن وہ نہ آتا، میں تھوڑی دیر کے لیے اپنے برآمدے ہی سے بات کر لیا کرتی۔ گھر کی اجازت اور مدد سے سرِعام چلنے والے پیار کے اس کھیل میں محلّے والوں کے لیے بھی کچھ نہیں رہ گیا تھا اور انھوں نے اس جان لیوا زمانے پر دو چار لعنتیں بھیج کر، کوئی گل کھلنے تک کے لیے اپنی دل چسپی کو ملتوی کر دیا تھا۔

لیکن ایک بات میں نے ضرور دیکھی۔ جب بھی شیکھر شام کو کچھ زیادہ دیر بیٹھ جاتا یا دوپہر میں بھی آتا، تو ممی کے اندر نانا کسمسانے لگتے۔ کوشش بھر، ممی نانا کو بولنے تو نہ دیتیں پر انھیں پوری طرح ہٹا دینا بھی شاید ممی کے بس میں نہیں تھا۔

ہاں، یہ افیئر میرے اور ممی کے بیچ اب روزمرہ کی بات چیت کا موضوع ضرور بن گیا تھا۔ کبھی وہ مذاق میں کہتیں، "یہ جو تمھارا شیکھر ہے نا، بڑا لجلجا سا لڑکا ہے۔ ارے اس عمر کے لڑکوں کو چاہیے، گھومیں پھریں، موج کریں۔ یہ کیا محرّمی سی صورت بنائے مجنوں کی طرح چھت پر ٹنگا سارے وقت اِدھر ہی تاکتا رہتا ہے!"

میں صرف ہنس دیتی۔

کبھی بڑی جذباتی ہو کر کہتیں، "تو کیوں نہیں سمجھتی بیٹے، کہ تجھ سے کتنی امیدیں لگا رکھی ہیں میں نے۔ تیرے مستقبل کے لیے کتنے خواب دیکھے ہیں!"

میں ہنس کر کہتی، "ممی، تم بھی کمال کرتی ہو! اپنی زندگی کے بارے میں بھی تم خواب دیکھو اور میری زندگی کے خواب بھی تمھیں دیکھ ڈالو۔ کچھ خواب میرے لیے بھی چھوڑ دو نا!"

کبھی وہ سمجھانے والے لہجے میں کہتیں، "دیکھو تنو، ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ اپنا سارا دھیان لکھنے پڑھنے میں لگاؤ اور دماغ سے یہ الٹے سیدھے فتور نکال ڈالو۔ ٹھیک ہے، بڑی ہو جاؤ تو پریم بھی کرنا اور شادی بھی۔ ویسے بھی میں تو تمھارے لیے لڑکا ڈھونڈنے والی ہوں نہیں۔ اپنے آپ ہی ڈھونڈنا، پر اتنی عقل تو آ جائے کہ ڈھنگ کا انتخاب کر سکو۔"

اپنے انتخاب کے ریجکشن کو میں سمجھ جاتی اور پوچھتی، "اچھا ممی، بتاؤ جب تم نے پاپا کو چُنا تو یہ بات نانا کو پسند تھی؟"

"میرا انتخاب! اپنی ساری پڑھائی لکھائی ختم کر کے پچیس سال کی عمر میں انتخاب کیا تھا میں نے۔ خوب سوچ سمجھ کر اور عقل کے ساتھ، سمجھیں؟" ممی اپنی بوکھلاہٹ کو غصّے میں چھپا کر کہتیں۔ عمر اور پڑھائی لکھائی، یہی دو تو ایسے معاملے ہیں جن پر ممی مجھے جب تب ڈانٹتی رہتی ہیں۔ پڑھنے لکھنے میں مَیں اچھی تھی، اور رہا عمر کا سوال تو اس کے لیے جی چاہتا کہ کہوں: ممی، تمھاری پیڑھی جو کام پچیس سال کی عمر میں کرتی تھی، ہماری اُسے پندرہ سال ہی کی عمر میں کرے گی۔ اسے تم کیوں نہیں سمجھتیں؟ پر چپ رہ جاتی۔

Scanned with CamScanner

نانا کا ذکر تو چل ہی پڑا ہے، کہیں وہ جی جاگ اٹھے تو؟

ہاف ایئرلی کا وقت قریب آ گیا تھا اور میں نے سارا دھیان پڑھنے میں لگا دیا تھا۔ سب کا آنا جانا اور گانا بجانا ایک دم بند! اُن دنوں مَیں نے اتنی جم کر پڑھائی کی کہ ممی کا جی خوش ہو گیا۔ شاید کچھ مطمئن بھی۔ آخری پیپر دینے کے بعد لگ رہا تھا کہ ایک بوجھ تھا جو ہٹ گیا۔ دل بہت ہلکا ہو کر کچھ مزے کرنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے ممی سے پوچھا:

"ممی، کل دیپک اور شیکھر پکچر جا رہے ہیں۔ میں بھی ساتھ چلی جاؤں؟" آج تک میں ان لوگوں کے ساتھ گھومنے نہیں گئی تھی، پر اب اتنی پڑھائی کرنے پر یہ چھوٹ تو ملنی ہی چاہیے تھی۔

ممی ایک پل میرا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں، "اِدھر آ، یہاں بیٹھ۔ تجھ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

میں جا کر بیٹھ گئی، پر یہ نہ سمجھ میں آیا کہ اس میں بات کرنے والی کیا چیز ہے۔ ہاں کہو یا نہ۔ لیکن ممی کو بات کرنے کا مرض جو ہے۔ ان تو ہاں نہ بھی پچاس ساٹھ جملوں میں لپیٹے بغیر نہیں نکل سکتی۔

"تیرے امتحان ختم ہو گئے، میں تو خود پکچر کا پروگرام بنا رہی تھی۔ کون سی پکچر دیکھنا چاہتی ہے؟"

"کیوں؟ ان لوگوں کے ساتھ جانے میں کیا ہے؟" میرے لہجے میں اتنی جھنجھلاہٹ بھری ہوئی تھی کہ ممی ایک ٹک میرا چہرہ ہی دیکھتی رہ گئیں۔

"تنو، تجھے پوری چھوٹ دے رکھی ہے بیٹے، پر اتنا ہی تیز چل کہ میں بھی تیرے ساتھ چل سکوں۔"

"تم صاف کہو نا کہ جانے دو گی یا نہیں؟ بے کار کی باتیں! میں بھی ساتھ چل سکوں! تمہارے ساتھ چل سکنے کی بات کہاں سے آ گئی؟"

ممی نے میری پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا، "ساتھ تو چلنا ہی پڑے گا۔ کبھی اوندھے منہ گری تو اٹھانے والا بھی تو ہونا چاہیے نا!"

میں سمجھ گئی کہ ممی نہیں جانے دیں گی۔ پر اس طرح پیار سے منع کرتی ہیں تو جھگڑا بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ بحث کرنے کا سیدھا سا مطلب ہے کہ ان کا بگھارا ہوا فلسفہ سنو، یعنی پچاس منٹ کی ایک کلاس۔ پر میں قطعی نہیں سمجھ پائی کہ جانے میں آخر حرج کیا ہے۔ ہر بات میں انکار! کہاں تو کہتی تھیں کہ بچپن میں یہ مت کرو، یہاں مت جاؤ کہہ کر ہم کو بہت ڈانٹا گیا تھا، اور اب خود وہی سب کر رہی ہیں۔ دیکھ لیا ان کی بڑی بڑی باتوں کو۔ میں اٹھی اور دندناتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ ہاں، ایک جملہ ضرور تھما آئی۔

"ممی، جو چلے گا وہ گرے گا بھی، اور جو گرے گا وہ اٹھے گا بھی، اور خود ہی اٹھے گا، اسے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔"

پتا نہیں میری اس بات کا ان پر کیا ری ایکشن ہوا، یا خود بخود انھیں احساس ہوا، کہ انھوں نے شیکھر اور اس کے کمرے پر آئے ہوئے تینوں چاروں لڑکوں کو بلا کر میرے ہی کمرے میں محفل جموائی اور خوب گرم گرم کھانا کھلایا۔ کچھ ایسا رنگ جما کہ دوپہر والا سارا غبار دُھل گیا۔

Scanned with CamScanner

امتحان ختم ہو گئے تھے اور موسم سہانا تھا۔ ممی کا رویہ بھی نارمل تھا تو دوستی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر شروع ہو گیا، اور آج کل تو جیسے اس کے سوا کچھ رہ ہی نہیں گیا تھا۔ پر پھر ایک جھٹکا!

اس دن میں اپنی سہیلی کے گھر سے لوٹی تو ممی کی سخت آواز سنائی دی:

"تنو، اِدھر آؤ تو!"

آواز ہی سے لگا کہ یہ خطرے کا سگنل ہے۔ ایک پل کو تو میں سکتے میں آ گئی۔ پاس گئی تو چہرہ پہلے کی طرح سخت۔

"تم شیکھر کے کمرے میں جاتی ہو؟" ممی نے بندوق داغی۔ سمجھ گئی کہ پیچھے گلی میں سے کسی نے اپنا کرتب کر دکھایا۔

"کب سے جاتی ہو؟"

دل تو چاہا کہ کہوں، جس نے جانے کی خبر دی ہے اُس نے باقی ساری باتیں بھی بتا دی ہوں گی -- کچھ جوڑ توڑ کر ہی بتایا ہو گا۔ پر ممی جس طرح بھبھک رہی تھیں، اسے دیکھ کر چپ ہی رہنا بہتر سمجھا۔ ویسے مجھے ممی کے اس غصے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ دو تین بار اگر میں تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے شیکھر کے کمرے پر چلی گئی تو ایسا کیا گناہ ہو گیا۔ پر ممی کی ہر بات کی کوئی وجہ تو ہوتی نہیں، بس مُوڈ پر چلتی ہیں۔

عجیب مصیبت تھی! غصے میں ممی سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، اور میری چپ ان کے غصے کو اَور بھڑکا رہی تھی۔

"یاد نہیں ہے، میں نے شروع ہی میں منع کر دیا تھا کہ تم ان کے کمرے پر کبھی نہیں جاؤ گی۔ تین تین گھنٹے وہ یہاں دھُونی رما کر بیٹھتا ہے، اس میں جی بھرا نہیں تمہارا؟"

دکھ، غصے اور دہشت کی پرتیں ان کے چہرے پر گہری ہوتی جا رہی تھیں اور میں سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ کیسے اُنہیں ساری کیفیت سمجھاؤں۔

"وہ تو بے چاری سامنے والی نے مجھے بلا کر آگاہ کر دیا۔ جانتی ہو، یہ سر آج تک کسی کے سامنے نہیں جھکا، پر وہاں مجھ سے آنکھ نہیں اٹھائی گئی۔ منہ دکھانے لائق مت رکھنا ہم کو کہیں بھی۔ ساری گلی میں تھو تھو ہو رہی ہے۔ ناک کٹا کر رکھ دی!"

غضب! اس بار تو سارا محلہ ہی بولنے لگا ممی کے اندر سے! تعجب ہے ممی آج تک اپنے آس پاس سے بالکل کٹی رہیں، جس کا مذاق اڑایا کرتی تھیں، آج کیسے اُس کے سُر میں سُر ملا کر بول رہی ہیں۔

ممی کی تقریر بدستور جاری رہی، پر میں نے تو اپنے کانوں کے سوئچ ہی آف کر لیے۔ جب غصہ ٹھنڈا ہو گا، ممی اپنے میں لوٹ آئیں گی، تب سمجھا دوں گی: ممی، اس چھوٹی سی بات کو تم ناحق اتنا طول دے رہی ہو!

پر جانے کیسی ڈوز لے کر آئی ہیں اِس بار، کہ ان کا غصہ ٹھنڈا ہی نہیں ہو رہا ہے، اور ہوا یہ کہ اب

Scanned with CamScanner

اُن کے غصے سے مجھے غصہ چڑھنے لگا۔

پھر گھر میں ایک عجیب سا تناو بڑھ گیا۔ اس بار ممی نے شاید پاپا کو بھی سب کچھ بتا دیا۔ کہا تو انھوں نے کچھ نہیں۔۔وہ شروع ہی سے اس سارے معاملے سے آوٹ ہی رہے تھے۔۔مگر اِس بار اُن کے چہرے پر بھی ایک اَن کہا سا تناو دکھائی ضرور دے رہا ہے۔

کوئی دو مہینے پہلے جب اس طرح کا واقعہ ہوا تھا تو میں اندر تک سہم گئی تھی، پر اِس بار میں نے طے کر لیا ہے کہ اس سارے معاملے میں ممی کو اگر نانا بن کر برتاو کرنا ہے تو مجھے بھی پھر ممی کی طرح مورچہ لینا ہو گا ان سے، اور میں ضرور لوں گی۔ دکھا تو دوں کہ میں تمھاری ہی بیٹی ہوں اور تمھارے ہی نقشِ قدم پر چلی ہوں۔ خود تو لیک سے ہٹ کر چلی تھیں، ساری زندگی اس بات کی گھٹی پلاتی رہیں، پر میں نے جیسے ہی اپنا پہلا قدم رکھا، گھسیٹ کر مجھے اپنی ہی کھینچی ہوئی لیک پر لانے کی دوڑ دھوپ کرنے لگیں۔

میں نے دل میں سیکڑوں ہی دلائل سوچ ڈالے کہ ایک دن ممی سے باقاعدہ بحث کروں گی۔ صاف صاف کہوں گی کہ ممی، اتنے ہی بندھن لگا کر رکھنا تھا تو شروع سے ویسے پالتیں۔ کیوں جھوٹ موٹ آزادی دینے کی باتیں کرتی سکھاتی رہیں؟ پر اِس بار میرا بھی من سلگ کر اس طرح راکھ ہو گیا تھا کہ میں گم سم سی اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ جی بہت بھر آتا تو رو لیتی۔ گھر میں سارا سارا دن ہنسنے کھلکھلانے والی میں ایک دم چپ ہو کر اپنے ہی میں سمٹ گئی تھی۔ ہاں، ایک جملہ ضرور بار بار دُہرا رہی تھی: ممی، تم اچھی طرح سمجھ لو کہ میں بھی اپنی ہی مرضی کروں گی! حالاں کہ میرے من میں کیا ہے، اس کا کوئی بھی پلان میرے سامنے نہ تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ ان تین چار دنوں میں باہر کیا ہوا۔ گھر اور باہر کی دنیا سے کٹی، اپنے ہی کمرے میں سمٹی، مَیں ممی سے مورچہ لینے کے داؤں پیچ سوچ رہی تھیں۔

پر آج دوپہر مجھے اپنے کانوں پر قطعی یقین نہیں آیا جب میں نے ممی کو اپنے برآمدے ہی سے چلاتے ہوئے سنا:

"شیکھر، کل تو تم لوگ چھٹیوں میں اپنے گھر چلے جاؤ گے۔ آج شام اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا اِدھر ہی کھانا!"

نہیں معلوم کس کرب سے گزر کر ممی اس کیفیت کو پہنچی ہوں گی۔

اور رات کو شیکھر، دیپک اور روی کے ساتھ، کھانے کی میز پر ڈٹا ہوا تھا۔ ممی اُتنی ہی محبت سے کھانا کھلا رہی تھیں، پاپا ویسے ہی بے تکلفی سے مذاق کر رہے تھے، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اغل بغل کی کھڑکیوں میں دو چار سر چپکے ہوئے تھے۔ سب کچھ پہلے کی طرح جانا پہچانا ہوا اٹھا تھا۔

صرف مَیں ان سارے حالات سے ایک دم الگ تھلگ ہو کر یہی سوچ رہی تھی کہ نانا پوری طرح نانا تھے، سو فی صد! اور اس سے ممی کے لیے لڑنا کتنا آسان ہو گیا ہو گا۔ پر اِن ممی سے لڑا بھی کیسے جائے جو ایک پل نانا ہو کر جیتی ہیں اور دوسرے پل ممی ہو کر۔

**

Scanned with CamScanner

راجی سیٹھ

ہندی سے ترجمہ : زیبا علوی

آمنے سامنے

کل شام ہی سے وہ اپنے پنجوں پر کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ صبح سے تو اس نے ایک طرح سے بھوک ہڑتال سی کر رکھی تھی۔ چائے پانی کچھ نہیں۔ ناشتہ بنایا، لگا دیا۔ بچوں کو اسکول بھیجا، آنند کو آفس۔

پھر میرے کمرے کے دروازے سے لگ کر آ کھڑا ہوا۔ "آج جوس نکال کر تھرمس میں رکھ دوں؟"

چہرہ اٹھانے میں ہتھیلی کے نیچے دبے کاغذ سے کاربن کے کھسک جانے کے اندیشے سے میں نے سر اٹھانے کا جوکھم نہیں لیا۔ کچھ تکلیفوں کی ایک بُو ہوتی ہے، دیوار پر دھوئیں کی طرح چپکی، جنھیں چہروں سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اور ٹالا بھی نہیں جا سکتا۔

منھ اٹھا کر دیکھنے پر کچھ ویسا ہی چہرہ دیکھنے میں آیا جو میرے تصوّر میں تھا: بے چین اور باغی۔

یوں وہ ایک خوش مزاج لڑکا ہے، کچھ ہنسی مذاق کرنے والا بھی، سیر چشم بھی۔ ایسی بے چینی کے ہوڑ جھمیلے سے پرے جو آدمی کو اندر سے ثابت نہیں رہنے دیتی۔ ثابت رہنا اچھا ہے یا بے چین رہنا، یہ ایک کٹھن قسم کا فیصلہ ہے۔ بے چینی نہ ہو تو کوئی آگے ہی نہ چلے، اپنے ثابت اطمینان میں بت بنا بیٹھا رہے۔

اصولی طور پر میں خود بھی اس بے چینی کی قائل ہوں۔ اسی بے چینی نے مجھے بھی کبھی اس قسم کے اطمینان کی مار سے بچایا تھا۔ تب، جب مجھے لگتا تھا میرے جوڑوں ہی میں نہیں میری ہڈیوں میں بھی زنگ لگ چکا ہے۔ میری کھال کے نیچے ربر کے غبارے میں بھرے ہوئے پانی کی طرح قید ایک تھل تھل کرتا بہاؤ ہے جو اِدھر سے اُدھر بس لڑھکتا ہے، کسی سمت کا تعین نہیں بنتا۔

Scanned with CamScanner

اس بے چینی کا کنارہ پکڑ کر چلنا شروع کرنے پر وجود پر جمی کائی ایسے دگمگائی تھی جیسے نیچے سے بھونچال کے اٹھنے پر دھرتی پر برسوں سے سوئی مٹی اور ملبے کی پرتیں۔ اپنی آدھ بیچ چھٹی تعلیم کو پورا کرنے کا میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ حالاں کہ آنند کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ بہت اکھرے تھے اسے بڑھاپے کے یہ بچکانہ آثار۔

میرے اس طرح اچانک وہاں جا کھڑے ہونے پر ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ نے مجھے گھورا تھا۔ میرا کچھ تھل تھل جسم، کمر کے پاس اُبھرے گوشت کی پرتیں، کہنی سے اوپر آستینوں کے ضبط سے باہر ہوتی باہوں کی کھال، آنکھوں پر موٹا چشمہ اور ناخنوں پر پتی نیل پالش کو کوروں پر سے جھٹلاتے چکنائی کے داغ۔ ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ کی جائزہ لیتی نظر نے میری نظر کو مجھی پر گاڑ دیا تھا، کچھ دوسری طرح سے۔ میں کچھ پریشان ہو گئی--- پانی پانی۔

"نوکری؟ وَن ہیز ٹو کم ٹھرو پروپر چینل۔"

"نوکری نہیں--- مجھے داخلہ چاہیے۔"

"یو مین--- یعنی کہ--- کس میں؟"

"ایم اے میں۔"

اپنی نگاہ کو میز تک واپس لے جاتے ہوئے انھوں نے مجھے ایک بار پھر جانچا۔ "بیٹھ جائیے۔"

ظاہر تھا کہ یہ دعوت دنیاداری کی دوڑ کے لحاظ سے بھاری ہو جانے والے میرے گرہست وجود کو دی گئی تھی۔ سامنے بیٹھتے ہوئے میں نے دھیان دیا تھا کہ ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ عمر میں مجھ سے کافی چھوٹا تھا، کچھ کچھ میرے چھوٹے بھائی پنّو جیسا۔ میرے اس کے سامنے اس طرح کھڑے رہنے کی بے آرامی کو اس کا چہرہ اب تک قبول نہیں کر سکا تھا۔

"داخلہ؟" اُس نے یوں ہی کھنکھار کر کہا تھا۔ "اَب؟--- میرا مطلب ہے اِس---"

"ہاں ں ں ں! داخلے کا کیا ہے--- کبھی بھی---"

"نہیں، میرا مطلب ہے--- سب ٹھیک ٹھاک تو ہے نا؟"

مجھے فوراً کوئی جواب نہ سوجھا۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے، پر باہر بھیتر کچھ بھی نہیں۔ میاں کی اونچی نوکری، ایک عدد گھر، دو اچھے بچے، بڑھیا اسکول، وہ سب جسے کیا کہتے ہیں، اچھی حیثیت، سیکڑوں ساڑیاں، درجنوں جوتے، سنہرے روپہلے آئینے--- مگر اندر کہیں کوئی چیز سب کو فالتو کر دیتی ہے، ایکا ایک۔

"آپ سے پہلے بھی کہیں ملا ہوں--- نہیں؟"

"ہاں، مہروترا کی پارٹی میں۔" اُسے بھی یاد آ گیا تھا۔

"پڑھنے کی عادت چھوٹ نہیں جاتی اتنے دنوں میں؟" اس نے پھر جانچنا چاہا تھا۔ "مائی وائف سیز اِٹس اے لگژری تو اسٹے ایٹ ہوم---"

"ٹھیک کہتی ہیں آپ کی پتنی۔" میری اس بات پر وہ چہرہ پھر پُرسکون ہو گیا، جیسے یہ پڑھنے اور پھر نوکری کرنا چاہنے کی مجبوریاں کو کچھ بھی ہیں وہ سمجھتا ہے، اچھی طرح۔

"کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا زندگی کے بارے میں۔۔۔" ایک دھیمی، غیر یقینی سی بُدبُداہٹ انھوں نے سر کائی اور پھر چونک کر اپنے سامنے رکھی گھنٹی ٹنٹنا دی۔ پھر سنجیدگی سے سکڑتے ہوئے بولے، "ون شڈ آلویز بی پریپیرڈ۔۔۔ کبھی بھی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

کچھ ہونے کا ذکر اس وقت بڑا بدحواس کرنے والا لگا تھا۔ اُن واقعوں حادثوں کا کیا ہو جو دوراہوں چوراہوں پر نہیں بلکہ واقعات سے خالی، سنسان اندھیرے میں پیش آتے ہیں۔ ایک مسلسل اور خاموش احساس کی طرح۔ کہیں کچھ بھی نہیں ہوتا، پھر بھی ہوتا رہتا ہے۔ کوئی چیز اندر ہی اندر، دھیرے دھیرے، اپنے دیکھتے جانتے، مرتی رہتی ہے۔ پہلے روح کی جلن جیسا کچھ، پھر خاموشی، پھر سب کچھ سُن سُن۔۔۔ رگوں میں بہتا گرم لاوا پانی کی تاثیر لے لیتا ہے، اور اپنے سے اپنا رشتہ دوٹوک ہو جاتا ہے۔ اپنی ہی نظروں میں اپنی قدر گھٹ جانے کی وہ گھڑی ٹھیک سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔۔ بھدّی، ساکت اور بدحواس۔ تب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو ہو چکا ہے وہ کیوں ہوا تھا اور اب آگے کیا ہو گا۔

میں بھول گئی تھی کہ وہ کچھ پوچھتا دروازے پر کھڑا ہے۔ میں کسی دوسرے سفر کے دور میں تھی جو اُس سے لگ کر شروع تو ہوا تھا پر اس میں اس کے لیے کچھ نہیں تھا، صرف بلندیوں پر ٹکے معنی کے حصول کے اپنے احساس کے سوا۔

"کیا کہہ رہے تھے تم؟"

"آج تھرمس میں رکھ دوں آپ کا جوس؟"

"رکھ دو۔"

میں نے دیکھا وہ جواب سن کر بھی گیا نہیں، وہیں کھڑا رہا۔

"کیوں؟"

"آپ ابھی کھانا کھالیں تو۔۔۔ مجھے کہیں جانا ہے، لوٹنے میں دیر ہو سکتی ہے۔"

"کہاں جانا ہے؟"

وہ چپ رہا، میرے اُٹھے ہوئے سوالیہ چہرے کو نظر انداز کرتا۔

"کہاں جانا ہے؟" اب تک میرے اندر ایک چالاک بزدل پنجوں کے بل کھڑا ہو چکا تھا۔

وہ پہلے تولتا سا رہا، پھر بولا۔ "ملنے جانا ہے۔۔۔ سیٹھ نے بلایا ہے۔۔۔ ساڑھے گیارہ بجے۔۔۔ پچھم پوری۔۔۔"

"کون سا سیٹھ؟"

"وہی فیکٹری والا۔ اس کے یہاں ایک ڈرائیور کی جگہ خالی ہے۔۔۔ شروع میں پانچ سو دینے کو کہتا

ہے---"

"تمہیں معلوم ہے وہاں دن رات کی چاکری---" حالاں کہ کہتے کہتے میرے اپنے لفظ میرے سامنے ہی کھوکھلے ہو گئے تھے۔ وہاں یا کہیں بھی، کوئی دن یا کوئی رات تو ہوتی ہو گی۔ یہاں تو--- پارٹیوں کے دور آئے دن چلتے ہیں، اور رات کے کبھی نہ ختم ہونے کا بوجھ چوکھٹوں پر چپکا ملتا ہے۔

"وہ سب ٹھیک ہے پر---" اس نے نرمی ہی برتی۔

پندرہ یا بیس دن پہلے یہ ذکر چھڑا تھا اور فیصلہ ہوا تھا کہ چاہے ہم نے تین سو روپے ڈبو کر اسے ڈرائیور کی ٹریننگ دلوائی ہے پر وہ ابھی کہیں بھی ڈرائیور کی نوکری نہیں ڈھونڈے گا۔ اس کی پل پل چوکنی ہوتی ہوئی حیثیت چپ چاپ ہمارے فیصلوں کا انتظار کرے گی۔ وہ فی الحال ایسا کچھ نہیں کرے گا جس سے چٹان کی نوک پر لٹکی ہماری گرہستی کا پیر پھسل جائے۔

اُدھر آنند کی فارن کی ٹریننگ ٹرپ طے ہو گئی تھی۔ ببلو پنکی کے امتحان تھے۔ میرا ناول بیچ میں کہیں لٹھڑ رہا تھا۔ یہ ذمے داری میں نہیں اٹھا سکتی تھی، اپنی یا اپنے بچوں کی بھی۔ یہ سب اسی کی مہارت اور نرمی کے ذمے تھا۔ بچوں کو اچھا شہری بنانے اور مجھے اچھا لیکھک بنا رہنے دینے کی مہم میں وہ ایک ضروری زینہ تھا۔ ہمارے خوابوں اور ارمانوں کو ہمارے قریب سے قریب تر رکھنے میں اس کا حصہ بے حد اہم تھا۔ وہ ایک ان گڑھ پتھر تھا، ہم اسے ان تمام برسوں میں سمجھانے میں کامیاب ہو چکے تھے، جسے ہم ہیرے کی سی تراش خراش دے رہے تھے، ترقی دے رہے تھے، اس کو غلامی کی چوٹی تک لے جا کر۔

"وہ بات ہم نے تمہیں سمجھا نہیں دی ایک بار؟"

ہم نے اُسے سمجھایا تھا کہ ہم اسے یہ ہنر سکھا بھی دیں گے اور سو روپے بڑھا کر اپنے ہی بے مثال گھر میں کھپا بھی لیں گے۔

اس سوال کا اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاثرات سے بس اتنا جتا دیا کہ یہ بات نہ وہ سمجھا ہے نہ سمجھنا چاہے گا۔ اس کے کھڑے ہونے کے تناؤ میں ایک روٹھی ہوئی، ضد بھری ڈھٹائی تھی۔

"ابھی جاؤ--- پھر کبھی اطمینان سے بھیج دیں گے۔"

وہیں جمے رہنا اس بات کا جواب دے گیا، بغیر بولے۔

"میں نے کہا نا پھر دیکھیں گے۔" میں گھبرائی نہیں تھی۔ مجھے بھروسا تھا کہ جو کچھ اب تک ہوا ہے اب بھی ہو سکے گا۔ وہ ٹل جائے گا کیوں کہ اب تک وہ خاصا پالتو ہو چکا ہے۔ ہم اس کی وفاداری کو ایک طرح سے خرید چکے ہیں۔ سائیکل سیکھتے وقت پیر میں آئی چوٹ میں اس کی دیکھ بھال کر کے، اس کے باپ کی بیماری میں دوادارو کے لیے پچھتر روپے کا منی آرڈر بھجوا کر۔ ہم اسے یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ اس کی ماں کو اس وقت خود اُس کی نہیں، ان پیسوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہمیں یقین تھا ہم نے اسے خرید لیا ہے، کچھ پھٹی پرانی پینٹوں اور قمیصوں کے ذریعے سفید پوشی کا رتبہ دے کر، چاہے وہ

Scanned with CamScanner

رتبہ دے سکنا ہمیں بھی ایک موچی مار کہ، نو سیکھیے درزی کی مدد سے حاصل ہو پایا ہو۔ ہمارے خیال میں اب وہ پوری طرح ہمارا ہو گیا تھا--- ہمارا پالتو--- پھر کیوں یہ---

اس کا وہ انداز--- یقیناً وہ کپڑے پر بیٹھی برف کی پھوار کی طرح نہیں تھا کہ اٹھا کر جھاڑ دیا جائے۔ آس پاس کہیں کچھ سخت جان تھا۔ اندر سے ٹھوس، میان میں چھپی تلوار کی طرح چمک دار اور چست۔

"اُس دن آپ ہی نے تو کہا تھا---" اس کی آواز ایک دم روہانسی سی ہو گئی تھی۔

"کیا کہا تھا میں نے؟" میں پتا نہیں کیوں چونک گئی، اپنے ہی بے دھیانی میں کہے لفظوں کی قید سے بچنے کے لیے چوکنی۔

"آپ نے کہا نہیں تھا کہ کسی کو بھی اپنے سے تسلی کر کے بیٹھ نہیں جانا چاہیے--- پنکی دیدی کو آپ---"

بیج جو ہم نے بکھیرے تھے ان میں اکھوے پھوٹ آئے تھے۔ شام کو بچوں سے بتیاتے وقت وہ بھی سرک کر پاس کہیں زمین پر بیٹھ جایا کرتا تھا، یا نہ بیٹھ پاتا تو کام کی رفتار ایک دم دھیمی کر دیتا--- اس کا کان دھرنا ہماری نظر میں غلط تھا، پر صحیح غلط کے بیچ ڈولتی ہماری روشن خیالی اسے جھٹک دینے میں سدا ناکام رہتی تھی۔

اُس دن تنے ہوئے تیوروں کا عادی اس کا چہرہ کچا سا پڑ گیا تھا۔ آٹ پٹے سے نقوش اور بے مطلب لمبائی۔ بیس سال کی عمر میں بھی ہنستے ہوئے بھولپن کو جتاتے اس کے موٹے ہونٹ۔ اس وقت وہ ایسے بگڑیل بچے کی تصویر لگ رہا تھا جس کی ضد تو ہوتی ہے پر اس ضد کو سہہ جانے والا کوئی گھر نہیں ہوتا۔

اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے مجھے اس کے کپڑے اچانک بے حد گندے اور ہاتھ کھردرے لگنے لگے۔

"وہ جو کپڑے سلوا کر دیے تھے، وہ کیوں نہیں پہنتا؟"

ایک عجیب قسم کی بے چینی اس کے روہانسے پن سے آ چپکی۔ اسے شاید پچھلی باتوں اور اِن باتوں میں کوئی رشتہ نظر نہیں آیا تھا۔

"گھر میں یہی ٹھیک ہیں،" اس نے اپنی سلیٹی ملیشیا کی کھردری قمیص کو ذرا نیچے کھینچتے ہوئے کہا۔ "ڈرائیونگ اسکول میں جانے کے لیے اچھی پینٹ قمیص چاہیے ہوتی ہے۔" اس کی آواز بھٹکتے ہوئے پلٹ کر پھر اپنے ٹھکانے پر لوٹ آئی تھی۔

"پنکی دیدی کو آپ---"

"کیا دیدی دیدی لگا رکھی ہے،" میں جھنجھلا گئی۔ پتا نہیں کتنی سمتوں سے آتی ہوا مجھے میرے سامنے بے لباس کر رہی تھی۔ میں کیا چاہتی تھی--- اپنا احساس، اپنے کو اپنے آگے کی سیڑھی پر رکھ سکنے

Scanned with CamScanner

کی کمزور مگر حقیقی کوشش--- میری ہی باتوں کا حوالہ دے کر--- مجھے گُومان کر--- مجھے کھکھول کر۔ کبھی میں بھی--- جب میں نے بھی آنند کے اعتراض کے باوجود اسی کی طرح ایک دن کا کنارہ پکڑ کر---

"میں صاحب سے بات کروں گی۔" پتا نہیں میں نے ٹالا تھا یا سچ مچ اندر ہی اندر نما گئی تھی۔

"نہیں، نہیں--- صاحب سے نہیں---" وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا تھا، کانپتا ہوا۔ "ان سے نہیں۔ وہ نہیں جانے دیں گے--- کبھی نہیں۔ جب تک آپ نہ کہیں---"

اس کی آنکھوں میں ایک پتیلی جھلملاہٹ اتر آئی تھی۔ "میں کیا ہمیشہ--- یہیں--- اسی طرح---"

اس نے اپنا سر دونوں ہتھیلیوں میں لے لیا تھا۔

"تو کیا نوکری چھوڑنا چاہتا ہے--- میرا مطلب ہے ایسی نوکری؟"

مجھے یقین تھا وہ ابھی "نہ" کہہ دے گا۔ ایسی عزت والی چاکری اسے کہیں اَور نہیں مل سکتی تھی جہاں "بچوں کی طرح" کا واسطہ دے کر اسے کتنی ہی کم نازک چیزوں میں حصے دار بنا لیا جاتا تھا۔

"ہاں! اگر آپ غلط نہ سمجھیں--- میں سچ کہتا ہوں، میں آپ کے سب پیسے چکا دوں گا--- ایک ایک--- جتنا بھی آپ نے میرے اوپر خرچ---"

اُس کے کندھوں پر ٹکی گرہستی کا احساس مجھے ایکا ایک بے چین کر گیا۔ پر جو جھلک مجھے سامنے دکھائی دی وہ ادھوری تھی۔ وہ کوئی کونپل نہیں تھی، ایک کھردری، ریشے دار جڑ تھی--- بہت اندر--- میں اسے جانتی ہی نہیں، پہچانتی بھی تھی۔ مٹی کے نیچے چپ چاپ بیٹھی ضرور رہتی ہے، پر مٹی سہارا نہ دے تو مٹی کے نظام کو توڑ کر پار جا نکلتی ہے۔

مجھے لگا نظام خطرے میں پڑنے لگے تو سخی ہو جانا ہی سمجھ داری ہے۔ مگر سمجھ داری کی قیمت؟ میرے سامنے گھر کی دیواریں لڑکھڑانے لگی تھیں اور اپنے ہی لفظوں سے اٹھتا، دم گھونٹتا ہوا دھواں--- میں نے ان سب کو بٹور کر، پاس بٹھا کر سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اپنا وجود اپنا ہوتا ہے۔ حالات، مقام یا کوئی اَور تام جھام اسے ہڑپ نہیں کر سکتے۔ اسے ہڑپنے والے عفریت سے اپنے قد کو دو انچ اوپر رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، نہیں تو اتنی بڑی دنیا میں اپنی کوئی حیثیت نہیں بنتی--- ذرا بھی نہیں۔ اچھا شوہر ہو تو بھی نہیں (میں نے پنکی کو خاص طور پر سمجھایا تھا)۔ اچھا گھر ہو، دھن دولت ہو تو بھی نہیں---

"حیثیت پھر الگ سے کیا ہوتی ہے؟" پنکی نے اُلجھتے ہوئے پوچھا تھا۔

زمین پر پالتی مار کر بیٹھے، سر اوپر کو اٹھائے، اُس کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھی تھیں۔

"اپنے کو لگنے لگے، کہ اپن کچھ ہیں--- کچھ کر سکتے ہیں--- ہے نا میم صاب؟"

"ہاں!" میرا دھیان پوری طرح اُس کی طرف نہیں تھا، نہیں تو اُس چمک کی جڑ کو میں نے ضرور

Scanned with CamScanner

دیکھ لیا ہوتا۔

"میں تو کب کا سمجھ گیا۔" میری باہر جاتی پیٹھ نے کھلکھلاتے غرور سے کہے گئے یہ الفاظ سنے ضرور تھے، پر سمجھے نہیں تھے۔

دیکھا جائے تو وہ کچھ غلط نہیں سمجھا تھا۔ مگر اس کا یہ سب سمجھ جانا ہی اس وقت میرے دماغ کو سُن کر گیا تھا۔ اس وقت میں زمین سے انگل بھر اونچی حیثیت کے بارے میں نہیں، گھر کے ڈانواڈول ہوتے ہوئے توازن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اپنے آدھے لکھے ناول کے بارے میں، پنکی ببلو کے امتحانوں کے بارے میں، دیوالی پر پٹنہ سے آنے والے مہمانوں کے بارے میں۔۔۔

اس نے کتنے ہلکے سے جھٹکے سے میری محنت سے حاصل کی ہوئی حیثیت کو ہلا دیا تھا۔ کیا نام اس حیثیت اور ہستی کا ہے جو دوسروں کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر چلتی ہے اور اپنے ہی بنائے سینچوں میں خود قید ہوتی ہے۔۔۔

اس کا چہرہ اب تک بجھ گیا تھا۔۔۔ کچھ کچھ مایوس اور بے جواب۔

"تُو آخر کیا چاہتا ہے؟" میری بے بسی اُس پر جھنجھلاہٹ بن کر اتری۔

وہ لمحہ بھر کو جھجکا۔ "آپ ہی بتا دیجیے نا، آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

یہ ایک طرح کا آمنا سامنا تھا۔۔ لگ بھگ غیر متوقع، داتا ہو سکنے کی سخاوت سے بھرپور۔ دیکھا جائے تو حیثیت کا سوال یہیں طے ہو گیا تھا۔ جس کی کچھ حیثیت ہوتی ہے وہی دیتا ہے، دے پاتا ہے۔ حیثیت کے کنگال سے یہ امید ہی کہیں ہوتی ہے؟

"میں چاہتی ہوں، تو تھوڑے دن اَور رک جا۔۔۔ تھوڑا ادھر سدھ جائے اور۔۔۔ اور۔۔۔ تب تک یہاں بھی۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ کوئی اَور انتظام بھی ہو جائے گا۔۔۔ نہیں؟"

اس سوالیہ "نہیں؟" کی نوک پر میری ساری حیثیت اس وقت سمٹ کر بیٹھ گئی تھی، تھرتھراتی ہوئی۔

وہ بنا کچھ کہے باہر چلا گیا، پیر پٹکتا سا۔ میرے کان اُس کے قدموں کی آہٹ کا پیچھا کر رہے تھے۔ ہاتھ کاغذ سرکا کر چپ بیٹھ گئے تھے اپنے آپ۔

لمحے بھر میں رسوئی گھر میں برتنوں کی کھٹ پٹ سنائی دینے لگی تھی۔ مجھ سے پوچھے بنا تھوڑی ہی دیر میں وہ کافی کا کپ بنا کر میری ٹیبل پر رکھ گیا تھا۔

"سنو۔۔۔ ایک دو بسکٹ دے جاؤ۔" میں نے اُس کے تیزی سے لوٹتے قدموں کی بے دلی کو سہج انداز سے کریدنا چاہا۔

بسکٹ لے کر حاضر ہوا تو میں نے اُس کا چہرہ ٹٹولنا چاہا۔ پر وہ چہرہ بند تھا، ان بُوجھا اور اُداس۔

Scanned with CamScanner

ذرا دیر میں رسوئی گھر کا فرش دُھلنے کی آواز آنے لگی، پھر جھاڑو پٹکنے کی۔ پھر کھانا بنانے لگنے کی۔ دوپہر تک وہ مجھے کافی پُرسکون دکھنے لگا، لگ بھگ گم۔

شام کو بچوں کے سیشن میں وہ زمین پر نہیں، دروازے سے لگ کر کھڑا رہا۔ کئی بار اس کے انداز سے کچھ بولنے کا ارادہ سا ظاہر ہوا مگر روز کی طرح کوئی سوال سامنے نہ آیا۔ سوال کرنے میں روز وہی زیادہ شوق دکھاتا تھا۔ کانونٹ میں پڑھے بچے تو ہمیشہ اپنے میں گم، خود پسند ملا کرتے تھے۔

مجھے لگ رہا تھا وہ کسی نہ کسی طرح گھما پھرا کر یہ بات ضرور پوچھے گا کہ وہی بات پنکی کے لیے، ببلو کے لیے، میرے لیے، ہر کسی کے لیے ضروری اور اُس کے لیے غیر ضروری کیوں ہے۔ پر---

پر یہ تو اچھا ہی تھا کہ وہ سب کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا اور سوال پوچھنے کے شوق سے پوری طرح خالی لگ رہا تھا۔

**

سودیش دیپک

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

تماشا

وہ ادھیڑ عمر آدمی بڑی دیر سے کسی سایہ دار پیڑ کی تلاش میں ہے۔ اُس کا آٹھ سال کا لڑکا بڑے تھکے تھکے قدموں سے باپ کے پیچھے چل رہا ہے۔ اُس کے گلے میں ایک چھوٹا سا ڈھول پڑا ہوا ہے جسے وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہتھیلیوں سے پیٹتا ہے۔ جب بھی کوئی پیڑ نظر آتا ہے، وہ بڑی ترستی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھتا ہے: شاید باپو اس کے نیچے ٹھہر جائے۔ لیکن نہیں، پیڑ بڑا ہے تو سایہ دار نہیں۔ اگر سایہ دار ہے تو چھوٹا ہے، مجمع لگانے لائق نہیں۔ باپ نے سر پر بڑی سی پگڑی باندھ رکھی ہے۔ اس کے لٹکتے ہوئے سرے سے وہ بار بار منھ اور گردن پونچھتا ہے۔ اُن کے پیچھے پیچھے لڑکوں کا ایک جھنڈ چلا آ رہا ہے۔ باپ بار بار پیچھا کرتے لڑکوں کو دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ کھیل تماشا دیکھنے والے یہ چھوٹے چھوٹے تماشائی ہی بھیڑ بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔

ابھی صبح کے دس ہی بجے ہیں، لیکن سورج، گرمیوں کا سورج، فوج کے کسی ہراول دستے کے سپہ سالار کی طرح اوپر چھلانگ لگا کر چڑھ آیا ہے۔ سورج چاروں طرف بڑی دیر سے تیکھی اور گرم کرنوں کی برچھیاں اور کرچیں برسا رہا ہے۔ چھوٹے لڑکے کے گلے میں پڑی ڈھول کی رسّی پسینے سے بھیگ گئی ہے اور اس کی گردن میں اور سینے میں خارش پیدا کر رہی ہے۔ اُس کے گال پچکے ہوئے ہیں اور سر کے باریک، مشین کے کٹے، چھوٹے چھوٹے بال خاردار جھاڑیوں کی طرح کھڑے ہیں۔ سورج کی بے رحم گرمی نے اُسے بھون ڈالا ہے، چھیل ڈالا ہے۔ پچھلے کئی منٹوں سے اُس نے ڈھول پر تھاپ نہیں دی ہے۔ باپ کسی جنگلی سوَر کی طرح گردن کو تھوڑا ٹیڑھا کرتا ہے اور تیکھی آواز میں کہتا ہے: "ڈھول تیرا باپ بجائے گا کیا؟"

بڑی مشینی حرکت سے لڑکا دونوں ہاتھوں سے ڈھول کو پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ سپہ سالار سورج

Scanned with CamScanner

اس چھوٹے سے نقارے کی آواز سن کر تھوڑا اور اوپر اٹھ آتا ہے، حملہ آور کی طرح، لڑکے کے چہرے کے بالکل سامنے، تیز، چمک دار اور لپلپاتے ہوئے شعلوں کی طرح۔

سامنے نیم کا ایک بڑا سا پیڑ ہے۔ اس کے آس پاس کچھ ریڑھی والے ہیں، کچھ کھوکھے اور چند پکی دکانیں۔ باپ کے قدموں کو اس طرف بڑھتا دیکھ کر لڑکے کی پتلی لکڑیوں جیسی ٹانگیں آخری بلہ مارتی ہیں اور وہ چھوٹی سی دوڑ لگا کر باپ سے آگے نکل جاتا ہے۔ پیڑ کے نیچے پہنچتے پہنچتے وہ گلے میں پڑا ڈھول اتار دیتا ہے اور پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر تیزی سے پھیپھڑوں میں ہوا بھرنے لگتا ہے۔ پیچھے آتا بچوں کا غول اب اُس کے آس پاس گھیرا ڈال کر کھڑا ہے۔ لیکن وہ کسی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ یہ تو اُن کی زندگی میں روز ہی ہوتا ہے۔ آنے والے تماشے کے سارے منظر اور ان کے کٹے ہوئے ٹکڑے لڑکے کے دل و دماغ میں پہلے ہی سے موجود ہیں، اس لیے دوسرے لڑکوں کی طرح اُسے اس تماشے کے لیے کوئی بے تابی ہے اور نہ اس میں کوئی لطف ہے۔ اب وہ اپنے ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہا ہے اور کسی ڈرے ہوئے چوہے کی طرح گردن موڑ کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ کہیں کوئی نل یا پمپ دکھائی نہیں دیتا۔ باپ کی طرف دیکھتا ہے؛ وہ بڑی سی گٹھری کو کھول رہا ہے، تماشے کا سازوسامان باہر نکالتا ہے۔ باپ سے پانی کے لیے کہے یا نہ کہے۔ پھر وہ باپ سے کچھ نہ کہنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ چولھے میں جلتی لکڑی، باپ کا اُسے کھینچ کر باہر نکالنا، اور ہوا میں اپنے بچاؤ کے لیے اُٹھے ہوئے ماں کے دونوں ہاتھ۔۔ یہ سارے کے سارے تازہ منظر اُس کے ذہن پر نقش ہیں اور اُسے خوف زدہ کر دیتے ہیں۔

باپ نے پیڑ کے نیچے سفید چادر بچھا دی ہے۔ لڑکے کی طرف اُس کی پیٹھ ہے لیکن اُسے صاف محسوس ہوتا ہے کہ دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں اُس کی پیٹھ میں سوراخ کیے ڈال رہی ہیں۔ کسی جانور کی طرح آس پاس کے ماحول کا عادی ہونے، کسی کی موجودگی کو محسوس ہونے کی صلاحیت اُس کی گردن کو لڑکے کی طرف موڑ دیتی ہے۔

"کیسے مُردوں کی طرح بیٹھا ہے۔ باپ مر گیا ہے کیا؟ ہیں؟ اٹھ! سامان چادر پر رکھ!"

اُس کی تیز آواز کو سن کر آس پاس کھڑے لڑکے سہم کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

"پانڑی پیسڑا ہے۔" (پانی پینا ہے۔)

"تو اُٹھ۔ جا کر پی لے۔ کسی ریڑھی والے سے مانگ لے۔ تیرا باپ کنواں کھُدوا دے گا؟ حرام دا بیج! ماں کی طرح نخرے کیا دکھاتا ہے؟"

لڑکا کسی مریل کتے کی طرح کمر کا سارا زور ٹانگوں پر ڈالتا ہے۔ دھیرے دھیرے چلتی کسی فلم کی طرح اُس کا جسم ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹتا ہے اور وہ پاس کھڑی کلچوں چھولوں کی ریڑھی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اُسے یاد آتا ہے کہ سال بھر پہلے پانچ روپے میں چیتے کا یہ سر بوڑھے مداری سے خریدا تھا۔ بار بار ہاتھ لگنے سے اس مُردہ سر کے بال جھڑ گئے ہیں، سوکھے ہوئے جبڑوں میں سے تیز نکیلے دانت باہر نکل آئے ہیں، آنکھوں کی جگہ نیلے بلور ہیں جو ایک مری مری بے رحمی سے اُسے گھور رہے ہیں۔ چیتے کا مرا ہوا منہ کھلا

Scanned with CamScanner

ہے۔ اُس کی نگاہ اس اندھیری وادی کی طرف اٹھ جاتی ہے اور گھر والی کا بیمار لیکن غصّے سے بھرا ہوا چہرہ غرّاتا ہے، دہاڑتا ہے اور اُس کی طرف جھپٹ پڑنے کے لیے چھلانگ لگاتا ہے۔ وہ ڈر گیا ہے، جھٹکے کے ساتھ مرے ہوئے سر کو سفید چادر کے نیچے رکھ دیتا ہے۔ چولھے میں سے کھینچی ہوئی جلتی لمبی لکڑی اور اپنے بچاؤ کے لیے اٹھتے گھر والی کے دونوں ہاتھ چیتے کے منہ سے نکل کر اُس پر حملہ کر دیتے ہیں۔

اس شہر میں آئے ہوئے اُنھیں تین دن ہو گئے ہیں۔ شہر سے باہر بڑی سڑک کے کنارے اُس نے اپنا تمبو تانا۔ چھوٹا لڑکا آس پاس گھوم کر سوکھی ٹہنیاں چُن لایا تھا۔ گھر والی چار اینٹوں کا چولھا تمبو کے باہر بنا لیتی ہے۔ وہ بیٹھا چلم پی کر تھکن اتارتا ہے۔ گھر کی کل کائنات --لوہے کا بڑا سا ٹرنک، تماشا دکھانے کا سامان اور جانوروں کے کٹے ہوئے سر-- یہ سب کچھ اٹھا کر اسے پیدل چلنا ہوتا ہے۔ اس لیے تمبو تاننے کے بعد وہ دوسرا کوئی کام نہیں کرتا۔ گھر کے تینوں افراد کا کام بٹا ہوا ہے۔

اُس کی، اُس کے لڑکے اور گھر والی کی زندگی شہر شہر پھیری لگاتے ہوئے بیتی جا رہی ہے۔

مختلف شہروں میں تین چار بار تماشا دکھانے کے بعد اُنھیں اگلے سفر پر روانہ ہوتا ہے، کیوں کہ تماشائی بہت جلد ختم ہو جاتے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں سے گھنٹوں گلا پھاڑنے کے باوجود، چھوٹے چھوٹے کرتب دکھانے کے بعد بھی، تینوں آدمیوں کا پیٹ بھرنا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ شاید تماشا دیکھنے ہی کے لیے جیب میں ایک نیا پیسا ڈال کر لاتے ہیں۔ اور پھر بھیڑ کو بھی کڑے وقت نے چالاک اور زمانہ شناس بنا ڈالا ہے۔ سانپ اور نیولے کی لڑائی کے آخری منظر کے ساتھ تماشا ختم ہونا ہوتا ہے؛ لوگ اس موقعے کے آتے ہی دھیرے دھیرے کھسکنا شروع کر دیتے ہیں۔ بچے ہوئے چند لوگ بڑی بے دلی سے چند سکّے پھینک کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ اور اگلے دن کی بھوک کا دیو اُس کی گردن کو جانگھوں کے بیچ دبوچ کر بیٹھ جاتا ہے۔ شہر شہر، بھوک اور خالی پیٹ کا سفر۔ بھوک کا یہ عفریت کسی بھی شہر میں دَم نہیں لینے دیتا، کسی گھڑسوار کی طرح لوہے کے نوک دار جوتے سے مسلسل ایڑ لگاتا رہتا ہے۔

پہلی شام گھر والی نے لوہے کا ٹرنک کھولا۔ چھوٹی سی پوٹلی باہر نکالی۔ اُسے کھولا تو صرف پاؤ بھر آٹا نکلا۔ دو دو روٹیاں اُن کے حصّے میں آئیں اور ایک لڑکے کے۔ اُس نے چار نوالوں میں روٹی ختم کر دی، ماں کو گھور کر دیکھا اور بولا:

"روٹی اَور دے!"

"بس ختم۔ اپنے حصّے کی تُو نے کھا لی۔"

"نہیں ابھی بھُکا ہوں۔ اَور کھاؤں گا۔"

"بک بک مت کر۔ سُنا نئیں؟ روٹی ختم ہے۔"

لڑکا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کوئی چیز اٹھا کر ماں کو مارنا چاہتا تھا، لیکن باپ کی گھورتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اُس نے ارادہ بدل دیا۔ وہ تمبو کے باہر آ گیا۔ اناج کی خوشبو پا کر ایک مریل سا کتا منتظر آنکھیں لیے تمبو کے ساتھ آ بیٹھا۔ لڑکا دبے پاؤں کتے کے پاس سے گزرا۔ تھوڑی دور جا کر اُس نے اینٹ

Scanned with CamScanner

کا ایک چوکور ٹکڑا تلاش کر لیا۔ ہاتھ ہوا میں لہرا کر دو بار نشانہ لگایا، پھر پوری طاقت سے اینٹ کا ٹکڑا کتے کی گردن پر دے مارا۔ پیں پیں کی آواز کے ساتھ کتا اُچھلتا ہوا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ دور جا کر بھی تمبو کی طرف منہ کر کے ماحول کو بوجھل کرتا رہا۔ لڑکے کا غصہ اور بھوک دونوں ختم ہو گئے ہیں۔ اُس کے تصور میں اِس وقت کتا نہیں، ماں ہے جس کی گردن پر روٹی نہ دینے کے جرم میں یہ عذاب جاتا ہے۔

صبح ہونے پر گھر والی نے ٹرنک کے کونے سے ایک میلا کچیلا نوٹ نکال کر اُسے دیا۔ آٹا لانے کو کہا۔ وہ شہر کی طرف چل پڑا۔ کیسے دن آ گئے ہیں! وہ چھوٹا تھا تو جمورا بن کر اپنے مداری باپ کے ساتھ جایا کرتا تھا تماشا دکھانے۔ لوگ تماشا دیکھتے تھے اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ سکے پھینکتے تھے۔ اُسے آج بھی یاد ہے، سفید چادر بکھرے ہوئے سکوں سے اَٹ جایا کرتی تھی۔ واپسی پر باپ اُسے گڑ کی بنی ریوڑیاں خرید کر دیا کرتا تھا اور خود شراب پی کر مستی کے عالم میں ایک ہاتھ کان پر رکھ کر ہیر گایا کرتا تھا۔ اور اَب؟ آٹے کے لیے پیسے پورے نہیں پڑتے، لڑکا اَور روٹی مانگتا ہے، گھر والی طعنے دیتی ہے، گالیاں دیتی ہے اور وہ اسے پیٹتا ہے۔

بازار میں پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ ساری کی ساری دکانیں خالی پڑی ہیں۔ کہیں کوئی گاہک دکھائی نہیں دیتا۔ خریدنے کے لیے لوگوں کے پاس کچھ بچتا ہی نہیں۔ اپنے میلے کپڑوں، تیل چُپڑے بالوں اور پھٹے حال ہونے کی وجہ سے اُسے ہمیشہ دکانوں میں گھسنے سے ڈر لگتا ہے۔ وہ اب تک بازار کے تین چکر کاٹ چکا ہے۔ کسی سے آٹے کی دکان کا پتا پوچھتے ہوئے ڈر رہا ہے۔ آخر ہمت کر کے ایک رکشا والے کے پاس ٹھہرتا ہے۔

"آٹا کہاں ملے گا؟"

"کیا کہا، آٹا؟ جا بھائی، اپنا راستا پکڑ! کیوں سویرے سویرے مخول کرتا ہے۔"

اُسے بڑی حیرانی ہو رہی تھی۔ آٹا خریدنے کی بات کو یہ آدمی مخول کیوں کہہ رہا ہے؟ لوگوں کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ رکشا والا بجھی ہوئی بیڑی کو پھر سے جلاتا ہے، اُس کے چہرے پر چھائی پریشانی اور بدحواسی کو دیکھتا ہے اور دانتوں سے بیڑی کا ایک سرا کاٹ کر کہتا ہے: "اس شہر میں آٹا نہیں ملتا۔" اب وہ منہ کھول کر رکشا والے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ سوچ رہا ہے، کیا زمانہ آ گیا ہے۔ غریب بھی غریب کا مذاق اڑانے لگ گیا ہے! وہ ہار مان گیا۔ سر جھکائے کھڑا ہو رہا۔ رکشا والا جھٹکے سے بیڑی سڑک کے بیچ پھینک کر کہتا ہے:

"بھائی، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اب تمہیں کسی بھی دکان پر آٹا نہیں مل سکتا۔ آٹا بیچنے اور گیہوں خریدنے کا کام اب سرکار کے ہاتھوں میں ہے۔ ہاں، اگلی گلی کے اندر مڑ جاؤ۔ سرکاری راشن کی دکان ہے۔ قسمت ہو گی تو مل جائے گا۔"

وہ اسے کوئی جواب دیے بغیر گلی کے اندر مڑ جاتا ہے۔ دکان سامنے ہی ہے، لیکن بہت لمبی لائن ہے۔ وہ بھی اس میں لگ جاتا ہے۔ لوگوں کے چہروں پر اتنی گرمی میں انتظار کرنے پر بھی کہیں غصہ یا

Scanned with CamScanner

بے چینی نہیں۔ صبر اور اطمینان تو غریب لوگوں کا گن ہی ہے۔ لگ بھگ دو گھنٹے بعد وہ دکان کی دہلیز پر پاؤں رکھ پاتا ہے۔ دکان دار اُس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہتا ہے: "کارڈ؟"

وہ چونک پڑتا ہے۔ خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ پھر روپے کا نوٹ نکال کر آگے بڑھاتا ہے۔

"اوئے پہلے کارڈ دے!"

"کارڈ؟ کارڈ؟ میرے پاس نہیں۔"

دکان دار پہلے ہی سے جھنجھلایا بیٹھا ہے۔ تیکھی آواز میں کہتا ہے: "چل ہٹ، نکل باہر! سرکاری دکان ہے سرکاری! آ جاتے ہیں منہ اٹھائے۔ پرے ہٹ، اَوروں کو آنے دے۔ یہاں آٹا واٹا نہیں ہے۔"

اُس کے پیچھے لائن میں لگے لوگ بے چین ہو رہے ہیں۔ وہ نظر گھما کر چاروں طرف مدد کے لیے دیکھتا ہے، لیکن اُس کی نظر پڑتے ہی لوگ دوسری طرف منہ پھیر لیتے ہیں، جیسے انہیں پتا ہو کہ وہ سب کوئی پاپ کر رہے ہیں۔ اور تب اُسے اپنی گھر والی اور لڑکے کے خالی پیٹ کا دھیان آیا۔ امید ٹوٹ جائے تو خوف بھی جاتا رہتا ہے۔ وہ ویسے بھی غصیلی طبیعت کا آدمی ہے۔ اب وہ سورج کی تیز گرمی، دو گھنٹے کے انتظار، سرکاری راشن کی دکان، ان سب سے بدلہ لینے پر اُتر آیا ہے۔ تماشا کرنے میں لگاتار بولنے کی وہ سے ویسے بھی اس کی آواز اونچی ہے۔ وہ ہاتھ جھٹکا کر کہتا ہے:

"نہیں دے گا؟ کیسے نہیں دے گا؟ تیرے باپ کی دکان ہے کیا؟ سالے، سرکاری دکان ہے! سرکار کس کی ہے؟ تیرے پیو دی؟ ایک روپے کا آٹا تول دے۔ نئیں تو تُو اسپتال پہنچے گا اور میں جیل۔"

دکان دار سکڑ کر پیچھے ہو گیا ہے۔ لوگ اب اس کی مدد کو بڑھ آئے ہیں۔ کسی ہمدردی کی وجہ سے نہیں، اس ڈر سے کہ کہیں جھگڑا بڑھ گیا، دکان بند ہو گئی تو اُنہیں آج راشن نہیں ملے گا۔ ملی جلی آوازیں آئیں:

"ارے بھائی، تھوڑا سا آٹا دے دو۔ ان پڑھ گنوار ہے، اسے کارڈ کا کیا پتا۔ لگتا ہے کئی دنوں کا بھوکا ہے۔ غریب کو کھانے کو نہ ملے تو تنگ آ کر دنگا کرے گا۔ جی ہاں، خون خرابا کرے گا۔۔۔"

دکان دار نے روپیا لے کر اُسے تھوڑا سا آٹا دے دیا۔ وہ دوپہر بعد گھر پہنچا۔ گھر والی نے روٹیاں بنائیں، تینوں نے چپ چاپ کھا لیں۔ اگلے دن کی بھوک کا دیو پیچھے کی طرف سے چھلانگ لگا کر پھر اُس کی گردن پر سوار ہو گیا۔ صبح اٹھ کر اُس نے مجمع لگانے کا سارا سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ لڑکا چپ لیٹا باپ کو کام کرتے دیکھ رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ ٹھنڈے چولھے کی طرف بھی دیکھ لیتا ہے۔ ماں اُس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ جاتی ہے۔ ٹرنک کے کونے سے دو کاغذ کی پُڑیاں نکالتی ہے۔ ایک میں چینی ہے اور دوسری میں تھوڑی سی چائے کی پتی۔ وہ چولھا جلا کر بغیر چینی کی چائے بناتی ہے اور پیتل کے گلاسوں میں ڈال کر

باپ بیٹے کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ باپ گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرنا شروع کر دیتا ہے۔ بیٹا گلاس کی طرف ہاتھ تک نہیں بڑھاتا۔

"اب کیا منتر پڑھ رہا ہے؟ چاے پی۔ کام پر چلنا ہے۔"

"نئیں جانڑا ہے۔ میں روٹی کھانڑی ہے۔" (نہیں جانا ہے۔ مجھے روٹی کھانی ہے۔)

"تو سدھی طرح اٹھتا ہے کہ کروں چھترول؟"

"نئیں جاتا۔ نئیں جاتا۔" اور لڑکے نے ہاتھ مار کر چاے نیچے گرا دی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر لڑکے کے گلے میں پھندا پھنسا دیا اور دوسرے ہاتھ سے اُسے بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ گھر والی نے جھپٹ کر اُسے دھکا دیا اور لڑکے کو اپنی پیٹھ کے پیچھے کر لیا۔

"کھانے کو روٹی نہیں لا سکتا اور اوپر سے قسائیوں کی طرح لڑکے کو پیٹ رہا ہے۔ اتنا ہی شیر ہے تو ڈال کہیں ڈاکا۔ کاٹ لے کسی کی گردن۔ دے دے ہم دونوں کو زہر۔"

"میں کہتا ہوں پرے ہٹ جا! میں اِس حرام کے بیج کی ساری اکڑ نکال دوں گا۔ دیکھوں کیسے نئیں جاتا کام پر۔"

"نہیں ہٹتی، نہیں ہٹتی۔ کر لے جو کرنا ہے۔"

اور پھر ہولے ہولے چیتے کے سر سے جیسے صبح کا منظر اُبھر آیا۔ جلتا چولھا، جلتی ہوئی لکڑی کو کھینچتا ہوا اُس کا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ گھر والی نے دونوں ہاتھ بچاؤ کے لیے اوپر اٹھا دیے۔ ہاتھوں کے گھیرے کو توڑ کر گھر والی کے بائیں گال پر لکڑی کا وار۔ لمبی چیخ۔ لڑکے کا چپ چاپ کام کے لیے ساتھ نکل پڑنا۔ نیم کا پیڑ، آس پاس جمع ہوتی بھیڑ اور غراتا ہوا مُردہ بھیڑیے کا سر۔

اب تک پچاس ساٹھ آدمی گھیرا ڈال کر کھڑے ہو چکے ہیں۔ اُس نے زمین میں ایک لمبی سی کیل گاڑ کر، ٹوکری میں سے نیولا نکال کر رسی سے کیل کے ساتھ باندھ دیا۔ نیولا چھوٹے سے دائرے میں گھومتا ہے، ٹھہر کر سب طرف ٹکر ٹکر دیکھتا ہے۔ آگے بیٹھے لڑکوں میں سے کوئی "شی" کی آواز کرتا ہے اور نیولا پھر چھوٹے سے دائرے میں بے تحاشا گھومنا شروع کر دیتا ہے۔ لوگ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ دوسری چھوٹی ٹوکری میں سانپ بند ہے۔ اُن کے چہروں پر خوں خوار خوشی کی جھلک دوڑ جاتی ہے۔ تو سانپ نیولے کی لڑائی دیکھنے کو ملے گی۔

لیکن تماشا شروع ہونے سے پہلے ایک سپاہی بھیڑ کو چیرتا ہوا اُس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

"چل اُٹھا یہاں سے اپنا ٹین ڈبا! سالے، باپ کی سڑک سمجھ رکھی ہے کیا؟ سارا ٹریفک روک رکھا ہے۔"

بھیڑ سے طرح طرح کی آوازیں آتی ہیں:

"اجی غریب آدمی ہے۔ چھوڑ دو۔ بچارے کو روٹی کے لیے پیسا کما لینے دو!"

پولیس والے کا مجمع لگانے سے روکنا اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ وہ بھیڑ کے شور شرابے

کے بیچ ایک روپے میں سپاہی سے سودا پٹا لیتا ہے۔ سپاہی سب سے آگے وی آئی پی کی جگہ حاصل کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔

وہ اپنی جیب سے میلا تاش نکال کر پتا چھپانے اور بتانے کا کھیل شروع کرتا ہے، لیکن لوگ اس کھیل کو دیکھنے میں کسی دل چسپی اور شوق کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ ایک موٹی آواز اُچھلتی ہے: "استاد، چھوڑ یہ چالاکیاں! تیرے سے اچھا تاش کا کھیل مَیں دکھا سکتا ہوں۔ کوئی نیا جوش پیدا کر، نیا!"

اُس کا لڑکا کبھی ڈھول پیٹ کر، کبھی سر کے بل زمین پر کھڑا ہو کر، لمبی لمبی چھلانگیں لگاتے ہوئے، بھیڑ کے لیے زیادہ تفریح کا سامان پیدا کر رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بھیڑ کے لیے ان پرانے کھیلوں میں اب کوئی کشش نہیں ہے۔ سب لوگ تھوڑا سا خون بہتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک کِیں کِیں کرتی بانسری نما آواز گونجتی ہے:

"استاد، لڑائی دکھا دے۔ دیکھ، آگ برس رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے چونچلے چھوڑ!"

وہ سانپ والی ٹوکری پر سے ڈھکن اٹھاتا ہے۔ سانپ پھر بھی ہلتا نہیں۔ وہ لمبی سی چھڑی کا ٹھوکا مار کر سانپ کو ہلاتا ہے۔ سانپ دھیرے دھیرے رینگ کر ٹوکری سے باہر آ گیا ہے۔ وہ آواز لگاتا ہے:

"مائی باپ، اب میں آپ لوگوں کو سانپ نیولے کی لڑائی دکھاتا ہوں! مائی باپ، بھوک سب کچھ کرنا سکھا دیتی ہے۔ مائی باپ، دیکھنا دونوں کیسے ایک دوسرے کو نگلیں گے۔ مائی باپ، بولو ایک بار سب مل کر۔۔ جے شنکر کی!"

بھیڑ نے ایک آواز میں جواب دیا: "جے شنکر کی!"

سانپ نیولے کے پاس جانے سے گھبرا رہا ہے۔ نیولا اُچھ اُچھل کر رسّی تڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ آواز اُبھرتی ہے:

"سالا ڈرتا ہے!"

"اجی جان کس کو پیاری نہیں ہوتی!"

"ارے بھائی، سانپ کو ذرا آگے کھسکاؤ نا!"

وہ چھڑی سے سانپ کو اَور آگے کرتا ہے۔ اس وقت اُسے بڑی پھُرتی سے کام لینا ہے۔ نیولے کا منھ سانپ پر پڑتے ہی ان دونوں کو الگ کر دینا ہے۔ ورنہ نیولا سانپ کو مار ڈالے گا، اور نیا سانپ خریدنے کے پیسے اس کے پاس نہیں ہیں۔ نیولے نے چھوٹا سا منھ کھول کر سانپ کی دُم میں دانت گڑو دیے ہیں۔ سانپ تڑپ رہا ہے۔ وہ نیولے کی پیٹھ پر چھڑی مار کر دونوں کو الگ کر دیتا ہے۔

بھیڑ غصّے میں شور مچاتی ہے: "یہ چالاکی ہے! ابھی ان کی لڑائی شروع نہیں ہوئی۔ سانپ کو پھر سے نیولے کے پاس چھوڑو!"

"ہمارا پیسا کوئی حرام کا نہیں!"

"استاد، پوری لڑائی ہونے دو۔ میں ایک روپیا دوں گا۔"

اُس نے ہوا میں اونچا اٹھا ہاتھ اور ہاتھ میں پکڑا نوٹ دیکھ لیا ہے۔ وہ بھیڑ کے مُوڈ کو سمجھ رہا ہے۔ یہ لوگ پیسا اتنی آسانی سے دینے والے نہیں۔ اس نے سانپ کو نیولے کے پاس پٹک دیا۔ اِس بار نیولے نے پہلے ہی جھٹکے میں سانپ کا منہ پکڑ لیا ہے۔ خون کی چھوٹی چھوٹی بوندیں سانپ کے جسم پر چمک اٹھی ہیں۔ سانپ تڑپ رہا ہے۔

نیولا لگاتار ایک دائرے میں دوڑ رہا ہے۔ وہ سانپ کو چُھڑانے کے لیے نیولے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ بھیڑ جوش میں آ گئی ہے۔

"مزہ آ گیا!"

"نیولا سالا غضب کا ہے!"

"دیکھو کیسے سانپ کی گردن پکڑ رکھی ہے!"

"استاد چھڑا دو، نہیں تو سانپ گیا تمہارا!"

اُس نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ نیولے کی گردن پر چھڑی ماری، لیکن انہیں لمحوں میں نیولا تھوڑا آگے نکل چکا ہے۔ چھڑی زور سے نیولے کی کمر پر پڑی ہے۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ نیولا تین چار بار تڑپا اور پھر ہلنا بند ہو گیا۔ مرنے کے بعد اُس کے دانت اور زور سے سانپ کی گردن پر کس گئے ہیں۔ اب سانپ نے بھی تڑپنا بند کر دیا ہے۔ جو ہاتھ ایک روپے کے نوٹ کے ساتھ ہوا میں ہل رہا تھا، اب بھیڑ سے غائب ہو چکا ہے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نیچے بیٹھ گیا ہے۔ بھیڑ نے تھوڑے سے سکّے چادر پر پھینک دیے ہیں۔ اُس کی نگاہ سپاہی پر پڑتی ہے۔ سپاہی کی آنکھیں چادر پر پڑی ریزگاری کو گن کر ایک روپے کے نوٹ میں بدل رہی ہیں۔ وہ اندازہ لگا لیتا ہے۔ اس کے حصّے میں سپاہی کو پیسے دینے کے بعد رات کا آٹا شاید ہی پڑے۔

"خبردار، کوئی ماں کا لال اپنی جگہ سے نہ ہلے! ماں کالی کی قسم ہے، ابھی اصلی کھیل باقی ہے!"

وہ اپنی کمر میں کھونسا ہوا چاقو باہر نکال لیتا ہے۔ سورج کی روشنی میں چار انچ لمبا لوہا چمک اٹھتا ہے۔ وہ اپنی قمیص اُتار دیتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ اُس کا پیٹ کسی خالی گھڑے کی طرح گڑگڑ کی آواز کے ساتھ بج رہا ہے۔

"مائی باپ، پیٹ کا سوال ہے! اب میں اپنے لڑکے، اپنے جگر کے ٹکڑے کے پیٹ میں چاقو گھونپ دوں گا۔ مائی باپ، کوئی اپنی جگہ سے مت ہلنا! مائی باپ، میرے لڑکے کی زندگی کا سوال ہے۔ آپ ہلے تو وہ مر جائے گا۔ میں منتر سے ماں کالی کو ثابت کروں گا۔ آپ دیکھیں گے۔ لڑکے کے پیٹ سے خون کے فوارے نکلیں گے۔ لیکن کالی کی کرپا سے وہ مرے گا نہیں۔ کوئی نہ ہلے، نہیں تو میرے لڑکے کا خون اس کی گردن پہ ہو گا۔"

اب بھیڑ ڈر گئی ہے۔ وہ "جے ماتا کی، جے ماتا کی" کرتا ہوا گول دائرے میں دوڑ رہا ہے۔

"لڑکا کہاں گیا؟ لڑکا کہاں گیا؟"

Scanned with CamScanner

اب بھیڑ دھیان دیتی ہے کہ اُس کا لڑکا وہاں سے کھسک گیا ہے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ لڑکا اس وقت ایک چھوٹی سی نلکی میں لال پانی بھر رہا ہے۔ پھر وہ اس لال پانی سے بھرے ہوئے غبارے کو پیٹ کے ساتھ باندھ لے گا۔ وہ چاقو کا ترچھا وار کرے گا۔ چاقو لال پانی سے بھرے غبارے میں کھُب جائے گا۔ لوگ لال پانی کو خون سمجھ لیں گے۔ لڑکا ہمیشہ اس موقعے پر غائب ہو جاتا ہے۔ بھیڑ کے تناؤ اور خوف کو ٹوٹنے کی حد تک بڑھا دیتا ہے۔

لڑکا بھیڑ میں سے راستا بنا کر دائرے کے اندر آ گیا ہے۔ وہ لال رنگ کی قلفی چُوس رہا ہے۔ چادر سے کچھ پیسے چپکے سے اٹھا کر قلفی خرید لایا ہے۔

لڑکا باپ کے ہاتھ میں چمکتا چاقو دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ باپ اُس کی طرف جھپٹتا ہے۔ لڑکا چیختا ہے۔ باپ خوش ہو رہا ہے۔ آج لڑکا پورے دل کے ساتھ کھیل میں حصّہ لے رہا ہے۔ خوب پیسے آئیں گے۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ہے۔ لڑکا اب بھی چیخ رہا ہے۔ بھاگ رہا ہے۔

"جے کالی ماتا کی! مائی باپ، جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ مائی باپ، پیٹ کا سوال ہے، پاپی پیٹ کا! ورنہ کون باپ اپنے بیٹے کو چاقو سے پھاڑے گا۔"

اب وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے پیٹ کو پیٹتا ہوا لڑکے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ چادر پر پیسے گرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ آوازیں آتی ہیں، ڈری ہوئی اور دہشت زدہ سی:

"ارے چھوڑ دو، مت مارو! دیکھو بچارا کیسے چیخ رہا ہے۔"

لیکن پیسے گرتے دیکھ کر جوش اَور بڑھ گیا ہے۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے لوگ پیسے پھینک رہے ہیں، ختم ہونے پر کم سے کم دس روپے تو ملیں گے۔

اب اُس نے ایک لمبی چھلانگ لگا کر لڑکے کو گردن سے پکڑ لیا ہے۔ دھکا دے کر اُسے زمین پر گرا دیا ہے۔ وہ لڑکے کی چھاتی کو گھٹنوں سے دبا کر اس پر سوار ہو گیا ہے۔ لڑکا کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بیں بیں کر رہا ہے، تڑپ رہا ہے۔ اس کے ہاتھوں سے قلفی چھُوٹ کر دور جا گری ہے۔ وہ چیخ مارتا ہے:

"باپو مت مار، باپو چھوڑ دے!"

اُس کا ہاتھ ہوا میں اوپر اٹھتا ہے۔ چاقو سورج کی روشنی میں چمکتا ہے اور ترچھا ہو کر لڑکے کے پیٹ کی طرف بالکل پسلیوں کے نیچے جگر والی جگہ میں گھُس جاتا ہے۔

پہلے لال رنگ کی کچھ بوندیں چاقو لگنے سے پھٹی ہوئی قمیص پر اُبھرتی ہیں۔ پھر یہ بوندیں ایک پتلی دھار میں بدل جاتی ہیں۔ لڑکا چھٹپٹا رہا ہے۔ سفید چادر پر سکّے گر رہے ہیں۔

اب پتلی دھار ایک چھوٹے سے فوّارے کی طرح باہر اُچھلتی ہے۔ وہ چاقو باہر کھینچتا ہے۔ زور کیوں لگ رہا ہے؟ ربڑ کے غبارے سے تو چاقو بغیر زور لگائے باہر نکل آتا ہے۔ لڑکے کے جسم سے زور زور کی چیخیں اُبھر رہی ہیں۔

Scanned with CamScanner

"باپو مر گیا!"

وہ لڑکے کی قمیص اٹھا کر دیکھتا ہے۔ لیکن وہ ربڑ کا غبارہ بندھا ہوا نہیں ہے۔ لڑکا قلفی کھانے بھیڑ سے باہر گیا تھا۔ وہ لال پانی سے بھرا غبارہ پیٹ پر باندھنا بھول گیا ہے۔ وہ اُچھل کر لڑکے کی چھاتی پر سے اتر آیا ہے۔ لڑکے کا جسم کسی گردن کٹے جانور کی طرح زمین پر اُچھل رہا ہے۔

"مائی باپ، پیٹ کا سوال ہے۔ پاپی پیٹ کا! میں نے لڑکے کا خون کر دیا ہے!"

بھیڑ نے لڑکے کے پیٹ کے گھاؤ سے نکلتے اصلی خون کو دیکھ لیا ہے۔ لوگ تیزی سے وہاں سے بھاگ رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی سب سے پہلے وہاں سے غائب ہوا ہے۔

لڑکے کا جسم تڑپ کر اُچھل رہا ہے۔ اب وہ چیتے کی مُردہ کھوپڑی سے ٹکرا گیا ہے۔ کھوپڑی اینٹ پر سے نیچے زمین پر گر گئی ہے۔ چیتے کے لمبے نکیلے دانت خون سے سَن گئے ہیں۔ سورج خون دیکھ کر جلدی سے نیم کے پیچھے دبک گیا ہے۔

چیتے کا مرا ہوا سر منہ کھولے زمین پر پڑا ہے۔ اب لڑکے کا جسم رہ رہ کر تڑپ رہا ہے۔ پھر ایک لمبی چیخ کے ساتھ وہ ہمیشہ بند کر دیتا ہے۔ خون کا چھوٹا سا، سست سا دریا دھرتی پر دھیرے دھیرے پھیل رہا ہے۔

وہ مرے ہوئے چیتے کی کھوپڑی کے منہ میں جھانکتا ہے۔ اُس کی گھر والی اپنے بچاؤ کے لیے دونوں ہاتھ اوپر کیے کھڑی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں چولھے سے باہر کھینچی ہوئی جلتی لکڑی ہے۔ اور اسی کے ساتھ دوسرا منظر جُڑ جاتا ہے۔ چمک دار چاقو ہوا میں اٹھائے اُس کا ہاتھ، لڑکے کے جگر میں گھُستا چاقو، ایک لمبی چیخ، اور آس پاس دھیرے دھیرے پھیلتا جاتا خون کا دریا۔

**

گووِند مِشر

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

پھانس

رات بہت نہیں ہوئی تھی۔ پُوس کی اندھیاری گاؤں کے اوپر اُتر آئی تھی، نچلی تہہ میں جمے ہوئے دھویں کی نیلی نیلی چادر۔ آج رام پورا کی بازار تھی۔ آج کے روز اس گاؤں اور آس پاس کے دوسرے گاؤوں کے لوگ ہفتے بھر کی خرید و فروخت کے لیے رام پورا نکل جاتے اور پھر سانجھ ہوتے ہوتے گاؤں لوٹتے تھے، پیدل، سائیکل یا بیل گاڑی پر۔

وہ دو تھے۔ کڑک، پُھرتیلے جوان۔ اندر شائیں شائیں کرتا تناؤ، بے چینی جسے انھوں نے ایسے باندھ لیا تھا جیسے پھَر پھَر کرتے کُرتے کو باندھ لیتے ہیں، ایک دم کسَ کے۔ وہ دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔ پھر سَدھے ہوئے ہاتھوں سے باہر کی زنجیر کھٹکھٹائی اور اندر کی طرف کان لگا لیے۔ ان کا اندازہ صحیح تھا۔ گھر میں صرف پلٹو اور اس کی ماں تھی۔ پلٹو کی ماں کی آواز گھر کے اندر کے کسی کونے سے اٹھی اور ان تک بڑھتی ہوئی سنائی دی۔

"متائی باپ نے کچھ نام نائیں رکھو کا، جو بتاوت نائیں بنّت۔۔۔" (ماں باپ نے کوئی نام نہیں رکھا کیا جو بتاتے نہیں بن رہا ہے؟) پلٹو کی ماں بھنبھنا رہی تھی۔

"بھوجی، ہم ہیں جگو۔ پلٹو کے ددّا ہاٹ (بازار) میں ملے تھے۔ بولے گھر پہنچو، وہ پیچھے پیچھے آتے ہیں۔ کچھ ضروری بات کرنا ہے ان سے۔"

پلٹو کی ماں جب ایک دم دروازے تک آ گئی تب انھوں نے اطمینان دلانے کے لیے کہا۔ پلٹو کی ماں نے کواڑ کھول دیے اور اندر جا کر ان کے لیے دالان میں کھڑی کھٹیا ڈال دی۔ پھر انھیں بیٹھتے دیکھتی رہی۔

Scanned with CamScanner

"کائے بھیا، کہاں کے آؤ؟ پہلے کبھوں نائیں دیکھو؟" (کیوں بھیا، کہاں کے ہو؟ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔)

"ہم دونوں شہر میں رہتے ہیں۔"

بہت جھوٹ نہیں تھا۔ وہ کام کی تلاش میں بھاگ کر شہر پہنچے ہوئے لڑکے تھے۔ کام تو شہر نے دیا نہیں، سنیما وغیرہ دکھا کر تھوڑی تیزی ضرور ہاتھوں میں تھما دی جس کے سہارے وہ خواب دیکھ سکتے تھے۔ اس صدی کا خواب، رئیس بننے کا۔ البتہ پکے شہرا تو گھاگ وہ اب بھی نہیں بن پائے تھے۔

"شہری بھیا ہو! اب بھیا پہلے تو پینٹ پتلون والے الگ جنچ جات تھے، اب تو جئیں دیکھو پینٹ ڈانٹے پھرت رہت۔۔۔ اچھا بھیا، تم لوگ بیٹھو، ہماؤ تو چولھو برت۔۔۔" (شہری ہو۔ پہلے تو پینٹ وغیرہ پہننے والے الگ پہچان لیے جاتے تھے، اب تو جسے دیکھو پینٹ پہنے گھومتا ہے۔ اچھا بھیا، تم لوگ بیٹھو، ہمارا چولھا جل رہا ہے۔)

پلٹو کی ماں کے رسوئی گھر میں گھستے ہی وہ چُپ ہو گئے۔ اس نے اپنے ساتھی کو فٹافٹ اشارہ کیا۔ وہ "بڑی ٹھنڈ ہے، بڑی ٹھنڈ ہے" کرتا ہوا گیا اور باہر کے دروازے کی زنجیر اندر سے چڑھا آیا۔ پھر نظروں کو تیزی سے اِدھر اُدھر دوڑانے لگا۔ یہ اپنا مورچا سنبھالنے رسوئی گھر کی دہلیز پر پہنچ گیا۔

"بھوجی، گرسی (انگیٹھی) کہاں ہے؟ تھوڑا تاپ لیتے۔ بہت جاڑا ہے۔ تم بس بتا دو، ہم اٹھا لیں گے اور سلگا بھی لیں گے۔"

"کھٹیا کے پاس دھری۔ اتی کیڈا دھرے۔ آگی کھدوا کے دیکھو نائیں تو اتے لے آؤ، ایک دو انگارے ہم دھر دیہی۔" (کھٹیا کے پاس رکھی ہے۔ وہیں اُپلے بھی رکھے ہیں۔ آگ کرید کر دیکھو، نہیں تو اِدھر لے آؤ، ایک دو انگارے ہم دے دیں گے۔)

وہ دوڑ دوڑ کر پہلے انگیٹھی، پھر دو چار اُپلے رسوئی کی دہلیز پر لے آیا اور پھر وہیں بیٹھ کر اپلے توڑ توڑ کر انگیٹھی پر رکھنے لگا۔ راکھ کے نیچے چھپی آگ تھی، اپلے کے ٹکڑوں کو پکڑتے ہی دھواں چھوڑنے لگی۔ رسوئی اور آنگن کے بیچ دھویں کا ایک پردہ سا کھنچنے لگا۔ وہ بیٹھا بھی اس طرح کہ لگے کہ اُس کا ساتھی بھی دوسری طرف بیٹھا تاپ رہا ہے، جب کہ دراصل اُس بھائی کی پکڑ میں اب تک اندر کی کوٹھریاں آ چکی تھیں اور وہ پٹھا اندر داخل ہو چکا تھا۔

"اب بازار میں وہ رونق نہیں جو پہلے تھی،" اس نے پنڈلیوں کو ہتھیلی سے سہلاتے ہوئے کہا، جیسے اُنھیں آگ کی سینک دے رہا ہو۔

"اب بھیا مانگائی تو ای تراں کی ہوئے گئی کہ مڑئیں کا کھائے، کا پیے اور کا پہرے۔ ہمار دداہرن کے دن میں ایسی ہتو کہ دوئی چار سال ماہیاں بچھون کی نئی جوڑی پوترا بے بندھی جرور سے دکھائے۔۔۔" (اب بھیا، مہنگائی تو اتنی ہے کہ آدمی کیا کھائے، کیا پیے اور کیا پہنے۔ ہمارے دادا ہرن کے دنوں میں تو ایسا تھا کہ دو چار سال بعد ایک نئی بیلوں کی جوڑی چبوترے پر ضرور بندھی ہوتی تھی۔)

Scanned with CamScanner

اُس نے چابی بھر دی تھی اور اب پلٹو کی ماں چلی جا رہی تھی پٹری پر۔ وہ ایسا ظاہر کر رہا تھا جیسے اسے تاپنے کے سوا دنیا میں دوسرا کام ہی نہ ہو۔ پلٹو کی ماں اپنا کام کرتی جاتی اور بولتی جاتی تھی۔ بیچ بیچ میں چولھے کے سامنے بیٹھے روٹی کھاتے پلٹو سے بھی باتیں کرتی جا رہی تھی۔

چولھے کے اندر پتلی لکڑیاں چٹر چٹر جل رہی تھیں۔ گرم راکھ کے ذرّے ادھر اُدھر اڑتے ہوئے انگیٹھی پر جمع ہو رہے تھے۔ اُپلے سلگ چکے تھے۔ کٹے ہوئے اپلے کے حصّے سے آنچ کی ایک لَو کبھی اٹھتی، پھر گم ہو جاتی۔ وقت رینگ رہا تھا۔ یہی وقت ہے گاؤں میں۔ شہر ہوتا تو پتا ہی نہ چلتا۔ یہاں وقت کم بخت ماتھے پر چڑھ جاتا ہے اور پھر وہیں جم کر بیٹھ جاتا ہے۔ پلٹو کی ماں کب تک ایسے بولتی رہے گی۔ اس سے بات کرتے چلے جانے کے لیے بھی باتیں چاہیے تھیں۔ وہ کہاں تھیں اس کے پاس؟

"بھوجی، تم کس گاؤں کی ہو؟" پلٹو کی ماں کے تھمتے ہی اس نے سوال ٹھوک دیا۔

"بِرورا۔ او تم بھیّا؟"

"میں۔۔۔ میں بھی برورا کا ہوں۔"

"اے۔۔۔ تب تو تم سچّوں بھیّا لگت ہو۔ پہلیں بتا دیتے۔ اور دیکھو اب ہم آئیں تمائی ججی اور تم بھوجی بھوجی لگائے رہے ہو۔ پلٹو دیکھو کو آئے بیٹھیں، تمائے ممّاں۔" (ارے، تب تو تم واقعی بھائی لگتے ہو۔ پہلے بتا دیتے۔ اور دیکھو، ہم ہیں تمھاری بہن اور تم بھوجی بھوجی لگاتے رہے ہو۔ پلٹو دیکھو، کون آئے بیٹھے ہیں، تمھارے ماموں۔)

اس نے ہلکی سی پھریری اپنے اندر اٹھتی محسوس کی، لیکن وہ جانتا تھا کہ ان گاؤوں میں تو ہر کوئی ہر کسی کا ماما، چاچا، موسی، کاکی یا کاکا ہے۔ یہاں تک کہ ہری جن (اچھوت) بھی ایسے ہی رشتوں سے پکارے جاتے ہیں۔ اس گاؤں کی لڑکی دوسرے گاؤں میں گئی ہو تو یہاں کے بڑے بوڑھے اُس گاؤں کے کنویں کا پانی تک نہیں پیتے۔ پورا گاؤں ہی لڑکے کا گھر ہو گیا۔ اُسے یہ سب ناٹک بازی لگتا ہے۔ جن ہریجنوں کو ماما موسی کہتے ہیں اُن کے ساتھ بیٹھ کر بھوجن تو کرے کوئی!

"تو بھیّا برورا میں کی لے گھر کے آؤ؟" (تو بھیّا، برورا میں کس کے گھر کے ہو؟)

جیسے گائے نے یکایک لات ماری اور اسے کھُر آ لگا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ جھٹکے میں کہہ گیا تھا، لیکن یہ تو مصیبت میں پھنسنے والی بات ہو گئی۔ اس نے سنبھالنے کی کوشش کی۔

"اب یہ مجھے کیا معلوم؟ ہمارے پردادا گاؤں چھوڑ کر کان پور چلے آئے تھے۔ پھر پشت در پشت ہم سنتے چلے آئے کہ اصل میں ہم برورا ہی کے ہیں۔"

"تو کا بھائی، اب ہم کنوں کے کنوں چلے جا بسیں پے کہیں تو برورا کیئں۔ ججی کہو ہمیں۔ اور ہم ٹاٹھی پُرسیں دیت۔ جنے جنیں لیو۔ سارے میں بھیّا کا کھواوے کو سکھ روج روج ملت کا؟" (تو کیا ہوا بھائی، اب ہم کہیں سے کہیں جا بسیں، پر کہلائیں گے تو برورا ہی کے۔ بہن کہو ہمیں۔ ہم تمھارے لیے کھانا لگا رہے ہیں۔ خوب پیٹ بھر کر کھاؤ۔ سسرال میں بھائی کو کھلانے کا سکھ روز روز تھوڑا ہی ملتا ہے۔)

Scanned with CamScanner

خالی پن کا ایک چھوٹا سا گولا اس کے گلے میں اترا اور پھر کھنچتا ہوا نلی میں کہیں نیچے دھنستا چلا گیا۔ یکایک اُس کی بولتی بند ہو گئی تھی۔ باتیں بنانا اُسے بھی خاصا آتا تھا، لیکن یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں جتنا بولے گا پھنستا چلا جائے گا۔ پلٹو کی ماں کی چکنی چپڑی باتوں میں کچھ تھا جو مکڑی کے جالے کی طرح باریک سا کچھ اس کے چاروں طرف بُنتا چلا جاتا تھا۔ اسے اس مایاجال سے دور رہنا چاہیے۔ فٹافٹ کام کیا اور سرر سے باہر۔ پلٹو کی ماں کو وہ اب بھی ایسے جتا رہا تھا جیسے بہت اطمینان میں ہو، لیکن اندر خوف کی ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھی کو اب تک نکل جانا چاہیے تھا مگر وہ اب بھی کوٹھری میں گھسا ہوا نہ جانے کیا سُڑسُڑ کیے جا رہا تھا۔ باہر گلی سے جوتوں کی چُرمراہٹ اور باتوں کے گچھے رہ رہ کر اٹھتے تھے۔ ایسے میں اس کی بے چینی اَور بھی بڑھ جاتی۔ لوگ باٹ سے لوٹ رہے تھے۔ پلٹو کا دادا کبھی بھی آسکتا تھا۔ کوئی دوسرا ملنے والا بھی دھمک سکتا تھا۔

"تو کائے بھینا، پرسیں ٹاٹھی؟" (کیوں بھینا، کھانا لگائیں؟)

"ارے جیجی، اتنی جلدی کیا ہے؟"

"کائے کا جیجا کے سنگ بیٹھو کھابے کا؟" (تو کیا اپنے بہنوئی کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ گے؟)

"ہاں۔"

"ان کو بھروسے نہ کرو۔ کھو تو بالیوں آئے جائیں اور کھو تو ادھ رتا تک نہ آئیں۔" (ان کا انتظار مت کرو۔ ہو سکتا ہے ابھی آجائیں اور ہو سکتا ہے آدھی رات تک نہ آئیں۔)

"بات یہ ہے کہ باٹ ہی میں ہم پیٹ بھر کے کھا آئے تھے۔"

اس نے بات کو ایسے ختم کیا جیسے چاقو سے کسی جنگلی لتر (بیل) کو چھانٹ رہا ہو۔ پلٹو کی ماں کی ضد اس پر جھنجھنی بن کر چڑھ رہی تھی۔ تب اسے اپنے ساتھی سے جلن محسوس ہوئی۔ کم بخت کوٹھری میں کتنا محفوظ تھا، اور اسے یہ جھیلنے کے لیے یہاں رکنا پڑا۔ پلٹو کی ماں نے جواب میں کیا کہا یہ اس نے نہیں سنا، پر یہ ضرور دیکھا کہ اس نے چولھے سے لکڑیاں نکال لی تھیں اور ان پر پانی چھڑک رہی تھی۔ بھاپ اور دھواں دونوں مل کر اوپر اٹھ رہے تھے۔ پلٹو کھانا ختم کر چکا تھا۔

وہ زور سے کھانسا، اپنے ساتھی کو جلدی کا اشارہ دینے کے خیال سے۔ پلٹو کی ماں اب کسی بھی لمحے رسوئی سے باہر آسکتی تھی۔ جوں ہی وہ باہر آنے کو ہوئی، یہ لپک کر رسوئی کے کواڑ بند کر دے گا اور باہر سے کنڈی چڑھا دے گا۔ پلٹو کی ماں چلائے گی ضرور۔ اس کا چلانا پڑوسی سن لیں، اس سے پہلے ہی انھیں بھاگ لینا ہو گا۔ اگر پلٹو کی ماں باہر آگئی اور اس نے اصلی رنگ دیکھ لیا تو پھر خیر نہیں۔ یہاں کی عورتیں خاصی خونخوار ہیں۔ پریم بھی کرتی ہیں پر سنا ہے رات کے اندھیرے میں اکیلے ڈنڈا لیے چور کو کھدیڑنے بھی دوڑ پڑتی ہیں۔

پلٹو کی ماں نے برتن ایک طرف سمیٹ دیے اور جوٹھے برتن دوسری طرف سرکا دیے۔ پھر پلٹو کو کمر پر لادا اور دوسرے ہاتھ میں لالٹین اٹھا کر باہر کی طرف آنے لگی۔ یہی موقع تھا، جھپٹ کر اندر ہی

Scanned with CamScanner

دبوچ لے، ماں بیٹے دونوں کا منہ توپ دے۔ باندھ دے اور پھر رسوئی گھر کی کنڈی باہر سے مار دے۔ چھٹی۔ اگر انہیں تھوڑا وقت اور چاہیے ہو گا تو وہ بھی مل جائے گا۔ لیکن وہ بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ وہ اندر سے کچھ پست ہو گیا تھا، جیسے یہ سب وہ پلٹو کی ماں کے ساتھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس عورت میں کچھ تھا کہ کسی طرح کی زبردستی کرنے کا خیال پنپ ہی نہیں پا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگ جاتا تھا اور سوچتے ہی سوچتے اس کا خون ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ اسے لگا وہ اپنے ساتھی کے ساتھ دغا کر رہا ہے، اسے پریشانی میں ڈال دے گا۔ پلٹو کی ماں کو گھیرے رہنے کی ذمے داری اس کی تھی۔ کیا وہ اسے مستعدی سے نبھا رہا تھا؟ پر اس کا ساتھی بھی تو سالا کب سے گھس گھس کیے جا رہا تھا، یہ نہیں کہ تڑاق پڑاق۔۔۔ اس کا جی چاہا وہ بڑبڑائے، غصہ کرے۔ غصہ کچھ اس صورتِ حال پر تھا اور کچھ اپنی لاچاری پر۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ اور کچھ نہیں تو پلٹو کی ماں کو ویسے ہی گھیرے رہے، جو اب تک کر رہا ہے۔

پلٹو کی ماں دالان میں پہنچ گئی تھی۔ انگیٹھی اٹھائے وہ بھی پہنچا، پیچھے پیچھے، تقریباً دوڑتا ہوا۔

"آؤ جیجی، ہاتھ پاؤں سینکیں۔"

"وہ دوسرے بھیا کاں گئے؟"

"اسے سورتی (تمباکو) کی طلب ہو رہی تھی۔ وہ لینے گیا ہے۔"

"ہارے۔۔۔ مورے بھیا، جابے کے پہلاں کچھو بتاتے تو۔ گھرئی من سورتی دھری۔ پلٹو کے ددا کا نائیں دیکھو دن بھر پھانکت رہت۔" (واہ رے میرے بھیا، جانے سے پہلے بتاتے تو کچھ۔ تمباکو تو گھر ہی میں رکھی ہے۔ پلٹو کے دادا کو نہیں دیکھا، دن بھر پھانکا کرتے ہیں۔)

پلٹو کی ماں نے لالٹین نیچے رکھی، پلٹو کو نیچے اتار کر انگیٹھی کے پاس بٹھا دیا، پر خود نہیں بیٹھی۔ لالٹین اٹھائی اور رسوئی کی طرف بڑھ گئی۔

"کلوئی بلیا لسی ہے۔ تنا آنکھ بچی نائیں کہ پٹ سے مہرانی جوں بھیتر سرک گئیں اور پھر کھانے نائیں اتے پے ہاتھ مارنے۔۔۔" (ایک کالی بلی لیٹی ہے۔ ذرا آنکھ بچی تو یہ مہارانی جھٹ سے اندر گھس جائے گی۔ کھانا کھائے گی کیا برباد کرے گی۔)

بڑبڑاتی ہوئی وہ رسوئی کے اندر کونا کونا ٹٹول رہی تھی۔ پتا نہیں کالی بلی کس کونے میں دبکی بیٹھی ہو، کس برتن کے پیچھے چھپی ہو۔ آخری موقع تھا۔ رسوئی میں گھس کر پلٹو کی ماں کو باندھ دے، پھر پلٹو کو یہیں دالان میں۔ وہ روئے گا، بچے کے لیے عورت باگھن (شیرنی) ہو جائے گی۔ پھر سوچنا۔۔۔ وہ اتنا کب سے سوچنے لگ گیا؟

تب ہی اس کا ساتھی مریل چال چلتا ہوا آیا اور اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ کوٹھری کے باہر ہونے والی ایک ایک بات اُس کے کانوں میں گری تھی، بالے سے ٹپکتی تیل کی بوند کی طرح۔ اس نے اب دونوں ہاتھ نکال کر انگیٹھی کی آگ کے سامنے کر دیے تھے، قریب قریب "ہینڈز اَپ" کے انداز میں۔

"کیوں بے؟" وہ زور لگا کر پھسپھسایا۔ اس کا ساتھی کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے پر باسی باسی ٹھنڈ

تھی۔

"کچھ نہیں؟"

اس نے پھر کریدا۔ اس پر ساتھی کی آنکھیں اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ چہرے پر بے چارگی سی پھیل گئی۔ بولنے کے بجائے منہ میں جمع ہو آئے پانی کو کھنکھنے لگا۔

دونوں ریشہ ریشہ بکھر گئے تھے۔ کیا ہو گیا تھا، یہی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ انھوں نے جو طریقہ اپنایا تھا وہ شہر میں چاہے گھس چکا ہو۔۔ لوگ کواڑ میں لگی آنکھ میں سے دیکھتے اور دروازہ ہی نہ کھولتے۔۔ لیکن یہاں کے لیے وہ اب بھی نیا تھا۔ کامیابی کی پوری امید تھی۔ پر وہ ایک دم نئی قسم کی مصیبت میں آ پھنسے۔ کہیں کوئی ایسی رکاوٹ نہیں جو دکھائی دے اور جسے الگ کر دیا جائے۔ نظر نہ آنے والا سا کوئی منظر تھا جو دھیرے دھیرے عجیب ہیبت ناک طریقے سے پھیلتا اور انھیں اندر تک چیرتا چلا گیا۔

"جیجی۔۔۔ اب ہم چلیں گے،" پلٹو کی ماں کے آتے ہی اس نے کہا۔

"کائے تک گئے؟"

"ہاں یہی سمجھو۔"

"کچھ چاؤنے ہستو کا؟ ہمیں دیت کو ہو تو بتاؤ۔ سنو ہے کہ شہر میں کبھوں پوروئی نائیں پرت۔۔۔"

(کچھ چاہیے ہے کیا؟ ہمارے دینے کا ہو تو بتاؤ۔ سنا ہے شہر میں کبھی پورا ہی نہیں پڑتا۔)

اور نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک دم ختم! اس نے اپنی جیب سے پانچ کا نوٹ نکالا اور پلٹو کی ماں کو پکڑا دیا۔

"جیجی، ہماری طرف سے پلٹو کو مٹھائی کھلا دینا۔"

پلٹو اور پلٹو کی ماں انھیں باہر تک چھوڑنے آئے۔

"پلٹو پوچھت کہ ممّاں پھر کب ایہو؟" (پلٹو پوچھ رہا ہے کہ ماموں، پھر کب آؤ گے۔)

ان دونوں کی نظریں نیچی تھیں۔ انھیں چُراتے ہوئے وہ مڑے اور پھر دھیرے دھیرے اندھیرے میں کھو گئے۔

**

Scanned with CamScanner

عبدل بسم اللہ

ہندی سے ترجمہ: عطا صدیقی

رہائی

ابھی گھاس کی اوس بھی نہیں سوکھی تھی کہ سگنی ٹپک پڑی۔ گھٹنوں تک دھوتی چڑھائے، ننگے پیروں میں نم دھول اور گھاس پھوس بھرے، سر پر گٹھری اٹھائے، ٹھٹھرتی ہوئی۔

"ٹھنڈ میں جان دینی ہے کیا رے سگنی؟"

الاؤ میں ہاتھ سینکتے ہوئے میں نے پوچھا تو سگنی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ بھی گٹھری ایک طرف رکھ کر الاؤ کے پاس بیٹھ گئی اور بجھتی ہوئی آگ کو زندہ رکھنے کے لیے اس میں پتیاں ڈالنے لگی۔

"اتنے سویرے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اطمینان سے کھا پی کر آنا چاہیے تھا۔"

میں نے سمجھانے ہی کے انداز میں یہ بات کہی، لیکن سگنی کو لگا کہ میں بہانہ بنا رہا ہوں۔ شاید اسی لیے وہ میرا منہ تکنے لگی اور ڈرتے ڈرتے ہی اُس کے منہ سے کچھ نکل بھی گیا۔

"کورٹ کچہری کا معاملہ ہے سرکار، آپ نے نہیں کہا تھا کہ سویرے جلدی تیار ہو جانا۔"

اس کی بات سے میں نے اس کی حالت کا اندازہ آسانی سے لگا لیا۔ یہ سمجھنے میں مجھے دقت نہیں ہوئی کہ سگنی جمعدار سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہی ہے۔

میں نے سن رکھا ہے کہ سگنی اور جمعدار کا ساتھ بچپن کا ہے۔ سگنی کے باپ فودار نٹ کے کوئی بیٹا نہیں تھا، اس لیے وہ جمعدار ہی کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جمعدار کے باپ کے کئی بیٹے تھے، اس لیے اُس نے جمعدار کو فودار کے سپرد کر دیا تھا۔ فودار نٹ جمعدار اور سگنی کو لے کر اپنے دھندے پر جایا کرتا تھا۔ تب وہ چھوٹے تھے اور آپس میں بھائی بہن جیسا ہی رشتہ رکھتے تھے۔ لیکن بڑے ہونے پر ان میں دوسری

Scanned with CamScanner

طرح کا رشتہ ہو گیا۔ تب فودار نے جمعدار اور سگنی کا بیاہ کر دیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ سگنی اپنے زمانے کی بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ خاص طور پر اس کی نکیلی ناک اور چھریری کاٹھی پر نشانے کے سارے نوجوان مرتے تھے۔ مگر وہ کسی کو ٹھینگا نہیں سمجھتی تھی۔ سنا ہے ایک بار کسی من چلے نے اسے کچھ کہہ دیا تھا تو سگنی نے وہ پتھر کھینچ کر مارا تھا کہ اُس کی آنکھ پھوٹتے پھوٹتے بچی، اور گالیاں تو بے شمار دے ڈالیں۔

اس واقعے کے بعد پھر سگنی کو چھیڑنے کی ہمت کسی نے نہیں کی اور اس کا راستا صاف ہو گیا۔ اب وہ جمعدار کے ساتھ مزے سے زندگی گزارنے لگی۔

روکھا سوکھا کھانا اور موٹا جھوٹا پہننا۔ اسی میں دونوں خوش تھے۔ لیکن بہت خواہش ہونے کے باوجود ان کے ہاں کوئی بیٹا نہیں ہوا۔ ایک بیٹی تھی، جو جوان ہوئی تو بیاہ دی گئی۔ اب پھر وہ اکیلے ہو گئے۔ اس پر بھی جمعدار ناامید نہیں ہوئے تھے۔ انہیں پوری امید تھی کہ ان کے ہاں کوئی بیٹا ضرور ہو گا، کیوں کہ ایک جیوتشی نے انہیں بتایا تھا کہ ان کی قسمت میں بیٹے کا سکھ لکھا ہے۔ لیکن ان کی امید اُس وقت ختم ہو گئی جب ایک دن بھلا پھسلا کر اُن کی نس بندی کر دی گئی۔

تب سے ان کی صحت خراب رہنے لگی اور انہیں ایسا لگنے لگا کہ اب وہ نہیں بچیں گے۔ چناں چہ آخری عمر میں بیٹی سے ملنا انھوں نے ضروری سمجھا اور ایک دن گھر سے چل پڑے۔

لیکن وہ کیا جانتے تھے کہ ایسا ہو جائے گا۔

"ارے سرکار، ہم جانتے کہ ایسا ہو جائے گا تو ہم کاہے کو جانے دیتے،" سگنی آہ بھر کر کہتی ہے اور سسکنے لگتی ہے۔ میں اسے کیسے دلاسا دوں؟ سوچتا ہوں اور سوچتا ہی رہ جاتا ہوں۔

ایک روز شام کو سگنی کو خبر ملی کہ جمعدار شہر میں بھیک مانگنے کے جرم میں گرفتار ہو گئے ہیں اور جیل میں بند ہیں۔

سگنی کو اس بات پر اعتبار ہی نہیں آیا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ ان کو کبھی کس چیز کی ہے جو بھیک مانگیں گے؟ نہ، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں، کپڑا وہ ضرور پھٹا پرانا پہنے رہتے ہیں، ہو سکتا ہے اس لیے شک ہو گیا ہو۔۔۔ اور سگنی بس میں بیٹھ کر شہر پہنچ گئی۔

لیکن خبر جھوٹی نہیں تھی۔ زندگی میں پہلی بار اپنا اعتبار جھوٹا لگا۔ اب وہ کیا کرے؟ عورت ذات، اس پر گنوار۔ کچھ لوگوں سے ملی تو بغیر پیسے کے کسی نے بات ہی آگے نہیں بڑھائی۔ سگنی لاچار ہو کر چلی آئی۔

لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ جمعدار کو جیل سے چھڑا کر رہے گی۔ اس نے اپنا ارادہ برملا ظاہر کر دیا اور گاؤں بھر سے مدد مانگی۔ مگر سگنی کا ساتھ کوئی کس امید پر دیتا؟ جو لوگ کبھی سگنی کی گالیاں کھا کر نہال ہو جاتے رہے ہوں گے، آج وہ اس کا جھریوں بھرا پوپلا منہ دیکھ کر چڑ جاتے ہیں۔ سگنی اب نام کی سگنی رہ گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

پھر بھی اس کے تیور وہی ہیں۔ مگر وقت کی بات ہے! یہ وقت تیور دکھانے کا نہیں ہے۔ اس لیے شاید جب پہلی بار سگنی مجھ سے ملنے آئی تھی تو اُس کے تنے ہوئے چہرے سے بھی لجاجت ٹپکی پڑتی تھی۔

"سرکار اب آپ ہی سہارا ہیں نا۔۔۔"

اتنا کہتے کہتے سگنی غیر متوقع طور پر رو پڑی تھی۔ اپنے زمانے میں کسی کو کچھ نہ سمجھنے والی ایک عورت میرے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میں بہت زیادہ مضطرب ہو گیا اور کسی بھی طرح جمعدار کو چھڑانے کا میں نے عزم کر لیا۔

جب ہم شہر پہنچے، دوپہر ہو گئی تھی۔ کچھ وقت ضروری معلومات میں نکل گیا اور درخواست پر جب بھکشک کرم شالا (محتاج خانہ) نامی اس دنڈشالا (جیل) کے نگراں سے ہم رپورٹ لکھوانے گئے تو تقریباً شام ہو چکی تھی۔ نگران محترم نے اپنا کام کل پر ٹال دیا اور ہم رات گزارنے کی تدبیر سوچنے لگے۔

"تو کہاں رہے گی رے سگنی؟"

میرا ٹھکانا تو ایک دوست کے ہاں تھا، لیکن سگنی کے بارے میں پوچھ لینا میں نے اپنا فرض جانا۔ ویسے میں ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ میرے ساتھ ہی چلنے کی ضد نہ کرے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

"ہمارے لیے آپ فکر نہ کریں۔"

اس نے اس طرح حل پیش کیا کہ میں بالکل بے فکر ہو گیا۔ صبح اسٹیشن کے مسافر خانے میں اس نے ملنے کا وعدہ کیا۔

دوسرے دن صبح صبح میں اسٹیشن پہنچ گیا اور یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا کہ سگنی مسافر خانے کی ایک دیوار سے لگ کر ایک بورا بچھائے اور ایک گدڑی اوڑھے لڑھکی پڑی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے یقین ہی نہیں ہوا کہ یہ عورت جب سج دھج کر محلے ٹولے میں نکلتی رہی ہو گی تو من چلوں کے کلیجے ہل جاتے رہے ہوں گے۔ مگر اس بے یقینی کے ساتھ اس کی ہمت کے لیے میرے دل میں احترام بھی پیدا ہو گیا کہ اپنے بوڑھے شوہر کو جیل سے رہا کرانے کے لیے یہ کیسی تکلیف سہہ رہی ہے۔

مجھے دیکھتے ہی سگنی اپنا بستر لپیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"چلیں۔"

اس نے ایسے انداز میں مجھ سے چلنے کے لیے کہا گویا وہ بہت پہلے سے چلنے کا انتظار کر رہی ہے اور چلنے ہی کے لیے شہر آئی ہے۔

"جمعدار ولد نتھی، یہی کیس ہے نا؟"

اہل مد نے مجھ سے پوچھا تو میں نے ہامی بھر دی۔

Scanned with CamScanner

"نگران صاحب نے اس کیس میں رپورٹ لگائی ہے کہ یہ آدمی خلاف قانون بھیک مانگتے ہوئے پکڑا گیا ہے اس لیے اسے سخت سزا ملنی چاہیے۔ ایسی حالت میں یہ چھوٹ نہیں سکتا۔"

اتنا کہہ کر اس نے محرر کو آنکھ ماری اور میرے تو ہوش ہی اُڑ گئے۔ باہر بیٹھی سگنی سے میں کیسے کہوں گا کہ جمعدار چھوٹ نہیں سکتے۔

تب ہی محرر نے میرے کان میں ایسی بات کہی جسے کچہری کی زبان سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے تھے۔ میں نے کبھی کچہری کی زبان سے ملاقات نہیں کی تھی، پھر بھی اپنے عزم کو پورا کرنے کے لیے میں نے جیب میں سے پانچ کا نوٹ نکال کر اہل مد کی جیب میں ڈال دیا۔

"ٹھیک ہے، جائیے۔ ایک ہزار کا مچلکہ اور ایک ہزار کی ضمانت کا کاغذ تیار کر لیجیے۔ کام ہو جائے گا۔"

اہل مد نے یہ بات اس طرح کہی کہ میں اچانک خوش ہو اٹھا، لیکن ضمانت کی بات سے مجھے اُلجھن ہونے لگی۔

"صرف مچلکے پر نہیں ہو سکتا؟" میں نے تقریباً گڑگڑاتے ہوئے پوچھا تو اہل مد نے انکار کر دیا اور دوسری فائل دیکھنے لگا۔ میں باہر آ گیا۔

"ضمانت؟"

سگنی کا چہرہ ضمانت کے نام سے مُرجھا گیا۔ کون کرے گا ضمانت؟ یہ سوال اس کی آنکھوں میں تیرنے لگا۔

"ضمانت میں کروں گا۔"

میں نے اپنا فیصلہ سنایا تو سگنی کا پوپلا منہ خوشی سے کھل اٹھا۔ لیکن محرر نے اعتراض کر دیا۔

"آپ کو شناخت کون کرے گا؟"

"کچھ دے دلا کر نہیں ہو سکتا؟"

"کوئی بھی وکیل سَو سے کم پر تیار نہیں ہو گا۔"

محرر کی بات سے مجھے راحت ملی۔ میں سگنی کے پاس گیا جو دھوپ میں بیٹھی ہونے پر بھی تقریباً کانپ رہی تھی۔

"تمہارے پاس کتنے پیسے ہوں گے؟"

یہ سوال حالاں کہ میں نے بہت ہی انکسار سے کیا تھا، مگر جس وقت وہ اپنی کمر سے میلی کچیلی تھیلی نکال کر مُڑے تڑے نوٹ تھمانے لگی تو مجھے لگا کہ میں نے اس کے ساتھ بے حد بُرا سلوک کیا ہے۔

سگنی کی تھیلی میں کل ساٹھ روپے تھے۔ میں نے انہیں محرر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"اس سے زیادہ اب بے چاری کے پاس کچھ نہیں ہے۔ آپ اتنے میں کچھ کرا سکیں تو اس کے لیے

بھگوان سے بڑھ کر ہوں گے۔"

میں نے یہ بات اتنی عاجزی کے ساتھ کہی کہ محرّر نے کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا اور سب کچھ اس نے ٹھیک کر دیا۔

جمعدار کو ضمانت پر رہا کرانے کا کام بھکشک کرم شالا کے نگراں کے پاس پہنچ چکا ہے۔ میں پیڑ کے نیچے کرسی پر بیٹھا وہاں کا حال دیکھ رہا ہوں۔ سگنی کو اندر نہیں جانے دیا گیا ہے، اس لیے وہ گیٹ کے باہر ہی دیوار سے ٹک کر بیٹھی ہوئی ہے۔ نگراں صاحب نے ابھی کاغذ پر دستخط نہیں کیے ہیں۔ دوسرے کاموں میں مصروف ہیں۔

اچانک کچھ اَور بھکاری وہاں گرفتار ہو کر آ گئے ہیں۔ ان کے سامان کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ ان میں ایک بوٹ پالش والا اور دو بلڈڈوزر بھی ہیں۔ "ان لوگوں کو چھوڑ دیا جائے،" میں مشورہ دیتا ہوں تو مجھے سمجھایا جاتا ہے کہ یہ بہانہ باز ہیں، اس حلیے میں یہ جیب کاٹتے ہیں۔ اسی وقت ایک پُرانا بھکاری قیدی مجھے دھیرے سے بتاتا ہے کہ معائنہ ہونے والا ہے، کوٹا بھی تو پورا کرنا ہے۔ نئے بھکاریوں میں ایک جوڑا بھی ہے۔ ان میں شوہر کا وارنٹ جاری ہوا ہے اور بیوی کا نہیں، اس لیے بیوی کو گیٹ کے باہر کر دیا گیا ہے۔ وہ باہر رو رہی ہے، شوہر اندر رو رہا ہے۔ ویسے تو سارے قیدی چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں کے اندر تالے میں بند ہیں، مگر جو کام کاج کے لیے کھلے ہوئے ہیں وہ تماشا دیکھنے پہنچ جاتے ہیں۔

جمعدار آج چھُوٹ رہے ہیں، یہ خبر سنتے ہی ان کے کئی ساتھی میرے پاس آ گئے ہیں۔ ان میں وہاں کے چپراسی میاں بیوی بھی ہیں۔ "جمعدار تو کل ہی سے بخار میں پڑے ہیں،" چپراسی کی بیوی مجھے بتاتی ہے۔

جمعدار کو دیکھے بہت دن ہو گئے ہیں، اس لیے دیکھنے کی خواہش شدید ہو اٹھی ہے۔ تالا کھلتا ہے تو ایک دوسرا قیدی نکلنے کی کوشش کرتا ہے، جس کو تیزی سے اندر دھکیل دیا جاتا ہے۔ تب جمعدار نکلتے ہیں۔ دیکھ کر کسی کھیت میں گڑی اُس لکڑی کی یاد آ جاتی ہے جسے کُرتا پہنا دیا جاتا ہے اور آنکھ ناک بنا کر اوپر بانڈی رکھ دی جاتی ہے۔

بدن پر خاکی قمیص ہے اور مَٹ میلا پاجامہ۔ سر پر پھٹا پرانا انگوچھا بندھا ہے، پیروں میں ربر کے بے حد ٹوٹے ہوئے جوتے۔ وہ لنگڑاتے ہوئے چل رہے ہیں۔ جمعدار کی آنکھیں پھاٹک کی طرف لگی ہیں جس کے باہر سگنی بیٹھی ہے جس کے دل میں پتا نہیں کیا کیا بھرا ہے۔

"جاؤ جمعدار، اب ایسا کام مت کرنا۔ اور یہاں کے کپڑے اُتار دو۔"

اچانک وہاں کے ماسٹر کہے جانے والے ایک صاحب حکم دیتے ہیں اور جمعدار فوجی جوان کی طرح حکم بجا لانے کے لیے مستعد ہو جاتے ہیں۔ وہ پہلے قمیص اتارتے ہیں۔ میں ان کی ننگی پیٹھ دیکھتا ہوں اور نظریں زمین پر گاڑ دیتا ہوں۔ پھر وہ پاجامہ کھولنے لگتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

"پہنو گے کیا جمعدار؟"

ماسٹر پوچھتے ہیں تو جمعدار سر پر بندھے انگوچھے کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ بولتے کچھ نہیں۔ صرف زبان منہ میں الٹتی پلٹتی رہتی ہے۔ وہ پاجامہ اتار کر انگوچھا لپیٹ لیتے ہیں جس کے چھیدوں میں سے ان کا انگ انگ جھانک رہا ہے۔ میری نظریں پھر زمین پر گڑ جاتی ہیں۔

"چلیں بابو جی!"

جمعدار کہتے ہیں تو میں چونکتا ہوں۔

"ہن، کہا سنا معاف کرنا۔"

جمعدار چپراسی کی بیوی سے کہتے ہیں تو وہ پھوٹ پڑتی ہے۔ آنسو جمعدار کی آنکھوں سے بھی نکل پڑتے ہیں۔

آگے جمعدار چل رہے ہیں، ننگی پیٹھ، چھدرا انگوچھا لپیٹے، لنگڑاتے ہوئے۔ پیچھے میں۔

"تمہارے اپنے کپڑے کیا ہوئے جمعدار؟"

میں پوچھتا ہوں تو وہ بتاتے ہیں کہ سب چھین لیا گیا تھا۔ چلتے وقت مجھے صرف ایک جھولا دیا گیا تھا جس میں کیا کیا تھا میں نہیں دیکھ سکا تھا۔

جمعدار گیٹ سے باہر ہوئے تو لگا کہ میں نے اپنا عہد پورا کر دیا ہے اور یہ بات جمعدار سے کہہ بھی دی۔

"جمعدار، اب تو تم رہا ہو گئے۔"

"کیسی رہائی بابو جی؟"

یہ بات تڑاق سے میری کنپٹی پر لگی اور میں تلملا اٹھا۔ جمعدار نے اس رہائی کو رہائی کی شکل میں قبول نہیں کیا، یہ جان کر میرے ہوش اڑ گئے۔

میں دیر تک اس پھاٹک کی طرف دیکھتا رہا جس کے اندر لمحہ بھر پہلے تک جمعدار بند تھے۔ مڑا تو دیکھا کہ وہ سگنی سے لپٹ کر رو رہے ہیں۔

ایک بار پھر چھیدوں والے انگوچھے کے اوپر نکلی جمعدار کی ننگی پیٹھ اور جھکی کمر میری آنکھوں میں پھر گئی جو مجھ سے پیسے لے کر یا شاید پیدل گھر تک پہنچیں گے اور وہاں رہائی کے لیے قرض لیے گئے پیسوں کو ادا کرنے میں ان کی کمر اور جھک جائے گی، پیٹھ اور ننگی ہو جائے گی۔

اور لگا کہ سامنے جیل کا ایک اور گیٹ تیزی سے ابھر رہا ہے جس کے قانون سے رہا ہونا جمعدار نامی مخلوق کے لیے آسان نہیں ہے۔

**

Scanned with CamScanner

عبدل بسم اللہ

ہندی سے ترجمہ: رفیق احمد نقش

آدھا پھول، آدھا شو

حافظ جی کھانا کھانے بیٹھے تو گوشت میں اُنھیں نمک کچھ زیادہ ہی تیز لگا اور انھوں نے کھانا چھوڑ دیا۔ گھر والوں کو حیرت ہوئی۔ نمک چاہے تیز ہو یا کم، حافظ جی کھانا تو کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ بہو کو تھوڑا ڈانٹ ڈپٹ دیتے تھے، اور جیسے ہی اُن کے سامنے تازے تمباکو کا حقہ آتا تو خوش باش ہو اُٹھتے۔ لیکن اُس روز ایسا نہیں ہوا؛ حافظ جی چوکی پر سے اُٹھ گئے اور پلنگ پر جا لیٹے۔

"اگر اُن کا گھوڑا مارنے کے چکر میں نہ پڑتے ہم تو مات نہ ہوتی---" حافظ جی سوچنے لگے۔ "بجائے پیادہ چلنے کے اگر ہم اپنا ہاتھی چل دیتے تو کھیل کا نقشہ دوسرا ہی ہوتا---"

حافظ جی اُس روز ہار گئے تھے بُری طرح۔ اور رائے صاحب ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے تھے۔

"یہ کربلا کی لڑائی نہیں ہے حافظ جی، شطرنج ہے!" رائے صاحب نے چٹکی لی تھی اور حافظ جی کٹ کر رہ گئے تھے۔

جیسے جیسے رات گہری ہو رہی تھی، حافظ جی کا دماغ اَور زیادہ اُلجھ رہا تھا۔

ایک ایک کر کے رائے صاحب کی ساری چالاکیاں اُن کے سامنے اُجاگر ہو رہی تھیں۔ بازار کی وصولی، تالاب کی نیلامی، چک بندی میں کھیتوں کا چُناؤ--- سب جگہ رائے صاحب بازی مار لے گئے تھے اور حافظ جی دوستانہ مروّت میں پڑ کر خاموش رہ گئے تھے۔ مگر دھیرے دھیرے اَب ان کی سمجھ میں آنے لگا تھا کہ یہ رائے صاحب کی سہل کامیابیاں نہیں تھیں؛ ان کے پیچھے شطرنجی چال کی گہری چالاکیاں چھپی ہوئی

شو: لاش، میّت یا جنازہ۔

Scanned with CamScanner

تھیں۔

حافظ جی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ شاید ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اندر کے کمرے سے بیٹے کی ہنسی اور بہو کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اُنھیں سنائی پڑی تھی، ورنہ کھانا کھا کر اور حقّے کا دم لگا کر جب وہ بستر پر پڑتے تو فوراً ہی گہری نیند میں ڈوب جاتے تھے۔

مگر فکر تو بنا پنکھ کا پرندہ ہے نا، آدمی کا گوشت کھانے والا:

یکے مُرغ دیدم، نہ پاؤ نہ پَر
نہ از شکمِ مادر نہ پُشتِ پدر
نہ بر آسماں ہے نہ زیرِ زمیں
ہمیشہ خورَد گوشت ہے آدمی

(ایک پرندہ دیکھا جس کے نہ پاؤں ہیں نہ پر۔ نہ وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے نہ باپ کی قوت سے۔ نہ آسمان میں رہتا ہے نہ زمین کے نیچے۔ آدمی کا گوشت ہی اُس کی خوراک ہے۔)

اگر وہ رائے صاحب کا گھوڑا نہ مارتے تو مات نہ ہوتی اُن کی۔ اگر اُس دن وہ شہر نہ چلے گئے ہوتے تو بازار کی وصولی کا اختیار اُنھیں ضرور مل گیا ہوتا۔ اگر ایک بار اپنی بولی وہ اَور بڑھا دیتے تو اتنے بڑے تالاب کے مالک آج وہی ہوتے۔ اگر چک بندی افسر سے خواہ مخواہ جھگڑا نہ کر لیتے تو جو کھیت رائے صاحب کو ملے وہ اُنھیں کو ملتے۔۔۔

لگڑوں کوں۔

گھر کا منار کا مُرغا اتنے زور سے بولا کہ حافظ جی چونک اُٹھے۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے اور دیوار پر ٹنگی ٹک ٹک کرتی ولایتی گھڑی کی طرف دیکھنے لگے جو بنی ہوئی تو تھی جاپان کی، مگر بیٹا اُسے لایا تھا چوں کہ عرب سے، اس لیے حافظ جی نے اُس کا پرچار عربی گھڑی ہی کے روپ میں کیا تھا۔ اُس میں ساڑھے تین بج رہے تھے۔

صبح وہ پھر کھیلیں گے رائے صاحب سے۔ دیکھتے ہیں آج کیسے جیتتے ہیں وہ!

"اللہ اکبر۔۔۔"

حافظ جی اُٹھ گئے۔ اُنھوں نے پیروں میں جوتیاں ڈالیں اور تکیے کے نیچے سے ٹوپی نکال کر مسجد کی طرف چل پڑے۔

اُس وقت مسجد میں صرف تین چار نمازی تھے اور وہ وضو بنا رہے تھے۔ حافظ جی بھی ایک طرف بیٹھ کر، مٹی کے بدھنے میں پانی لے کر وضو بنانے لگے۔

اگر رائے صاحب کا گھوڑا مارنے کے چکر میں نہ پڑتے وہ تو ہرگز اُن کی مات نہ ہوتی۔۔۔ وضو بناتے وقت بھی حافظ جی کل رات کی اپنی مات ہی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ "اچھا آج دیکھتے ہیں۔۔۔"

Scanned with CamScanner

ساتھ ہی وہ اپنی ہونے والی چالیں بھی سوچ رہے تھے کہ اچانک دو تین نمازی اور آ گئے۔ وہ لوگ کسی اہم بات چیت میں مشغول تھے جو اُن کے مسجد میں گھستے ہی موقوف ہو گئی۔

نماز جب ختم ہوئی تو صبح کی ریکھائیں کافی واضح ہو گئی تھیں اور چاروں طرف اُجالا پھیل گیا تھا۔ حافظ جی کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ نماز کے بعد کوئی بھی نمازی باہر نہیں گیا تھا۔ سب لوگ مسجد کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے اور پیش امام کی طرف مشتاق نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ حافظ جی پھُوٹے: "بات کیا ہے صاحب؟"

"دیکھا آپ لوگوں نے؟ ہم کہہ رہے تھے نا کہ حافظ جی جان بوجھ کر انجان بنیں گے۔" پیش امام نے بڑے طنزیہ لہجے میں یہ بات کہی اور سارے نمازیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

حافظ جی ناراض ہو کر بولے: "دیکھیے صاحب، میں اشارے کنائے کی باتیں پسند نہیں کرتا۔ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہیے۔"

"ارے کا صاف صاف کہیں حافظ جی۔ آپ تو قادر خان کے پورے جوڑی دار ہیں۔ جیسے وہ ہندوؤں کا فیور کرتے ہیں ویسے ہی آپ بھی۔ آپ کو پتا نہیں ہے کہ قبرستان کی زمین پر اہیروں نے اپنے گھر بنا لیے ہیں؟ اور اُورام درس رئیوا کے اشارے پر آگے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اُور رئیوا تو آپ کا جگری دوست ہے نا!"

قصبے کے منہ پھٹ قسم کے درزی اسماعیل نے یہ بات کچھ اس انداز میں کہی کہ مسجد کے صحن میں اچانک ایک عجیب سا اشتعال اُپلوں کے دھویں کی طرح بھر گیا۔

حافظ جی سمجھ گئے کہ بات کیا ہے۔ وہ کھڑے ہو گئے۔

"دیکھیے صاحب، رائے صاحب ہمارے دوست ہیں، یہ ٹھیک ہے۔ لیکن دین اسلام کسی بھی دوستی سے اوپر ہے۔ ہم اپنے قبرستان پر ہندوؤں کا قبضہ نہیں دیکھ سکتے -- کسی بھی قیمت پر نہیں۔ آپ لوگ پروگرام بنائیے۔ ہمیں آپ سب سے آگے پائیں گے اُس میں۔"

اتنا کہہ کر حافظ جی مسجد سے باہر چلے گئے۔

"اب دیکھتے ہیں رائے صاحب کون سی چال چلتے ہیں۔ یہ شطرنج کی بازی نہیں ہے، اس ملک کی اقلیت کا جذبہ ہے--- اب بازار کی وصولی اور تالاب کی نیلامی کا معاملہ نہیں ہے، معاملہ ہے ہمارے آباواجداد کی ارواحِ پاک کا---" حافظ جی جتنی تیزی کے ساتھ سڑک پر چل رہے تھے، اُس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ خیالات اُن کے دماغ میں چل رہے تھے۔ اتنی تیزی کے ساتھ کہ راستے میں اسلامیہ اسکول کے ایک بچے نے جب اُنہیں "السلام وعلیکم حافظ جی" کہا تو حافظ جی کو وہ آواز سنائی ہی نہیں پڑی اور وہ ویسے ہی کسی کھدیڑے ہوئے ٹٹو کی طرح بگٹٹ بھاگتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

یہ پڈرونا ہے۔ پوربی اُتر پردیش میں دیوریا ضلعے کا ایک بڑا قصبہ۔ بڑا اس لیے کہ یہاں کی آبادی

گھنی ہے۔ بڑا اس لیے بھی کہ یہاں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے، جس کا اندازہ اور کبھی نہیں تو کم سے کم محرم میں تو ہو ہی جاتا ہے جب تعزیے کا جلوس یہاں کی سڑکوں پر اپنے پورے تام جھام کے ساتھ نکلتا ہے۔ یہ قصبہ اس لیے بھی بڑا ہے کہ کئی اسکولوں کے ساتھ ساتھ یہاں ایک کالج بھی ہے اور اس کالج کے پرنسپل دیش کی ایک بڑی ہستی ہیں۔ بڑی ہستی اس لیے نہیں کہ وہ ہندی ادب میں ایم اے اور پی ایچ ڈی ہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ ہندی کے ایک مشہور کوی ہیں۔ ابھی، بالکل ابھی اُن کا ایک شعری مجموعہ شائع ہوا ہے جس کا ہندی دنیا میں کافی ذکر ہے۔

پڈرونا کالج کے پرنسپل، یعنی کوی، یعنی بابوصاحب -- درمیانہ قد، دبلی پتلی کاٹھی، گورا رنگ، پتلی پتلی مضبوط انگلیاں، گول چہرہ، چھوٹی مگر گہری آنکھیں، آنکھوں میں چھوٹی چھوٹی بے شمار کوہستاؤں کے گہرے عکس، عکسوں میں جیون، جیون میں سچ سبھاو کی لَے، لَے میں مدھم گیت، گیتوں میں خزاں کے موسم کی ندی کا سا بہاو---

بابوصاحب ضلع بکیا کے رہنے والے ہیں اور بنارس میں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی ہے۔ بنارس اُن کی رگوں میں بسا ہوا ہے۔ وہاں کے مندر، وہاں کی مسجدیں، وہاں کے گھاٹ، وہاں کی یونیورسٹی -- بنارس شہر کا سمپورن جیون! پڈرونا میں بابوصاحب کو آئے لگ بھگ سات برس ہوئے۔ ان سات برسوں میں انھوں نے پڈرونا کو بھی بنارس ہی کی طرح جیا ہے۔ بابوصاحب سماجی میل جول میں پیچھے ہیں اور الگ تھلگ ہی رہنے میں اُنھیں اچھا لگتا ہے۔ پھر بھی اُنھیں سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں اور وہ بھی یہاں کے لوگوں کو پوری طرح پہچانتے ہیں۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ لوگوں کی پہچان اُن کی اولاد سے ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کہ پڈرونا کی اولاد کے وہ استاد ہیں!

اُس روز بابوصاحب کالج کے کیمپس میں داخل ہوئے تو بہت خوش تھے۔ اپنے بنارس کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے اُسی رات اُنھوں نے ایک کوِتا لکھی تھی اور اُس کوِتا سے وہ خوب مطمئن تھے۔ "یہ شہر آدھا پھول میں ہے آدھا شو میں / آدھا جل میں ہے آدھا منتر میں---" نظم کی یہ سطریں اُن کے ذہن میں شنکھ کی آواز کی طرح گونج رہی تھیں---

لیکن دو پیریڈ ختم ہوتے ہوتے کالج کا ماحول بدل گیا۔ اُپلوں کا جو دھواں صبح صبح مسجد میں اُبھرا تھا، اب تک پورے قصبے میں بھر چکا تھا۔ قبرستان کے پاس ایک جاہل بھیڑ اکٹھی ہو چکی تھی اور دھویں کا کڑوا پن کچے پکے گھروں کو پھلانگتا ہوا کالج کی دیواریں چیر کر اندر کلاسوں میں گھس آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالج خالی ہو گیا تھا۔ بابوصاحب اپنی کوِتا کی سطریں بھول گئے تھے اور اپنے دو چپراسیوں کو ساتھ لے کر گھر کی طرف چل پڑے تھے۔ اُداس اور خاموش---

قصبے کے ایک چھور پر بابوصاحب کا گھر اور دوسری چھور پر وہ قبرستان: آم اور نیم کے دس بارہ چھتنار درخت اور اُن کی چھاؤں میں ڈوبی ہوئی کچی پکی قبریں۔ وہیں ایک طرف چار پانچ چھوٹے چھوٹے گھر اور سامنے تھوڑی دور پر کانٹے دار تاروں کی ایک باڑھ۔ تاروں کی یہ لکیر ابھی حال ہی میں کھنچی ہے

اور گھروں کے سامنے چند کیاریاں اُبھر آئی ہیں---

"یہ گھر اُجاڑے جائیں اور یہ کیاریاں تباہ کی جائیں!"

پدڑونا کے مسلمانوں کا یہ خاص مطالبہ ہے۔ ان کا دعوا ہے کہ یہ زمین قبرستان کی ہے۔ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ جس زمین پر مکان اور کیاریاں ہیں وہ قبرستان سے باہر ہے۔

قبرستان کے پاس لوگ ہی لوگ ہیں۔ ایک پھیلی ہوئی انسانی بھیڑ۔ ہندو اور مسلمان۔ پنڈت اور حافظ۔ دکان دار اور نوکری پیشہ، بے روزگار جوان اور طلبا۔ سبھی طرح کے لوگ۔ اُپلوں کا دھواں قصبے کے اس چھور پر کچھ زیادہ ہی گھنا ہو گیا ہے۔

"کہیے حافظ جی، اب یہی سب ہو گا؟"

بھیڑ میں سے رائے صاحب باہر نکلتے ہیں اور اپنی نوکٹی لاٹھی زمین میں دھنسا دیتے ہیں۔ سفید دھوتی اور نکھنی کُرتے میں سجی ایک بھاری بھرکم پہلوانی ڈیل سامنے آتی ہے۔ حافظ جی چونک اُٹھتے ہیں۔ اُنھیں لگتا ہے، ابھی دو روز پہلے یہی ڈیل ایک کالے گھوڑے پر سوار تھی جسے اُنھوں نے مار گرایا تھا، اور بدلے میں یہ اُن کے سموچے وجود ہی پر چڑھ بیٹھی تھی -- ایک ساتھ دو دو سفید ہاتھیوں کی راہ!

"دیکھیے رائے صاحب، دوستی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ شہ پر شہ دیتے جائیں اور ہم صرف اپنا بچاو کرتے رہیں۔ آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں، کہ اس ملک میں ہمارا کوئی قبرستان بھی نہ رہے؟"

اور بات بڑھنے لگی۔ دھویں کے بیچ چنگاریاں بھی چمکنے لگیں۔ لگا قبرستان کے مُردے ڈھانچوں میں شیطانی ہتھیار چھپائے باہر آ گئے ہیں---

تبھی قصبے کا داروغہ اپنی موٹر سائیکل پھٹپھٹاتا موقعے پر حاضر ہو گیا۔ پیچھے پیچھے پولیس سے بھری ایک جیپ۔

اور بھیڑ کی آنکھوں میں ہندوستان کے تمام فسادات کی تصویریں ایک ساتھ ناچنے لگیں: گرفتاریاں، لُوٹ مار، آگ زنی، عورتوں کی بے عزتی، چھتوں پر پولیس کا پہرا، سڑکوں پر پولیس کا گشت، فضا میں پولیس کی سیٹی--- بھیڑ کانپ اُٹھی۔

چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ دھویں کا بہاو تھم گیا۔ فضا میں صرف اُس کی کڑواہٹ باقی رہی۔

"میرا مشورہ ہے کہ آپ لوگ اس معاملے کو آپسی فیصلے سے رفع دفع کر لیں، ورنہ مجھے قانونی کارروائی کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑے گا۔ اور آپ لوگ کان کھول کر سُن لیجیے کہ اگر کوئی آدمی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے گا تو میں اُسے چھوڑوں گا نہیں۔"

داروغہ نے اپنا ایک ہاتھ موٹر سائیکل کے ہینڈل پر اور دوسرا پینٹ کی جیب میں کھُسے پستول پر رکھے ہوئے یہ تنبیہ کی اور لمحے بھر بعد وہ موٹر سائیکل پھٹپھٹاتا ہوا چلا گیا۔ پیچھے پیچھے دھُول اُڑاتی جیپ بھی چلی گئی۔

Scanned with CamScanner

اب وہاں قبرستان کے نہیں بلکہ داروغہ کے بارے میں طرح طرح کے تبصرے کیے جانے لگے:

"یہ داروغہ سالا بڑا حرامی ہے۔"

"ہریجن ہے نا، دماغ اس کا ساتویں آسمان پر رہتا ہے ہمیشہ۔"

"اس کی آنکھ میں سوَر کا بال ہے۔"

"سنا ہے اس نے اپنے بیٹے تک کو جیل بھجوا دیا، ڈکیتی کے جرم میں۔"

"پتا نہیں کیوں اس کا ٹرانسفر بھی نہیں ہو رہا ہے؟"

"ارے رشوت کھلاتا ہو گا اوپر والوں کو، اَور کیا!"

"جہاں ایک بار پٹایا، دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔"

---اور دھیرے دھیرے بھیڑ چھٹنے لگی، جیسے رسّی کا بندھن کھل جانے سے بوجھ میں بندھی فصل بکھرنے لگتی ہے۔ دھویں کا گھٹا ٹوپ پھٹ گیا اور دھیرے دھیرے وہ قصبے کے گھروں میں سما کر دَب گیا۔

اگلے دن قصبے کے تھانے پر ایک پنچایت بیٹھی۔ دھواں تو اُس روز بھی کڑوا تھا، مگر اُس میں چنگاریاں نہیں چمک رہی تھیں۔ اُپلے اندر سے لہک رہے تھے، مگر اوپر راکھ کا پردہ تنا ہوا تھا۔

داروغہ نے پنچایت شروع کی:

"اپنی طرف سے ایک آدمی کا نام ہندو لوگ دیں اور ایک آدمی کا نام مسلمان لوگ دیں۔ دونوں آدمی اس پنچایت کے سرپنچ ہوں گے، اور دونوں کی آپسی رائے سے جو فیصلہ ہو گا وہ دونوں گروہوں کو قابلِ قبول ہو گا۔"

اور بھیڑ میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ پھر کھُسر پھُسر شروع ہوئی اور صلاح مشورہ ہونے لگا۔ کچھ لوگ وہاں سے اُٹھ کر کنویں کی طرف چلے گئے اور کچھ لوگ ایک چبوترے پر جا کر بیٹھ گئے۔ داروغہ اندر جا کر چائے پینے لگا۔

"تو کیا ہو گا اس قصبے میں اب؟" بابو صاحب کھڑے کھڑے سوچنے لگے۔ کیا اُن کے کالج میں ہندو طلبا کی کلاسیں الگ لگیں گی اور مسلمان طلبا کی الگ؟ کیا یونیورسٹی کو اُن کے نصاب بھی الگ الگ بنانے پڑیں گے؟ کیا اب اُنھیں پرنسپلی بھی الگ الگ ڈھنگ سے کرنی ہو گی؟

اور بابو صاحب کا جی گھبرانے لگا۔ اُنھیں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا، وہ پچھتانے لگے۔ جس پیڑ و نا کو اُنھوں نے پھول کی طرح پیار کیا ہے، وہ اب شوبننے کی تیاری کر رہا ہے--- بابو صاحب اپنی کویتا یاد کرنے لگے، جیسے مصیبت کی گھڑی آنے پر لوگ بھگوان کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ "یہ شہر آدھا پھُول میں ہے آدھا شو میں / آدھا جَل میں ہے آدھا منتر میں---"

تبھی ایک آدمی کنویں کی منڈیر پر سے آگے بڑھ کر تھانے کے آنگن میں پہنچ گیا۔ داروغہ چائے پی کر باہر آ گیا تھا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر اخبار دیکھ رہا تھا۔ اُس آدمی نے کاغذ کا ایک پُرزہ دھیرے سے

Scanned with CamScanner

داروغہ کی ٹیبل پر رکھا اور رائے صاحب کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔

مسلمانوں کا جی دھک دھک کرنے لگا۔ ہندوؤں کا سرپنچ بھلا رائے صاحب کے سوا کون ہو سکتا ہے؟ یہ کریں گے فیصلہ؟ اس پنچایت سے اچھا تو یہی تھا کہ دین کے نام پر لڑ مرتے وہ۔۔۔

داروغہ نے پُرزے کو غور سے دیکھا اور کسی نیلامی کے فیصلے کی طرح اُسے پڑھ کر سنایا: "ہندوؤں کی طرف سے پڈرونا کالج کے پرنسپل کوی جی کا نام آیا ہے۔ اب مسلمان بھائی بھی اپنے سرپنچ کا نام دے دیں تاکہ پنچایت کی کارروائی شروع کی جا سکے۔"

اور بابو صاحب گھبرا گئے۔

وہ کیا فیصلہ کریں گے؟ وہ تو ہندوؤں کے بھی پرنسپل ہیں اور مسلمانوں کے بھی۔ کیا اُن کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ ہندو ہیں؟ مگر اُستاد کیا ہندو یا مسلمان ہوتا ہے؟ بابو صاحب ابھی اسی پس و پیش میں پڑے تھے کہ مسلمانوں کا پُرزہ بھی داروغہ کی ٹیبل پر پہنچ گیا۔ بھیڑ میں کھسر پھسر بڑھ گئی۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکیاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ہندوؤں کے دل تیز تیز دھڑکنے لگے۔ قصبے بھر میں اگر کوئی مسلمان بھروسا کرنے لائق ہے تو وہ ہیں صرف قادر خان۔ اکیلے وہی ایسے مسلمان ہیں جو مانتے ہیں کہ وید بھی بھگوان کے گرنتھ ہیں اور اُن کی اہمیت بھی قرآن کے برابر ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہندوؤں کو کافر نہیں کہا جانا چاہیے۔ کافر وہ ہے جو کفر کرے، یعنی ایشور کے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ اگر اُن کی جگہ کسی اَور کا نام ہوا تو انصاف کی امید نہیں ہے۔۔۔

لیکن داروغہ کے چہرے کو دیکھ کر لوگ کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہو گئے۔ لگتا ہے پُرزے پر حافظ جی ہی کا نام ہے۔ داروغہ بار بار پُرزے کو اُلٹ پلٹ رہا تھا اور اُس کے چہرے کا رنگ لال ہو گیا تھا۔

"سنائیے داروغہ صاحب، سنائیے!"

بھیڑ کا صبر ٹوٹ چلا تھا۔

داروغہ نے پُرزے کو ایک بار پھر غور سے دیکھا اور پھر کچھ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا: "مسلمانوں کی طرف سے جو نام آیا ہے۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ نام بھی پڈرونا کالج کے پرنسپل کوی جی ہی کا ہے!"

اور بھیڑ پر سکتہ سا چھا گیا۔ دھویں کا کنٹوپ گرمتے کی چھتری کی طرح چھترا گیا۔

بابو صاحب کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ یہ سموچا ہندوستان پڈرونا اور بنارس ہی کی طرح کا ایک شہر ہے شاید! اور یہ شہر آدھا پھول میں ہے آدھا شو میں، آدھا جل میں ہے آدھا منتر میں۔۔۔

**

شری لال شُکل

ہندی سے ترجمہ: اجمل کمال

فساد

کئی دن کی کڑاکے دار سردی اور بارش کے بعد دھوپ کھِل کر نکلی تھی اور ہوا میں اچانک بسنت کا سلوناپن آ گیا تھا۔ اتوار نہ ہوتا تب بھی دن کچھ ایسا تھا جس میں کچھ کام نہیں ہو سکتا تھا۔ انھوں نے بیوی سے کہا کہ کچھ پینے کی اور کچھ کھانے کی چیزیں جلدی سے باندھ لی جائیں اور اتوار کو برباد کرنے والے لوگ آنا شروع کریں، اس سے پہلے ہی ہم لوگ کہیں پکنک پر نکل چلیں۔ تبھی خبر ملی کہ پڑوس کے ضلعے کے ایک گاؤں میں فساد ہو گیا ہے اور دو آدمی مارے گئے ہیں۔

خبر وائرلیس سے آئی تھی۔ فساد فرقہ وارانہ تھا، پر ضلعے کے پولیس کپتان نے بھارتی پریس کی نقل کرتے ہوئے صرف "دو فرقوں کی جھڑپ" کی بات کہی تھی؛ ان کے نام نہیں کھولے تھے۔ اُس علاقے کے ڈی آئی جی پولیس کی حیثیت سے انھوں نے اس پولیس کپتان کو ہمیشہ "کام چلاؤ" اور "خراب" کی درمیانی لکیر پر لڑکھڑاتا پایا تھا۔ تب انھوں نے پکے طور سے اُسے "خراب" کے خانے میں ڈال دیا۔ بیوی سے کہا، "لگتا ہے پوری خبر جاننے کے لیے اب مجھے بھی بی بی سی سننا پڑے گا۔"

پکنک کی بات وہیں رہ گئی۔ بولے، "پُسورام کا بھی میسج آ رہا ہو گا۔ شاید مجھے بھی موقعے پر جانا پڑے۔"

ایسا ہی ہوا۔ اُن کا نام لیتے ہی ایک سپاہی نے، جو گھر کا باورچی بھی تھا، اندر آ کر اُن کے سامنے ایک وائرلیس کا پیغام پیش کر دیا۔

یہ اُن پُسورام کی طرف سے تھا جن کا سرکاری نام پُنیت رام چودھری تھا اور جو صوبے کے آئی جی

پولیس تھے۔ انھوں نے امید کی تھی کہ یہ میسج شاید وہاں پر ان کی غیر موجودگی میں پہنچے گا، کہ وہ تب تک شاید موقعے پر پہنچ چکے ہوں گے۔ ہدایت کی گئی تھی کہ وہاں سے لوٹتے ہی وہ پورے حالات کی رپورٹ دیں۔ فساد پر قابو پانے اور تُرنت امن و امان قائم کرنے کے بارے میں کوئی ہدایت نہ تھی۔ اتنے اونچے عہدے دار کے لیے اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔

دو آدمیوں کے مر جانے اور کئیوں کے زخمی ہونے کی خبر کے ساتھ ہی پولیس کپتان کے پیغام میں تھا کہ حالات پوری طرح قابو میں ہیں۔ انھوں نے بیوی سے کہا، "جلدی سے ناشتا لگوا دو۔"

تھوڑی ہی دیر میں ناشتے کی میز پر وہ، ان کی بیوی اور دونوں بچے بیٹھ گئے۔

ایک بچے کو چھوڑ کر، جو دوردرشن کے کسی اشتہار کی لپیٹ میں صرف چاکلیٹ کا ٹکڑا چاٹتا رہا، سب نے قاعدے سے ناشتا کیا اور بات چیت لڑکے کو چاکلیٹ کی جگہ معمول کے ناشتے کے فوائد سمجھانے پر مرکوز رہی۔ بعد میں بیوی نے کوئی بھلی سی بات یاد کرتے ہوئے کہا، "بہت جلدی نہ ہو تو پندرہ منٹ رک جائیے۔ سوچتی ہوں، ہم لوگ بھی پاپا کے یہاں چلے چلیں۔ راستے میں ہمیں اتار دیجیے گا۔"

انھیں جلدی تھی، پر وہ انتظار کرنے کو راضی ہو گئے۔ لگ بھگ ڈھائی گھنٹے بعد پورا کنبہ موٹر پر لدلدا کر فسادزدہ گاؤں کی سمت بڑھا۔

جس ضلعے میں فساد ہوا تھا اُس میں بیوی کی خاص دل چسپی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہاں کی اِمرتیاں مشہور تھیں --وہ تو تھیں ہی-- بلکہ اس لیے کہ اُس ضلعے میں ان کے پِتا کا ایک فارم تھا۔ بیوی کے نہ رہنے اور شادی شدہ لڑکے لڑکیوں کے الگ الگ ہو جانے کے بعد سے وہ فارم پر "جنٹلمین فارمر" کی حیثیت سے اکیلے رہتے تھے۔ وہ اونچے سرکاری افسر رہ چکے تھے، اور یہاں گاؤں میں کھیتی ہَروں کے بیچ رہتے ہوئے اُن کی آتما کو، جو اتنی لمبی سرکاری نوکری کے باوجود مناسب طور سے محفوظ تھی، شانتی ملتی تھی۔ فارم بڑی سڑک سے، جس سے انھیں فسادزدہ گاؤں تک پہنچنا تھا، چار کلومیٹر اندر پڑتا تھا۔ بیوی کو وہاں چھوڑنے کے بعد انھیں لوٹ کر پھر سڑک تک آنا تھا اور آگے پینسٹھ کلومیٹر جانا تھا۔

"تمھیں میں نے دقت میں ڈال دیا۔ پر کیا کروں، پاپا بڑا اکیلاپن محسوس کرتے ہیں۔ آج نہیں تو دوچار دن بعد مجھے آنا ہی پڑتا۔"

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا؛ پھر کچھ دیر سوچ کر کار کی کھڑکی سے بولے، "پاپا کو وہ لیفٹننٹ گورنری لے لینی چاہیے تھی۔"

"تم نہیں سمجھ پاؤ گے۔ ماں کے نہ رہنے سے---"

"میں سمجھتا ہوں،" انھوں نے بیچ ہی میں کہا اور بیوی نے اُنھیں تیکھے پن سے دیکھا۔ اُسے بھروسا نہیں تھا کہ شوہر کے یہ الفاظ پاپا کے وقار کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ پر وہ ان کا چہرہ نہیں دیکھ پائی، وہ کار کی کھڑکی سے باہر کی سمت دیکھ رہے تھے۔

راستے میں ایک تھانا پڑتا تھا۔ انھوں نے کہا، "میں تب تک یہیں رک کر کام کروں گا۔" "ڈرائیور

سے بولے، "میم صاحب کو فارم پر چھوڑ کر بیس منٹ میں آجاؤ۔"

بیوی کو دلاسا دینے کے لیے انھوں نے اس کی بانہہ پر ہاتھ رکھا۔ کہا، "وہاں سب ٹھیک رہا تو شام کا کھانا پاپا کے ساتھ کھائیں گے اور آج ہی رات واپس لوٹ چلیں گے۔"

اس کے بعد انگریزی اسکول کے بچوں میں رائج وداعی موقعے کے ٹاٹا وغیرہ کے ساتھ سارے رسمی لفظوں اور اشاروں کو سمیٹے ہوئے موٹر فارم کی طرف جانے والے راستے پر تیزی سے چل دی اور وہ داروغاؤں اور سپاہیوں کے بیچ قتل، ڈکیتی، دنگا فساد کی اپنی خاص دنیا میں اکیلے رہ گئے۔

بیوی کے لیے فارم پر بتائے گئے دن کا وہ ٹکڑا اُس کے ماضی اور حال کی ساری رومانیت کے ریشمی تانے بانے سے تیار ہوا تھا۔ اپنے پاپا کے ساتھ وہ اپنے ماضی کے سہانے خوابوں اور حال کے اُس سے بھی زیادہ لُبھاونے دِن سپنوں میں کھوئی رہی۔ یہ دوسری ہی دنیا تھی۔

پیڑ پودے اور طرح طرح کے سبزے کی جھلملاتی ہریالی کے بیچ بنی چھوٹی سی کاٹیج کے برآمدے میں پیر رکھتے ہی اُسے خوشی ہوئی تھی۔ پاپا پہلے سے دوچار سال کم ہی دکھ رہے تھے؛ گالوں پر پہلے سے زیادہ دمک تھی۔ وہ جب بچوں کو پیار سے اپنی طرف کھینچنے میں لگے تھے تبھی اُن میں سے ایک نے کافی ٹیبل پر رکھی ایک کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہا، "وہ کیا ہے؟"

"تمھارے کومکس!"

پر کتاب کے پنّے پلٹتے ہی بچے کے چہرے پر پریشانی جھلکنے لگی۔ بولا، "نانا جی، آپ چیٹ کر رہے ہیں۔" کتاب کا عنوان اس کی جانی پہچانی انگریزی میں ہونے کے باوجود اُسے پڑھنے میں دقت ہوئی۔ دھیرے دھیرے اُس نے پڑھا، "یوگا واسی شٹھی۔" پوچھا، "یہ کیا ہے؟"

انھوں نے کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی۔ کہا، "یہ ہم بڈھوں کی کومکس ہے۔"

اُدھر ان کی بیٹی نے انھیں ٹوکا، "پاپا، آپ کو بڈھا کون کہتا ہے؟" اِدھر انھوں نے بچوں کو دونوں ہاتھ سے کمرے کے اندر ٹھیلا۔ بولے، "اندر جا کر میز پر دیکھ لو۔ تمھارے نئے کومکس کا پیکٹ ایک کونے میں رکھا ہے۔۔۔ اور ہاں، الماری میں بھی دیکھنا۔"

الماری میں چاکلیٹ تھے۔

"آج کا اتوار تو، پاپا، رَوی کے لیے برباد ہو گیا۔ سویرے آٹھ بجے ہی فساد کی خبر آ گئی۔ دو لوگ مارے گئے ہیں۔ پتا نہیں ہندو ہیں یا مسلمان۔"

انھوں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اچانک ان میں پرانا فرض کا احساس جاگا۔ بولے، "اب تک روی کیا کرتا رہا؟ اسے وہاں بہت پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"میری وجہ سے ہی۔۔۔"

"نہیں، نہیں، تم سے کیا مطلب؟ شاید آج کل کا طریقہ ہی یہی ہے۔" پھر، "تمھاری سائنوسائٹس اب کیسی ہے؟"

Scanned with CamScanner

دھیرے دھیرے دن بیتا، سورج ڈوبا۔ ان دنوں جھٹ پٹے کا وقفہ زیادہ لمبا ہونے لگا تھا۔ آسمان صاف تھا، پر افق پر ہلکی لالی کا دائرہ تھا اور اس کے نچلے حصے میں کالک کی ایک پٹی پھیل کر گہراتی جا رہی تھی۔ پچھوا ہوا میں ٹھنڈک تھی پر اس میں ابھی نوکیلاپن نہیں آیا تھا۔ دور دور تک لہلہاتی فصل کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے پاپا سے بات کرتی رہی۔

بچپن کے دنوں میں پاپا کے ساتھ تمبوؤں، ڈاک بنگلوں اور سرکٹ ہاؤسوں میں بِتائے ہوئے دن، شکار، رئیسوں اور افسروں کے جمگھٹ، پارٹیاں اور دعوتیں، پھر دلّی کو تبادلہ، پھر وہیں بس جانا -- جہاں پورا کنبہ چھوٹے شہروں کی زندگی سے پلٹ کر دیس بدیس کی اہم ہستیوں کی سلیقے دار بھیڑ میں سہتا سے سرک کر گھُل گیا۔ ماں کی لندن میں موت، ماتم پُرسی کا ماحول، خود وزیرِ اعظم کا نجی پیغامِ افسوس۔

پاپا سے بچھڑنا، پولیس افسر کی میم صاحب کا رُتبہ، پاپا کی ریٹائرمنٹ، ان کا چمک دمک سے سنیاس، یہ فارم، یہ فصل، یہ سنسان، یہ کاٹیج، یہ ہریالی---

"پاپا، اُس پنّورام کو بچے، ایمان دار اور محنتی افسر اچھے نہیں لگتے۔

"پاپا، اِس بار آپ کی کاٹیج بہت پیاری لگ رہی ہے، یہ پھول کس نے سجائے ہیں اندر کے کمروں میں؟ کچن میں بھی---"

"ایک آدمی واسی لڑکی مل گئی ہے۔ عیسائی ہے--- جین۔ آج میں نے اسے چھٹی دے رکھی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ دُکھی ہے، اس کا مرد فاریسٹ ڈپارٹمنٹ میں چوکیدار تھا۔ ایک حادثے میں دو سال ہوئے---"

"کھانا بھی بنا لیتی ہے؟"

"سیکھ رہی ہے۔ سُوپ بہت اچھا تیار کرتی ہے۔"

پاپا کے وسکی سوڈا کا وقت ہو رہا تھا۔

"پاپا، آپ کچھ دن ہم لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟"

"تم خود کچھ دن میرے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟"

وہ ڈرامائی انداز سے چپ ہو گئے۔ ایک چسکی لے کر پھر ڈرامائی انداز ہی سے بولے، "فکر نہ کرو بیٹی، میں بہت خوش ہوں۔"

"کچھ دن کے لیے اَنِل کے پاس امریکا کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"تمھیں کیوں نہیں گھوم آتیں؟ میں کرائے میں مدد کر سکتا ہوں۔"

کوئی کھمبے کے پاس کھڑا تھا۔ "کیا ہوا مینیجر صاحب؟"

مینیجر صاحب پتلون اور پُل اوور میں کسا ہوا چُست آدمی نکلا۔ سامنے آ کر بولا، "وہی بیج والا مسئلہ تھا۔"

"اس کی بات اِس وقت کرو گے؟"

Scanned with CamScanner

"کنور جی آئیں گے نا ابھی؟ آپ مناسب سمجھیں تو ان سے بات کر لیں۔"

وہ کچھ سوچ کر بولے، "کر لوں گا۔"

اس کے جانے کے بعد بیٹی نے ان کی طرف سوالیہ نگاہ اٹھائی۔ کنور جی، یعنی اس کے اپنے رَوی، جناب ڈی آئی جی صاحب! پاپا کے لیے کوئی نیا جھنجھٹ ہو گا، یعنی خود اس کے لیے کوئی نیا تحفہ--- رنگین ٹی وی؟ یا شاید ہیرے کے ٹاپس؟

"پانچ ایکڑ میں --ایگریکلچر ڈپارٹمنٹ سے طے کر کے-- گیہوں کا ایک نیا بیج بڑھا رہا ہوں۔ اب اس ضلعے کا افسر اسے بیج کی حیثیت سے سمن دینے کو تیار نہیں ہے۔ ہمارے طریقے میں اسے کچھ کمیاں نظر آ رہی ہیں۔ کسی منسٹر کا بھانجا ہے وہ، سوچتا ہے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اب دو ہی راستے ہیں۔ یا تو فصل کٹنے پر اس گیہوں کو معمولی گیہوں کی طرح بیچ دیا جائے، یا محکمے سے جھگڑا کیا جائے۔ اتنا طے ہے کہ میں ان لوگوں کو رشوت نہیں کھانے دوں گا اور خود ان سے بات بھی نہیں کروں گا۔"

"روی--- روی سے بات کر لیجیے۔"

"وہی تو ہمارے مینیجر صاحب کہنے آئے تھے۔"

اب چاند نکل آیا تھا۔ بجلی کی روشنی کے دائرے کے باہر ٹھنڈی چاندنی میں پیڑوں کی اندھیری شاخیں ہوا میں ہل رہی تھیں۔ بیٹی نے کہا، "روی اپنے یہاں کے ڈپٹی ڈائرکٹر ایگریکلچر سے بات کر لیں گے۔ ایک دیکشت صاحب ہیں۔ ہمارے یہاں آیا کرتے ہیں۔ پنڈت ٹائپ کے آدمی ہیں۔ پیاز تک نہیں کھاتے۔"

"اور رشوت؟"

"شاید وہ بھی نہیں کھاتے۔"

شاخوں میں ہوا کا بہاو کچھ زور پکڑ رہا تھا۔ وہ ان کے سایوں کا رقص ایک ٹک دیکھتی رہی۔ کمرے کی طرف منھ کر کے اُس نے پکارا، "بچو! ٹی وی سے کب تک چپکے رہو گے؟ کیا ایک منٹ کے لیے بھی برآمدے میں نہیں نکلو گے؟"

فساد کی یاد جو کسی قدیم چٹان کے نیچے دبی پڑی تھی، انھیں تب آئی جب دور سے آتی موٹروں کی روشنی سامنے پیڑوں پر پڑی۔

دو موٹروں میں آگے روی کی کار تھی، پیچھے ایک جیپ میں باوردی پولیس تھی۔ انھیں کاٹیج کے سامنے اتار کر گاڑیاں کچھ دوری پر پیڑوں کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئیں۔

"کیسا رہا؟" کا روی نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک گلاس میں بہت تھوڑی سی وسکی ڈال کر، اس میں اوپر تک سوڈا بھر کر وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ پھر زور کی سانس کھینچ کر کہنے لگے، "حالات تو خراب ہیں، پر شکر ہے خدا کا کہ یہ ہندو مسلم فساد نہیں ہے۔"

تب تک پاپا نے باورچی کو بلا لیا تھا۔ کہا، "اُن لوگوں کو چائے پہنچا دو۔ کچھ بسکٹ وغیرہ بھی۔"

Scanned with CamScanner

بچے بھی برآمدے میں آ گئے تھے۔ وہ بولے، "پانچ مکان جلے ہیں۔ ان میں چار مسلمانوں کے ہیں اور اتفاق ہے کہ ان کے بیچ پانچواں ایک ہندو کا ہے۔ دراصل وہاں کے ٹھاکروں کی ان لوگوں سے کافی عرصے سے مقدمے بازی چلی آ رہی تھی۔ زمین کا جھگڑا تھا۔ غنیمت ہے کہ پولیس نے دونوں طرف سے ایک سو سات کی کارروائی بھی کر رکھی تھی۔ پر کل شام معاملہ اچانک بگڑ گیا۔ ٹھاکروں کے ایک غول نے دوسرے فریق پر ہلّا بول دیا۔ ایک آدمی گولی لگنے سے مر گیا۔ تین کو معمولی چوٹیں آئی ہیں۔ ایک آدمی آگ میں جل کر مر گیا۔ کل ملا کر قتل اور آتش زنی کا معاملہ ہے۔ قانون کے حساب سے فساد بھی، لیکن فرقہ وارانہ فساد تو ہرگز نہیں۔"

"پی اے سی لگا دی ہو گی؟"

"کم سے کم اس معاملے میں ہمارے پولیس کپتان صاحب مستعد نکلے۔ وہ اور ڈی ایم کل رات ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ آج سویرے نو بجے تک قاتلوں میں سے بہتوں کو پکڑ بھی لیا گیا ہے۔ اُدھر کے بھی دو تین لوگوں کو حراست میں لیا گیا ہے۔"

بیوی بے چینی سے کرسی پر ہلی۔

"گاؤں؟ وہ تو اُجاڑ ہو رہا ہو گا! جلے ہوئے مکان، جلی ہوئی لاش، گولیوں سے مرے اور زخمی لوگ۔۔۔ پتا نہیں تم یہ سب کیسے دیکھ پاتے ہو!"

"ڈیڈی، ابھی ٹی وی پر فلم آئی تھی نا، دائل؟ اُس میں بھی ایسا ہی تھا نا؟ خوب گولیاں چلی تھیں، جھونپڑیاں جل رہی تھیں۔۔۔"

"بیٹے، تم لوگ اندر جا کر کھانا شروع کرو۔ ہمیں گھنٹے بھر ہی میں واپس لوٹنا ہے۔"

"دائل میں جو ولین ہے نا ڈیڈی۔۔۔"

پاپا دونوں نواسوں کو پکڑ کر اندر لے گئے۔ جب وہ باہر آئے تو اپنے داماد کو کہتے سنا، "ایک بڑی ٹریجک بات لگی: جو آدمی اُن جھونپڑیوں میں جل کر مرا تھا، وہ اپنی اکیلی لڑکی کے ساتھ رہتا تھا۔ بے چاری سترہ اٹھارہ سال کی معصوم لڑکی ہے۔ وہ رو تک نہیں پا رہی تھی۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور بس، کھڑی رہی۔ عجیب حالت تھی۔ بیٹھیے نا پاپا! پیچھے کچھ دوری پر کئی عورتیں رو رہی تھیں۔ پر وہ میرے آگے خاموش کھڑی تھی اور مجھے صرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے بھی نہیں، صرف میرے کندھے پر لگے بلّے کو۔۔۔"

پاپا نے بھنویں سکیڑیں، پتا نہیں ہم دردی سے یا ایک پولیس افسر کے جذباتی ہونے پر حقارت سے۔۔۔

"۔۔۔ پھر جب وہ بولی تو بولتی ہی رہی، پر صرف ایک بات۔ کہ میں اب کہاں جاؤں، بولو، میں اب کہاں جاؤں۔۔۔"

"تم نے کیا کیا؟"

Scanned with CamScanner

"اسے کچھ دنوں کے لیے شہر میں عورتوں کے پروٹیکٹو ہوم میں بھیجنے کو کہہ دیا ہے۔ کل سویرے اُس کی برادری کا ایک آدمی پولیس کے ساتھ اسے وہاں لے جائے گا۔"

"کچھ اَور نہیں ہو سکتا تھا؟"

"ہمارے اسٹاف میں ایک سب انسپکٹر ہے، اُسی طبقے کا ہے۔ وہ اسے اپنے گھر میں رکھنے کو تیار تھا۔ اس کی بیمار ماں کے لیے کوئی چاہیے۔ پر اس سے پولیس کی نیت پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔"

"تم جانتے ہو روی، وہ پروٹیکٹو ہومز، بس، یوں ہی ہیں۔ ان کا بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔"

"میں جانتا ہوں پاپا، پھر بھی یہ سرکاری ادارے ہیں۔ کوئی دوسرا انتظام کرنا ہم لوگوں کے لیے شاید اَور بھی جوکھم کی بات ہوتی۔ ہم لوگ تو گلاس ہاؤس میں بیٹھے ہیں۔ کوئی بھی پتھر پھینک سکتا ہے۔"

پاپا تیسرا گلاس بھرنے لگے۔ اَن مَنے پن سے بولے، "کیسا وقت آ گیا ہے۔ اتنی بڑی حکومت ایک یتیم لڑکی کو قاعدے کی چھت تک نہیں دے سکتی۔" وہ اپنے داماد سے بولے، "ایسا ہی تھا تو میں ہی یہاں فارم پر کچھ دنوں کے لیے اُس کی سرپرستی لے سکتا تھا۔"

داماد نے تیکھی نگاہ سے سسر کو دیکھا۔ کہا، "وہ تو بالکل ہی غلط ہوتا پاپا--- آپ خود جانتے ہیں۔ آپ سے میرا اتنا سیدھا رشتہ ہے---"

"پھر پاپا،" ان کی بیٹی نے کہا، "ایک نوکرانی آپ کو گھر کے لیے مل بھی گئی ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولے۔ بیٹی نے اٹھ کر کہا، "میں کھانے کا دیکھ لوں۔"

اس کے جانے کے بعد وہ داماد کے پاس کھسک آئے اور بولے، "تم جا رہے ہو روی، پر یہاں فارم کا ایک مسئلہ ہے، تمہارے بھی کان میں ڈال دے رہا ہوں۔ مینیجر پوری بات تم سے وہیں آ کر بتائے گا۔"

اصلی فساد، جسے سبھی نے بغیر لاگ لپیٹ کے فساد مانا، تین دن بعد ہوا۔ یہ فساد شہر میں، ہو بہو پاپا کے اندیشوں کے مطابق، اس واقعے کے بعد ہوا جب وہاں کے پروٹیکٹو ہوم میں دو دن پہلے بھرتی ہونے والی ایک لڑکی، بقول اخباروں کے، پُراسرار حالات میں غائب کر دی گئی۔

وہ اپنی رینج کے ہیڈ کوارٹر سے تُرنت اس شہر میں آئے اور پوری مستعدی سے فساد کو دبانے میں لگ گئے۔ جب تک پی اے سی، بی ایس ایف، فوج وغیرہ کی مدد سے فساد پر قابو پایا گیا، پورا واقعہ آل انڈیا نشریات میں شامل ہو گیا تھا اور صوبے کے چیف منسٹر کے آنے سے پہلے مرکزی ہوم منسٹر کے آنے کا پروگرام وہاں پہنچ چکا تھا۔

ایک قابل اور چُست پولیس افسر کی حیثیت سے اُنھیں کوئی اُلجھن نہیں تھی۔ درحقیقت ان کے ماتحتوں میں مرکزی ہوم منسٹر کی آمد پر جتنی پریشانی تھی، ان کے دل میں اس کے لیے شاید اتنا ہی اشتیاق تھا۔ اپنی صاف ستھری انگریزی میں اعلیٰ سطح کی میٹنگوں میں پورے حالات کی وضاحت کرنے، ان کا تجزیہ

کر کے فیصلے کے لیے سبھی ممکنہ حل پیش کرنے اور ان میں سب سے زیادہ موزوں حل کو منظور کرانے کے لیے وہ پوری پولیس فورس میں مشہور تھے۔ جلی ہوئی جھونپڑیوں کے موقعے کا معائنہ کرنے کے مقابلے میں یہ سارا کام زیادہ دور اندیشی اور مہارت کا تقاضا کرتا تھا جس کی وہ اپنے میں کمی نہیں محسوس کر رہے تھے۔ ایک یتیم لڑکی کو بے حفاظت چھوڑ دینے کے الزام کا وہ پولیس کی طرف سے پریس کو جو منھ توڑ جواب دے چکے تھے، اس کی پریس تک میں تعریف ہو رہی تھی۔

ایک حوصلہ مند اور تجربہ کار پائلٹ کو کل اپنی من پسند مشین پر چڑھ کر کھلے آکاش میں پرواز کرنے کا موقع ملنے والا تھا۔

**

گیان رنجن

ہندی سے ترجمہ: ولی رام ولبھ

گھنٹا

پیٹرولا کافی اندر دھنس کر تھا۔ درزی کی دکان، سائیکل اسٹینڈ اور موٹر ٹھہرانے کی جگہ کو پھاند کر وہاں پہنچا جاتا تھا۔ وہ کافی نامعلوم جگہ تھی۔ اسے صرف پولیس اچھی طرح جانتی تھی۔ ہم لوگ اُسی بالکل ٹکڑیا جگہ میں بیٹھنے لگے تھے۔ یہاں جتنا سکون اور آزادی تھی، کہیں اَور نایاب تھی۔ ہمیں یہاں پورا چین ملتا تھا۔ پیٹرولا ایسی جگہ تھی جس سے شہریوں کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ جہاں تک ہم لوگوں کا سوال ہے، ہمارا شہری پن ایک دُبلے باڑ کی طرح کسی نہ کسی طور بچا ہوا ہے۔ اکھڑے ہونے کی وجہ سے لگ سکتا تھا کہ وقت کے ساتھ سب سے بڑھ کر ہم ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیٹھے بیٹھے ہم آپس ہی میں پھنکار لیتے ہیں، ہلتے نہیں ہیں۔ ہمارے جسم میں لوتھڑوں جیسی شانتی بھر گئی ہے۔ نشے کی وجہ سے کبھی کبھار تھوڑا بہت غصہ بن جاتا ہے اور آپسی چل پوں کے بعد اوپر آسمان میں گم ہو جاتا ہے۔ اس نشے کی حالت میں کبھی ایسا بھی لگتا ہے کہ ہم بیدار ہو گئے ہیں۔ نجات کا وقت آ گیا ہے اور منافقت کو پہچان لیا گیا ہے۔ لیکن ہم لوگوں کے جسموں میں سَنت ملوک داس اس قدر گہرا آسن مار کر جمے ہوئے تھے کہ بھیڑیا دھسان ہمیشہ چالو رہا۔ ایسا لگتا کہ پیٹرولا کا زندگی سے باہر چلے جانا کافی مشکل ہو گیا ہے۔ یہ جگہ ایک پناہ گاہ میں بدل گئی تھی۔ پیٹرولا سے نکل کر شہر کے کھشیتر سے گزرتے ہوئے جب ہم اپنے کمروں کو واپس ہوتے تو شہر کا ڈھانچا دکھائی دیتا تھا۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ ہم سے بڑھ کر شہر کے ڈھانچے کے بارے میں کم لوگ جانتے ہوں گے۔ میرے ساتھیوں کو بیوی بچوں، سماج اور دیش دنیا سے شاید ہی کوئی تعلق رہ گیا تھا۔ وہ لوگ فطری طور پر "اینٹی" تھے۔ اپنے ساتھیوں میں مَیں واحد ایسا فرد تھا جس کا فیصلہ زندگی نے ابھی تک نہیں کیا تھا

Scanned with CamScanner

اور جو دو لالچوں کے بیچ ابھی غور اور سوجھ بوجھ کا طریقہ استعمال کر رہا تھا۔ یہ بھی بہت حد تک ممکن ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے ایسا چالاک آدمی بن چکا ہوں، لیکن فی الحال میں یقین سے نہیں جانتا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب میری صحت گھگھیانے لگتی ہے، رجگوں کی تعداد حد پار کر جاتی ہے اور مجھے یہ دکھائی دیتا ہے کہ میرا معززپن ترقی کر رہا ہے اور اس دوران اس میں رتی بھر بھی بگاڑ نہیں آیا ہے، تب میں لمبی تان کر سوتا ہوں، شوونڈو کے گلیاروں میں گھومتا ہوں، کوکا کولا پیتا ہوں اور ہیلو ہیلو۔ پیٹرولا کو گولی دے جاتا ہوں۔ میرے ساتھی ممکن ہے اس بات کو تھوڑا بہت جانتے ہوں لیکن وہ پروا نہیں کرتے۔ میرے پاس کچھ ایسے کپڑے بھی ہیں جن کا میرے جسم سے اور خود میری پچھلی زندگی سے کوئی میل نہیں ہے اور جنھیں پہنتے ہی مجھے لگتا ہے کہ بھیس بدل گیا ہے۔ میں انھیں تب پہنتا ہوں جب پیٹرولا میں نہیں جانا ہوتا۔ مجھے ان کاسٹیوم جیسے کپڑوں کی شرم بھی ستانے لگتی ہے لیکن میں نے انھیں کبھی ہمیشہ کے لیے پھینکا نہیں۔ برسوں نہیں پہنا، پر سنبھال کر رکھا۔

ایک دن میں پیٹرولا سے باہر پان کی دکان تک نکلا تو نیم سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ کافی رات جا چکی تھی۔ نیم جب سے بیمہ ایجنسی چلانے لگا ہے، خوب صورت ہو گیا ہے۔ ایک وقت نیم کی زندگی ایسے حالات پر پہنچ گئی تھی کہ لگتا تھا وہ بھی پیٹرولا کے کراوڈ میں شامل ہو جائے گا، لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ پوری طرح سکھی اور محفوظ ہو جانے کے بعد اب وہ جب بھی ملتا ہے پیٹرولا کی زندگی پر رال ٹپکانا شروع کر دیتا ہے۔ کہتا ہے: "کہاں بیمے میں پھنس گیا۔ تم لوگوں کے ساتھ کی زندگی اب کہاں نصیب ہوتی ہے۔" میں سمجھتا ہوں اب اُس کے پاس کافی پیسا ہے اور آرام بھی خوب ہو گیا ہے۔ دو چار منٹ مشکل سے بیتے ہوں گے کہ نیم نے کندن سرکار کے بارے میں بات شروع کر دی۔ مجھے پتا تھا، وہ کندن سرکار کی بات ضرور کرے گا اور بہت جلدی میں ہونے کے باوجود مجھے اُس کی اس بات کا انتظار تھا۔ وہ مجھے جب بھی ملا، کندن سرکار سے تعارف کرانے کے لیے لگ بھگ چمٹ سا گیا۔ ضرور اس میں اُس کی کوئی خوشی تھی۔ شاید وہ بتانا چاہتا ہو کہ ہماری دوستی ابھی تک پکی ہے، وقت نے اسے مٹایا نہیں ہے۔

کندن سرکار والی بات برسوں سے چلتی آ رہی تھی اور آج تک ماند نہیں پڑی۔ اس بار نیم نے مسکرا کر سرگوشی میں اُس کے یہاں اچھی دارو ملنے کا بھی اشارہ دیا۔ اُس نے دم دیا کہ کندن سرکار کے ساتھ مجھے بوریت نہیں ہو گی۔ "تم لیکھک اور وہ انٹلیکچوئل، واقعی مزہ آ جائے گا۔" حقیقت یہ ہے کہ ادب مجھ سے کافی عرصے پہلے بچھڑ گیا تھا۔ اب مشکل سے تھوڑا بہت چیتھڑا باقی بچا تھا، لیکن یہ بات میں نیم سے دبا گیا۔ میں جانتا ہوں اُس سے الجھنا وقت کی ایک واہیات بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ نیم بالکل چیونٹا ہے۔ جاتے جاتے وہ چلاتا گیا: "بدکنا نہیں کل پکارنا۔ ایسا آدمی تم کو کم ملے گا جو اپنی پوزیشن کو لات مار کر چلتا ہو۔ دوست قسم کا شخص ہے اور ٹاپ طبیعت۔ بولو، اور کیا چاہتے ہو بھائی؟" چلتے چلتے وہ پھر رکا اور تھوڑا جوش میں آ کر بولا: "وہ تمھارے ساتھ ہولی چلا جائے گا، نہ کپڑے جھاڑے گا اور نہ ناک سکیڑے گا۔ کل پکارنا۔"

Scanned with CamScanner

میں سب چیزوں کو برداشت کرنے کی تیاری کرتا ہوا، شراب کی کشش کے سہارے، کندن سرکار کندن سرکار سوچتا ہوا پیٹرولا واپس پہنچا۔

کندن سرکار کافی بھبکتا ہوا نام تھا۔ شہر کے تمام لیکھک اور دانشور اُس تک پہنچ چکے تھے۔ یہ سب مڈل کلاس ادیب تھے، جس کا کھاتے اُس کا گاتے بھی خوب تھے۔ جہاں سے آدمی کی پونچھ جھڑ گئی ہے، ان لوگوں کو اُس جگہ، کندن سرکار کو دیکھتے ہی، کھجلی اور خوش نصیبی کی گدگدی ہونے لگتی تھی۔ کندن سرکار اور دانشوروں کے میل جول کو تاکنے والے بہت سے تماشائی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے جنھوں نے شہر کے ادبی حلقوں میں کندن سرکار کی ہوا باندھ رکھی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو کچھ بھی نہیں بتایا اور کچھ عرصے کے لیے پھوٹ گیا۔ انھیں اپنا لالچ بتانا ممکن بھی نہیں تھا۔ پیٹرولا کے ساتھیوں میں اکثر ایسے تھے کو کندن سرکار جیسے آدمیوں کو ان کی اصل جگہ پر رکھتے تھے۔ وہ لوگ پوری طرح دنیا سے مڑے ہوئے تھے۔ صرف میں تھا، اٹکا ہوا، عزت شہرت، عہدے پیسے اور دیس سماج سے بے تاب ہونے والا۔

کندن سرکار ایسے مقام پر تھا جہاں رہ کر عام طور پر جنتا کے قریب نہیں رہا جا سکتا۔ اس کے باوجود وہ ایک بے جوڑ سماجی حیوان تھا۔ حکومت کو پتا نہیں کیسے اُس نے بے وقوف بنا رکھا تھا۔ اسے ادبی شخصیتوں، فن کاروں اور دانشوروں سے بات چیت کرنے، اُن کے درمیان گھلنے ملنے اور اُنھیں شراب پلانے کی تمنا رہتی تھی۔ اس شہر میں کئی سو ادیب اور فن کار ہیں، لیکن کندن سرکار اُن سے کبھی گھبرایا نہیں۔ وہ ایک کو ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ ایک وقت میں ایک۔ وہ تجربہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ رہنے والے کو لوگ کندن سرکار کا گھنٹا کہتے تھے۔

اُن دنوں کندن سرکار کا گھنٹا میں تھا۔ وہ مجھ سے ذرا بھی نہیں بدکا حالاں کہ میری حالت کافی گندی تھی۔ اپنی اوگھڑ حالت میں اُس کے گھر میں گھستے ہوئے مجھے لگا، یہ قطعی درست اور آرام دہ جگہ نہیں ہو سکتی، لیکن لالچ کا کہیں کوئی جواب نہیں ہے۔ شراب جیسے جیون جوتی ہو گئی تھی۔ کسی سے شراب کیا پی لی، سمجھا بہت تگی کر لی، یہ حالت تھی۔

شروع میں اُس نے مجھے معمولی شراب پلائی جب کہ اُس کے پاس یقیناً اونچی شراب کا بھی اسٹاک موجود تھا۔ وہ بھانپنا چاہتا تھا کہ یہ کتنا اونچا دانشور ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں ایک خستہ حال شخص تھا۔ اگر میں مالدار دانشور ہوتا تو کندن سرکار کا سلوک کچھ اَور ہی ہوتا۔ کندن سرکار نے خزانہ کھول نہیں دیا۔ میرے ساتھ وہ لوفرسٹی کے ڈھرے کی طرف زیادہ بھکتا تھا۔ اُس نے مجھ سے کئی بار چالو جگہوں میں چلنے کو کہا جب کہ مجھے چالو ٹھکانوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔

میرے ساتھ اُس کی یہ حالت تھی کہ سڑکوں پر ٹہلتے ٹہلتے تھک جانے پر وہ رکشا بھی نہیں کرتا تھا۔ کئی کئی دن ایسے نکل جاتے کہ چائے کافی کے علاوہ کچھ بھی ٹھوس پروگرام نہ ہوتا۔ وہ بیڑی مانگ مانگ کر میرا بنڈل پھونک دیتا جب کہ اُس کی جیب میں اُس وقت مہنگی بدیسی سگریٹ رکھی ہوتی ہوتی۔ مجھے اس

میں کیا فائدہ تھا، پر میں پتا نہیں کیوں انتظار کرتا رہا۔ کندن سرکار کے لیے یہ دن تجربے، مزے اور تمنا پوری ہونے کے دن تھے۔ کیا اِسی چھتنیہ چوتیا پے کے لیے میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر آیا تھا؟ وہ کہتا بھی تھا: "یار، کھلی زندگی کا ایسا مزہ پہلے کبھی نہیں آیا۔"

مزہ نہیں آیا! مزے کے لیے آئے ہو میرے پاس، کتّے کی اولاد؟ میں کڑھتا ہوا غصّے سے کٹ گیا۔ طبیعت ہوئی کہ پھاڑ کر رکھ دوں اس کا اور اپنا ڈھونگ۔ مجھے شرم بھی ستاتی تھی۔ اپنے ساتھیوں کو چرکا دے کر، انھیں اپنے سے بے خبر رکھ کے، میں یہاں موج کے لالچ میں چلا گیا۔ وہ لوگ خطرناک راستوں میں زندگی کو پھانس دینے کے باوجود کبھی اپنے کو اِدھر اُدھر ہلاتے جُلاتے نہیں۔ وہ لوگ پختہ ہیں اور دکھی نہ ہونے والے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جلد ہی "نگلا جائے نہ اُگلا جائے" کی حالت کو تمام کر دینا ہے۔ سچائی کا لمحہ نزدیک ہے اور اب ٹھکانا ہو جائے گا۔

جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ کندن سرکار کا ساتھ دینا بہت کٹھن کام ہے، اور غیر ضروری بھی۔ روز دو گھنٹے اُس کے ساتھ لٹریری بات چیت کر سکنے کی طاقت اگر آپ میں ہے تو اُس سے اچھی نبھ سکتی ہے۔ مجھے اُس کی کرانک حالت کا پتا نہیں تھا۔ لٹریچر اُسے بواسیر کی طرح پریشان کرتا تھا۔ کیسی بھی گھامڑ صورتِ حال ہو اور بات چیت کا کیسا بھی رُخ، اس کو لٹریچر کی طرف موڑنے میں اُسے اُتنا بھی وقت نہیں لگتا تھا جتنا ایک گیئر بدل کر دوسرا گیئر لگانے میں لگتا ہے۔ مجھے اتنی مہارت نہیں تھی۔ میں بہت جلد اندر سے بول گیا۔ اپنی حد سے زیادہ برداشت کے باوجود "سچائی کا لمحہ" آ ہی گیا۔

کندن سرکار نے ایک بار مجھے تفصیل سے بتایا تھا کہ فنکار کو دکھ بھری، سسکتی ہوئی زندگی جینی چاہیے۔ تبھی اُس کا تجوری تجربوں سے بھری رہ سکتی ہے۔ اسے بے شمار ایسے لوگوں کے نام پتے یاد تھے جنھوں نے تجربے کے بل پر اپنے وقت کے تمام رقیبوں کا پٹڑا کر دیا تھا۔ ادبی مسئلوں پر اُس کے اقوال ایسے عجیب و غریب ہوتے تھے کہ سر پیٹ لینے کو جی چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ "سماج کے کھیت میں زندگی کھاد ہے، ادیب کسان اور ادب فصل، اسی طرح جیسے عورت دھرتی کی مثال ہے، مرد ہل اور اولاد پھل۔"

مجھے بھی بولنا پڑا تھا۔ خاموش رہنا ناممکن تھا۔ اگر اُسے پتا چل جاتا کہ میں اُکتایا ہوا شخص ہوں تو اس سے پہلے کہ میں فیصلہ کر کے خود گیٹ آؤٹ ہوتا، وہ مجھے سلام کر دیتا۔ اس لیے میں بھوسے کو رس لے کر چباتا رہا۔ "آپ کی باتوں میں عجیب کرشمہ ہے،" میں کہتا۔ وہ چمک کر بولتا: "کرشمہ! حقیقت کو آپ کرشمہ بتاتے ہیں! شاباش!"

اُس نے مجھے بار بار بتایا کہ وہ سچائی کا پجاری ہے۔ "تم دیکھو میں اسکاچ پی سکتا ہوں، پھر بھی ٹھرّا کیوں پیتا ہوں، سڑکوں پر پیدل کیوں بھٹکتا ہوں، بوراکھادی کیوں پہنتا ہوں، گاڑی ہوتے ہوئے بھی پیدل کیوں چلتا ہوں، جب کہ میں لیجک نہیں ہوں۔۔ بس انٹلکچوئل ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے سچائی خوب صورت لگتی ہے۔ میں سچ جمع کر رہا ہوں۔"

Scanned with CamScanner

کسی طرح وہ آخری دن آ گیا۔ زکام نے میری طبیعت جھک کر رکھی تھی۔ ناک کی حالت ٹونٹی جیسی ہو گئی تھی۔ ایک عجیب چڑچڑ چڑچڑ مچی ہوئی تھی۔ زکام کی وجہ سے آخری دن اور پکا ہو گیا۔ اُدھر یہ عجیب اتفاق تھا کہ کندن سرکار کی جیبوں میں اُسی دن دارُو میرے لیے لہریں مار رہی تھی۔ اُس دن اس نے خوب خرچ کیا۔ صبح سے شروع ہو کر شام تک ہم پیتے گھومتے رہے۔ میرے دل میں بھی یہی تھا، زیادہ سے زیادہ لُوٹ لو کندن سرکار کو، ہماری صبح نہیں آنے والی ہے اس چوتیے کے ساتھ۔ جب شام ہوئی اور بتّیاں جلیں، وہ مجھے ایسے ریستوراں میں لے گیا جہاں میں کبھی نہیں گیا تھا۔ وہ اتنی شریف جگہ تھی کہ میں وہاں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ اگرچہ مالی مسئلہ بھی تھا، مگر اصل میں شریف جگہیں مجھ سے سہی نہیں جاتیں۔ وہاں میں ڈسٹرب ہو جاتا ہوں اور اُلٹی آنے لگتی ہے۔ اُس دن کی بات لگتا ہے کچھ اَور ہی تھی۔ چھٹے میں شہد کی طرح نشہ جسم میں چھنا ہوا تھا اور جسم پیڑ کی طرح بغیر گرے جھوم رہا تھا۔

ریستوراں کا ہال بھرا ہوا تھا۔ مدھم روشنی تھی اور مردوں عورتوں کی تعداد برابر لگتی تھی۔ چاروں طرف خوشبوئیں گتھی ہوئی تھیں اور ذرا ادھر اُدھر ہونے پر بدل جاتی تھیں۔ ہمیں دو کرسیوں والی ایک ٹیبل مل گئی۔ کندن سرکار کے کوٹ میں ایک جن کا ادّھا تھا۔ بیٹھنے کے فوراً بعد وہ ناک میں لگ گیا۔ میں اس جگہ کافی پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے میری سانس بہتر ہو گئی اور میں ہوشیار ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں ایک ساتھ ایسی عورتیں اور آدمی کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میرا دماغ دارُو اور زکام میں سَنے رہنے کے بعد کہیں تھوڑا بچ گیا تھا۔ یہاں تھوڑی دیر مجھے اپنے بھارت دیش کا دھیان آتا رہا۔

کندن سرکار نے بتایا، اس ریستوراں میں زیادہ تر فوجی افسر اور اُن کے کنبوں کے لوگ ہی آتے ہیں۔ مجھے فوراً یقین ہو گیا کہ یہاں بیٹھے ہوئے لوگ فوجی افسر ہی ہو سکتے ہیں۔ اس جگہ کا اصل دنیا سے کوئی واسطہ نہیں لگتا تھا۔ یہاں کوئی شخص غصیل، گمبھیر یا دکھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سب تندرست، تر اور چکنے چہرے تھے۔ کندن سرکار بھی اسی تر دنیا کا رکن لگ رہا تھا۔ صرف ایک اُجڑے ہوئے شخص کو بٹھا کر شراب پلانے دینے سے کیا اُس کا مقام اس دنیا سے کاٹا جا سکتا ہے؟

میں نے غور کیا، ہال میں دو طرح کی عورتیں تھیں۔ کچھ بالکل ہلکی پھلکی اور کچھ ایسی جنھیں دیکھ کر لگتا تھا بالٹی بھر کے ہگتی ہوں گی۔ موٹی عورتیں مردوں کے ساتھ سب سے زیادہ لڑکپن دکھا رہی تھیں۔ مرد بھی پیچھے نہیں تھے۔ چیزوں کو چکھتے ہوئے وہ دوسروں کی عورتوں کی اداؤں کو مہذب طریقے سے چاٹ رہے تھے۔ وہ اپنے علاوہ دوسروں کو وہاں موجود ہی نہیں سمجھ رہے تھے۔ کہیں وہ اس خیال کا بھی شکار تھے کہ ریستوراں کا یہ ہال اُن کے لیے ماحول بناتا ہے اور یہ دنیا اُن کے لیے بنی ہے۔ مادر۔۔۔ میرا دماغ ایک دم سے کڑک ہو گیا۔ آخر تم لوگ کب تک غلام بنے رہو گے اور کب تک ہم اکسٹھ باسٹھ کرتے رہیں گے!

اب تک کندن سرکار ٹانگوں کے بیچ جن کی سیل توڑ کر اُسے اَدھ پیے پانی کے گلاسوں میں ڈال چکا تھا۔ جن اب پانی کی طرح ٹیبل پر رکھی تھی اور وہ اُسے دھیرے دھیرے پی رہا تھا۔ تبھی ڈائس پر ساز سنگیت شروع ہوا۔ ساز سنگیت، جیسے سیار بول رہے ہوں، ہُواں ہُواں، اور جیسے قتل کیے جانے والوں

کی چیخ پکار مچی ہوئی ہو۔ بہت گھال میل تھا اُس میں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ شراب تھی یا میرا اصل روپ، مگر مجھے ساز کی آوازوں سے متلی ہونے لگی۔ میں نے سوچا، اس سے پہلے کہ اندر کی کڑواہٹ اچانک لذیذ ذائقے میں تبدیل ہو جائے، مجھے کچھ کر ڈالنا چاہیے۔ ذرا سا ستانے لگو تو دنیا گلے کے نیچے کھسکنا شروع کر دیتی ہے۔ میں نگلنا نہیں چاہتا، اُگلنا چاہتا ہوں۔ نشے نے مجھے بچار کھا تھا، نہیں تو اس وقت مجھے پتا ہے، کسمسا کر زیادہ سے زیادہ دو چار گالیاں بکتا اور "سوسو" ہو جاتا۔ فی الحال میرا دماغ ایک باغی مستی سے بھرا ہوا تھا۔

میں نے غور کیا کہ پہلے سے صورتِ حال بہتر ضرور ہوئی ہے۔ پہلے میں صرف مسکراتا تھا۔ جیسے دنیا ایک چوتیا پا ہے اور میں اسے سمجھ گیا ہوں۔ حالت یہاں تک پہنچی کہ اس مسکراہٹ کی وجہ سے مجھے گھونگھا سمجھا جانے لگا۔ اس سبزی خور مسکراہٹ سے نظام کا تو کچھ بگڑتا نہیں۔ دُم دار مسکراہٹ تو راجا کی ہوتی ہے، منت کی ہوتی ہے، عورت کی ہوتی ہے، اور جن کا چمن خطروں سے آزاد ہے اُن کی ہوتی ہے۔ مسکراہٹ گئی تو اب اُلٹی آنے لگی ہے۔ توڑ پھوڑ مچنے لگتی ہے۔ بھرپور طریقے سے ایسا ہی ہوتا رہے، یہ بھی آسان نہیں ہے، کیوں کہ جمہوریت کے رومانس اور شہری پن کے احساس کو پتا نہیں کب اندر ایسا کوٹ کر بھر دیا گیا ہے کہ توڑ پھوڑ تو در کنار ہو جاتی ہے، بچی رہ جاتی ہے بس ایک لنگنی بُدبُد۔

میں نے جلدی سے اپنا گلاس اٹھایا اور پی گیا۔ مجھے ڈر ہوا، آج کی اُلٹی اور بے چینی اور پھٹتی ہوئی طبیعت کہیں بھاگ نہ جائے۔ کہیں مسکراہٹ کے دن نہ آجائیں۔ مسکراہٹ کو جڑ سے کھود ڈالنا ہے۔ میں نے کندن سرکار کی طرف دیکھا، آج میرا آخری دن ہے۔ آج کے بعد مَیں تمھارا گھنٹا نہیں رہوں گا۔ کندن سرکار! کندن سرکار کو اس کا کیا پتا۔ وہ اطمینان سے پی رہا تھا۔ پھر ابھی شہر میں بہت سے لوگ موجود تھے اُس کا گھنٹا بننے کے لیے۔

کندن سرکار نے گھڑی دیکھی، بیرے سے کچھ کھانے کو منگوایا اور مجھے دھیمے سے بتایا: "وقت ہو گیا ہے، اب چھوکری آنے کی گانا گانے۔"

"ٹھیک ہے، چھوکری کو آنے دو،" میں نے کہا۔

کندن سرکار نے بچی کھچی شراب بھی گلاسوں میں نکال دی اور میں کرسی ٹھیک کر کے، ڈائس کی طرف منہ کر کے، اس طرح بیٹھ گیا جیسے سامنے فلم ہونے والی ہو۔ میری نظر کے سامنے ایک عورت کی گھٹنے برابر اونچی، کالی کھوپڑی آ گئی تھی، اس لیے میں نے کرسی ٹھیک کی۔ اسی دوران کچھ مضبوط اور سندر غنڈے آئے اور ہال کا پورا چکر مار کر واپس کہیں اندر چلے گئے۔ شاید وہ جانچ پڑتال کرنے آئے ہوں گے۔ سب سے پہلے میں نے سوچا، یہ لوگ مال کے چکر میں ہیں، مگر نہیں، وہ لوگ صرف ذمے داری دکھاتے ہوئے چلے گئے۔ جیسے فوج خاص مقصد سے، جنتا کے لیے سڑکوں پر پریڈ کرتی ہے۔

لڑکی فراٹے سے ہال میں آئی۔ لگتا نہیں تھا کہ وہ چل رہی ہے، وہ تیر رہی تھی۔ ڈائس پر جانے سے پہلے وہ سب طرف گھومی، جیسے بچے کاغذ کا ہوائی جہاز ہوا میں اُڑاتے ہیں۔ اُس کا چہرہ تروتازہ تھا اور وہ چھوٹی سی لڑکی لگتی تھی۔ اُس کے دھڑ پر ڈیڑھ فٹ کا بے حد کسا ہوا ایک سنہرا کُرتا تھا۔ وہ کافی لول طریقے سے

Scanned with CamScanner

گھومتے ہوئے گاتی رہی۔ حرام زدگی اُس کی آنکھوں اور استھنوں پر دیکھی جا سکتی تھی۔ گاتے ہوئے وہ اکثر کندھوں کے زور سے استھنوں کو پرندوں کی طرح ہال میں اُچکانے کا کھیل کرتی تھی۔ دراصل یہ اُس کی ٹرک تھی اور اس کے بعد وہ دونوں ہاتھ ملا کر اطمینان سے آگے کے بول یاد کرتی تھی۔ اُسے اپنے پیٹے اور ہوتی ہوئی رات کا بالکل ڈر نہیں تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے چہرے سے آرکسٹرا کے ساتھیوں کو اُکساتی اور شرابور کرتی چلتی تھی۔

ریستوراں لذّت سے بھر گیا تھا۔ سوفوں میں دھنسے ہوئے لوگ بغیر آواز کیے باتیں کر رہے تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ بکری کی لینڈی کے ناپ سے زیادہ کبھی اُن کا منہ کھلتا رہا ہوگا۔ مرد سمجھ رہے تھے کہ گاتی ہوئی لڑکی ویشیا ہے یا چوٹی برابر، اور اُن کی عورتیں ویشیا نہیں ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں بیڈروم سین چمک رہا تھا۔ دراصل یہ اپنی بیویوں کو دکھا رہے تھے کہ دیکھو تمہارے علاوہ اَور بھی مل سکنے والی چیزیں ہیں۔ عورتیں بھی چپ نہیں رہتیں۔ کہتی ہیں: "وہ دیکھو، لیفٹ کارنر والی میز۔ نیلی جارجٹ کے بغل والا نوجوان کتنا اسمارٹ لگتا ہے ڈارلنگ!" "ابھی اُس کا اسکواڈرن لیڈر کا پروموشن نہیں ہوا ہے۔ جونیئر ہے مجھ سے۔" "اس سے کیا! وہ چست اور خوب صورت ہے، اور اسکواڈرن لیڈر ہو جانے پر تو اَور ہو جائے گا۔"

ہم سے تھوڑا ہٹ کر، تیسری ٹیبل پر، نہایت لمبی سوئیوں جیسی مونچھوں والا ایک اَدھیڑ عمر آدمی بیٹھا تھا۔ بیچ بیچ میں، لوگوں کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر، وہ مونچھ کی نوک سے اپنے ساتھ والی عورت کا گال گدگدا دیتا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ آرکسٹرا ڈائس کی طرف دیکھنے لگتا تھا، یہ دکھاتے ہوئے جیسے مونچھ اور گال کا کھیل غیر ارادی ہے۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے ڈائس پر ایک عجیب بات ہوئی، اُس لڑکی کے ساتھ جو گا رہی تھی۔ اُس کی شلوار کا ناڑا، لگاتار پمپس چلانے یا جلد بازی میں پہننے کی وجہ سے سنہرے لباس کے نیچے لٹک آیا۔ اُس کے نیچے اور اوپر کے لباس کے مقابلے میں وہ میلا کچیلا لگ رہا تھا۔ سنگیت کے ساتھ اب یہ ناڑا بھی ہل رہا تھا۔ میں بھنبھنا کر ہنس پڑا۔ یہ دل کے علاقے سے نکلی ہنسی تھی، بالکل بے قابو۔ وہ کافی گنوار لگ سکتی تھی اور کسی بھی وقت آدمی کو ایسے مقام پر بھگا سکتی تھی۔ کندن سرکار چونک پڑا۔ اسے کافی شراب کے بعد بھی جگہ کا ہوش تھا اور اُسے میری ہنسی ناگوار گزری۔ یہ ہوش ایسا ہے جو سب کچھ کے بعد بھی زندگی کو محفوظ رکھتا ہے اور اُسے ہر حادثے سے بچاتا رہتا ہے۔ کندن سرکار نے مجھے بُری طرح گھُرک دیا۔ "ادب سے رہو، یہ اونچی جگہ ہے۔ تم نے دیکھا، تمہارے علاوہ یہاں کوئی ہنسا ناڑے پر؟ مہذّب ہونے کی وجہ سے یہاں بیٹھے ہوئے لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ اُنھیں کا ناڑا ہے جو وہاں لٹک گیا ہے۔" پھر وہ رعب سے بولا: "تم نے شاید اسے پیٹرولا سمجھ لیا ہے۔"

"چپ بے!" میں کھڑا ہو گیا۔ پیٹرولا کا نام مَیں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہاتھ میں کوکا کولا کی گردن تھی۔ وہ کھٹ سے چاپلوس ہو گیا۔ "میرے دوست، تمھیں نشہ ہو گیا ہے۔ نیمبو کا پانی منگاتا

ہوں۔" اُس نے مجھے پُچکار کر بٹھا دیا۔ پہلی بار اُس نے میرے ساتھ اپنی شائستہ زبان کا استعمال کیا اور پہلی بار اپنا مہذب پن ظاہر کیا۔ جو بھی ہو، اُس نے میری بیش قیمت ہنسی دبوچ لی تھی۔

میرا اشتعال پوری طرح ٹھنڈا نہیں ہوا۔ طبیعت کا رُخ ہی بُری طرح پلٹ گیا۔ آگ کے لیے گھی اور پانی دونوں لیے ہوئے میں اس طرح بیٹھا رہا جیسے اکیلا ہوں اور سامنے کندن سرکار ایک کرسی کی طرح رکھا ہوا ہے۔ مجھے اُس کی ڈانٹ ڈپٹ کا بہت دکھ ہوا۔ میں کندن سرکار کے پاس شراب کا لطف اٹھانے آیا تھا، ڈانٹ ڈپٹ سننے نہیں، لٹریری بات چیت کرنے اور بُدھی مروانے نہیں آیا تھا۔ کندن سرکار کے لیے بے حیا مسرا چاہیے۔

افسوس اور غصّے کا عجیب کاک ٹیل دماغ میں بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف گدڑی گدڑی چھیچھالیدر دکھائی دے رہا تھا۔ پتا نہیں کہاں گم ہو گیا ہے میرا جنگلی پن اور زندگی کا بھبھکا۔ بس چھچھورپن بچا ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک ٹھوٹھو۔ اندھیرا غرّاتا ہوا پھیل رہا ہے۔ بھِن بھِن بھِن، دماغ بھنبھنا رہا ہے۔ اچانک میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو مخاطب کرنے لگا: "اے فوجی مچھرو اور نازنینو! دور نہیں ہے وقت۔ تہذیب پلٹ کر وہ رپوٹا دے گی کہ تم لوگوں کی لینڈی تر ہو جائے گی۔ پکڑے پکڑے پھرو گے۔ یہ جو رائفلیں تمہارے پاس ہیں اور جو صرف تمہارا پیٹ ڈھو رہی ہیں، تمہاری نہیں رہیں گی۔ بھاگو، بھاگو! رائفل کا کام پیٹ ڈھونا نہیں ہے۔"

ہاں نہیں تو! دس سال برباد ہو گئے، کبھی اُلٹی کبھی مسکراہٹ، کبھی مسکراہٹ کبھی اُلٹی، بس یہی لدھڑپنا۔ وطن کے لیے موٹی تنخواہ کاٹتے اِن تَرلوگوں اور سنگیت نایکا بنی نخاس کی اِس رنڈی کو کچھ بھی پروا کیوں ہو۔ یہ سمجھتی ہے کہ سارا ملک جیسے ناری کے ایک سینٹی میٹر والے فلاں پردیش ہی میں گھسڑ جانے کا انتظار کر رہا ہے۔ تھوڑا ٹھنڈا ہونے پر مجھے خیال آیا، باہر کے سیکڑوں تندرست نوجوان سب کچھ چھوڑ کر برسوں سے گمٹیوں کے نیچے گانجے کا لپّا لگا رہے ہیں۔ اُف! لیکن گانجے کا راستا کبھی پورا نہیں ہو گا۔

ریستوراں کے ہال میں بدامنی بھرتی جا رہی ہے۔ وہاں بیٹھے لوگ خطرے میں پھنس رہے ہیں۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی اور ایک گاڑھے سپنے میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ رگوں میں لہو بے خوف ہوتا جا رہا ہے۔ آرکسٹرا کان میں بڑا سست لگ رہا تھا، سُن سُن کرتا ہوا۔ لڑکی کسی طرح ڈوبتی لَے میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ دماغ میں کوئی نامعلوم اور چپ چاپ طریقہ چل رہا تھا۔ اندر وضرور آیا ہو گا، یہ آخری وقت ہے۔ اس کے بعد اگر یوں ہی پڑے رہے تو سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔ ایکا ایک کیا ہوا، میری مٹھی اپنے آپ جکڑ گئی، آپے سے باہر ہو گئی۔ کندن سرکار نے پھُرتی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا چاہا، وہ مجھے تاک رہا ہو گا، لیکن تب تک کوکا کولا کی بوتل مٹھی سے باہر ہو چکی تھی، بے حد جھنجھناتے شور کے ساتھ۔ سامنے کانچ کی دیوار ٹوٹ پھوٹ گئی۔ میں جاگ سا گیا اور دیکھا ڈائس پر سے لڑکی بدحواس، "پولیس پولیس" چلاتی، بھاگ رہی ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی ایک دم سے گرین روم سے باہر آتے ایک غنڈے کی گود میں گر گئی۔ میں نے اپنی ٹیبل اُلٹ دی اور کمانڈر کی طرح لوگوں کے سامنے تنا ہوا چلّانے لگا: "چلے جائیے آپ لوگ یہاں سے،

Scanned with CamScanner

نہیں تو دھر دیا جائے گا" اور پتا نہیں کیا کیا۔

جب مجھے ہوش آیا اُس وقت بھی مار پڑ رہی تھی۔ تین چار غنڈوں کے بیچ مجھے اِدھر سے اُدھر دھکا دیا جا رہا تھا۔ ایک آدمی ڈانٹتے ہوئے تماشا دیکھنے والے لوگوں کو اپنی اپنی جگہ بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ایک غنڈا ڈری ہوئی گایکا کو سہارا دے کر ڈائس پر لایا اور وہاں چوکیدار کی طرح مستعد کھڑا ہو گیا۔ اُس نے لڑکی کا فالتو لٹکتا ہوا ناڑا ہاتھ سے اُٹھایا اور گایکا نے اُسے خود ہی اندر کھونس لیا۔ میری پٹائی کی نگرانی کرنے والا جو نمایاں شخص تھا اُسے لوگ کلو گرُو کلو گرُو کہہ رہے تھے۔ جس طرح سے فٹافٹ حادثے کا ملبہ صاف کیا جاتا ہے، اُسی طرح بکھرے ہوئے کانچ کو اور مجھے ہٹانے کی بھاگ دوڑ ہو رہی تھی۔ کلو گرُو نے چوتڑ پر ایک ہی لات دی کہ میں سیڑھیوں کے دہانے تک لڑکھڑا گیا۔ میں نے بیچ بچاؤ اور مدد کے لیے کندن سرکار کو کھوجا، مگر وہ پتا نہیں کب کھسک چکا تھا۔ میں نے "کندن کندن" آوازیں بھی دیں، تب تک کلو گرُو نے کندن کے نام پر مجھے ایک گھونسا اور جڑ دیا۔ میرے جبڑے خون میں لت پت تھے۔ جس ٹیبل کا پایہ پکڑ کر میں اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، وہاں ایک بے حد مہذب اور ڈرا ہوا شخص سکون کے انتظار میں تھا۔ اُس نے ساتھ کی عورت کے کان میں کہا: "ہی لکس لائیک اے لوفر۔" عورت بڑی دلیری کے ساتھ خوش تھی۔ اُس پر کوئی فرق نہیں پڑا، وہ مجھے دیکھ کر مند مند مسکراتی رہی۔

میں اپنے چوتڑ پر دوسری لات کھانے کی حالت میں نہیں تھا۔ میں جلدی سے اٹھا اور زینہ اُترنے لگا۔ مجھے دھیان ہے، میں کہیں بیچ میں ہی رہا ہوں گا کہ اوپر ساز بجنے لگا تھا۔ دو ہی تین منٹ میں امن قائم ہو گیا۔ نیچے گیٹ مین نے دروازہ کھولا اور سلام مارا۔ اُسے کیا پتا تھا کہ یہ سلام والا آدمی نہیں اُترا ہے۔ وہ بے خبر شخص تھا۔

ایک طرح سے کندن سرکار کا گھنٹا سڑک پر گر پڑا۔ جس طرح بھیڑ بھری سڑک پر سائیکل سے گرنے والے کو چوٹ نہیں لگتی، ویسی میری حالت تھی۔ جھاڑ پونچھ کر میں سڑک پر آیا جو کافی سنسان تھی۔ انقلاب کی ترنگ غائب ہو چکی تھی۔ ناک سے لار کی طرح زکام گرنے لگا۔ چلتا ہوا میں اپنی پرانی جگہ پیسٹرولا کے ساتھیوں میں پہنچا۔ مجھے دیکھ کر اُنھوں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کے علاوہ کوئی بُرا سلوک انھوں نے نہیں کیا۔

**

اُدے پرکاش

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

رام سجیون کی پریم کہانی

جہاں کئی برس پہلے گاؤں تھا اور جہاں بیلوں کے تیل چُپڑے بھولے کالے سینگ تھے، دوپہر کے جنگل میں پتوں کی گھری بَری خوشبو تھی اور کچے آم کی تازہ کٹی پھانک کے ساتھ نمک مرچ کا سواد تھا، دھان کے مہکتے ہرے کھیت تھے، جہاں اندھی بُڑھیا مہراجن تھی جس کی باڑی سے لڑکے کھیرا اور بھُٹے چُرا لاتے تھے۔۔ رام سجیون کا بچپن وہیں پیچھے کہیں چھُوٹ گیا تھا۔ پندرہ سال پیچھے۔

اُن کا بچپن سنئی کے اُن کھیتوں میں کہیں رہ گیا تھا جہاں وہ اسکول نہ جا کر چھپ جاتے تھے اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ گدھا چھاپ بیڑی کے سُٹے کھینچتے تھے۔

برہمن گھرانا تھا۔ اوسط کسان طبقہ، ایک ایسا طبقہ جس کی گاؤں میں ناک نیچی نہیں رہتی۔ جو گاہے گاہے بڑے کسان یا زمیندار کو بھی چھوٹا موٹا قرض دے سکتا ہے یا پیشی کچہری میں ہزار دو ہزار خرچ کر سکتا ہے۔ ہل واہوں یا بے زمینوں کو تو غلہ اناج وہ بیج بھرایا بیماری ناتوانی کے لیے سوایا ڈیوڑھا باڑھی پر دے ہی سکتا ہے۔

ایک ایسا کسان گھرانا جہاں گاؤں کے زمیندار کے گھر آیا ہوا پٹواری کوٹتے ہوئے ایک بار جھانک کر چائے پان لے جاتا ہے، تھوڑا بہت ہنسی ٹھٹھول بھی کر جاتا ہے۔

رام سجیون پاس کے قصبے کے ہائی اسکول اور پاس کے شہر کے گورنمنٹ کالج کو فرسٹ ڈویژن میں لانگھتے ہوئے اب دلّی کی اُس یونیورسٹی تک آ پہنچے تھے جو ملک ہی کی مانی ہوئی نہیں، کہا جاتا تھا کہ افریقا، جنوبی ایشیا کی تو کیا پوری تیسری دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی۔ اس یونیورسٹی میں پرائم منسٹر کی بہو، ڈیفنس منسٹر کی نواسی، کرلوسکر جی کی بیٹی، باٹا جی کا بیٹا اور ملک سے سب سے بڑے ادیب کا سب

Scanned with CamScanner

سے بڑا سالا پڑھتا تھا۔

یہاں زیادہ تر لڑکے لڑکیوں کے رہن سہن اور مزاج کا اپنا ہی ڈھنگ تھا۔ وہ بڑے نرم و نازک، شفاف اور خاص لگتے۔ ہنستے تو اتنا اُجالا پھیلتا کہ گاؤں کی ہنسی، تمباکو اور کتھے میں لتھڑی، رونے پیٹنے کی طرح بدصورت دکھائی دیتی۔

اور لڑکیوں کا تو کہنا ہی کیا۔ اُن کا تو الگ ہی ٹمپریچر اور الگ ہی روشنی تھی۔ وہ زیادہ تر جینز اور کھلی بانہوں والی ہوتیں۔ اُنھیں بہت صاف سفید آٹے کو گوندھ کر، اُس میں تھوڑا مہاور(۱) ملا کر بنایا گیا تھا۔ کھلی بانہیں، باریک آوازیں، گھنٹیوں جیسی ہنسی کا اتنا بڑا میلہ رام سجیون کو اپنی زندگی کی بابت ایک بار نئے سرے سے غور کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ چاہے بس میں ہوں یا اپنے اکیلے کمرے میں، سانس بھی لیتے تو اُس کے ساتھ اُودُو یا انٹی میٹ کی مہک ان کے لہو تک پہنچتی۔ اس خوشبو میں کانونٹ کے پسینے کی بہت اجنبی لیکن اُکسانے والی خوشبو گھُلی ہوتی۔

لیکن رام سجیون کے اندر ایک گہری چڑ اور غصّے نے بھی جگہ بنانی شروع کر دی۔ اس بڑے، لق دق شہر میں، جہاں اتنی بڑی دکانوں، کوٹھیوں، کاروں کی چماچم دھوپ تھی، اُنھیں اپنے گاؤں کا بڑے سے بڑا کسان بھی قلی کباڑی دکھائی دیتا۔ اپنے ٹیریکاٹ کے کپڑے اُنھیں سستے، میلے اور پچھڑے ہوئے لگتے۔ اپنے چہرے میں گال کی ہڈیوں کا نکیلا اُبھار، موٹے ہونٹ، دُھوپ اور دُھول کو جھیل کر زندہ اور چوکنی بنی آنکھیں، تِل اور سرسوں کے تیل کو پی کر موٹے اور کالے پڑے بال -- سب اُنھیں گنوارُو لگتے۔ وہ کالے تو نہیں تھے، پھر بھی اُنھیں لگتا تھا کہ اُن کے گیہوئیں رنگ سے گاؤں کا مٹیالاپن کبھی چھُوٹ نہیں سکتا۔

دلّی ایک ایسا مہانگر تھا جہاں روپوں کی ندی کہاوت کے باہر بہتی تھی۔ دوسرا کوئی اتنا بڑا شہر رام سجیون نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ ایک بار، جب وہ بالکل نئے تھے، ایک لڑکے سے اُنھوں نے اُس کے جوتے کی قیمت پوچھی۔ دو سو اڑسٹھ روپے سن کر جوتا ایک کوئنٹل گیہوں کے بورے میں بدلتا دکھنے لگا۔ پھر تو اُن کے دیکھنے کا یہ پوشیدہ طریقہ ہی ہو گیا۔ اکنامکس کے مال کے بدلے مال کے اصول کے مطابق وہ چیزوں کو کسی بھی اناج کی قیمت کے عدد میں بدل دیتے۔ اُنھیں بہت مزہ آتا۔ اس آدمی نے کل ملا کر تین کوئنٹل دھان پہن رکھا ہے۔ اس لڑکی نے پچاس کلو گرام اَلسی اپنی کلائی میں لپیٹ رکھی ہے۔ مکان کا کرایہ ساڑھے تین کوئنٹل گیہوں ماہانہ۔ بجلی پانی الگ، اور وہ دیکھو، وہ سالا بیرو بیس ایکڑ کی کُل پیداوار پر چڑھا ہوا، بارن بجاتا بھاگا جا رہا ہے۔

لیکن یہ سب ایک دلچسپ، تفریحی کھیل ہی نہیں تھا، یہ بہت گمبھیر اور دردناک تھا۔ گاؤں کا اوسط

---

(۱) مہاور: وہ سرخ رنگ جس سے عورتیں پیروں کو مہندی کی طرح رنگتی ہیں۔

کسان طبقہ، شہر کے نچلے درمیانی طبقے سے بھی نیچی حیثیت کا ثابت ہو رہا تھا۔ کسی دفتر کا چھوٹا موٹا بابو بھی معیارِ زندگی اور رہن سہن کے لحاظ سے زیادہ خوشحال اور چمکدار دکھائی دیتا تھا۔

رام سجیون کے دماغ میں سماجی مساوات کے لیے ایک شدید خواہش جاگنے لگی۔ یہ سب ناانصافی ہے، اس دیش کی ستر فیصد جنتا کو زندہ رہنے کے لیے جتنی کیلوریز طاقت کی ضرورت ہے، اُتنا بھی اناج نہیں کھا پاتی، اور دوسرا ساڑھے تین کوئنٹل گیہوں کی شراب ایک بیشک میں پی جاتا ہے! رام سجیون کو پُرانی دلّی کے جامع مسجد والے علاقے کے فٹ پاتھوں پر، پُلیا کے نیچے، اپنے گاؤں کے لوگ دکھائی دیتے۔۔ اُتنے ہی غریب، اُتنے ہی میلے، اُتنے ہی بھوکے۔ "انقلاب کی ضرورت ہے،" بابو رام سجیون نے سوچا۔

یہ اُنھیں دنوں کی بات ہے جب بنگال کے شمال مشرقی علاقے، جنوب میں آندھرا پردیش اور بہار اُتر پردیش کے بھوج پور علاقے میں بےزمین اور چھوٹے کسان مل کر تحریک شروع کر چکے تھے۔ اُنھیں پولیس مقابلوں میں مارا جا رہا تھا، جیلوں میں بھرا جا رہا تھا، سرِعام اُن کی آنکھیں پھوڑی جا رہی تھیں اور اخباروں کے صفحوں میں ایسی خبریں بھری رہتی تھیں۔

رام سجیون کو لگا کہ اُن کے دل میں بچپن ہی سے غریبوں اور بےچاروں کے لیے گہری ہمدردی رہی ہے۔ انھیں کئی واقعے ایسے یاد آئے جب وہ اپنے گھر سے مکئی اور چاول چُرا کر کولیوں کے گھر میں دے آتے تھے جہاں کئی دنوں سے چولھا نہیں جلا ہوتا تھا۔ اپنے پُرانے کپڑے تو وہ گاؤں کے لڑکوں کو دے ہی دیتے تھے۔

سوجھ بوجھ اور دانائی رام سجیون میں بہت تھی۔ انھوں نے سماج کو جاننے سمجھنے کے لیے طرح طرح کی کتابیں پڑھنی شروع کی، "سرمایہ" پڑھ ڈالی، "اینٹی ڈیوہرنگ"، "ایٹینتھ برومیر آف لوئی بوناپارٹ"، "ہولی فیملی" سے لے کر لینن اور ماؤ کے خیالات تک کا مطالعہ کیا، اور دھیرے دھیرے سماج کا ایک خوب صاف نقشہ اُن کے دماغ میں بننے لگا۔

لیکن گاؤں چھوڑے دس سال ہو رہے تھے۔ فیلوشپ ملتی تھی، اس لیے وہاں جانے کی ضرورت کبھی ہوئی نہیں، اور دھیرے دھیرے گاؤں کے لوگوں کے مٹیالے اور کرخت چہرے اُن کے دماغ میں دھندلے اور بےشکل ہونے لگے۔ کھیت غائب ہوئے، چیزوں کو غلّے میں بدل کر دیکھنے کا پُرانا کسانی ڈھرّا بسر گیا۔ بلوا ہوں کے پسینے کی جانی پہچانی گندھ، بکریوں کی بُو کے ساتھ پتا نہیں کہاں اُڑ گئی۔ اب اُن کے دماغ میں سماج کی طبقاتی بناوٹ تو صاف تھی، لیکن لوگوں کے چہرے غائب ہو چکے تھے۔

یونیورسٹی کا ہوسٹل تھا جس میں رام سجیون رہتے تھے۔ جینز پہنتے تھے، اُس کے اوپر کُرتا اور داڑھی۔ چشمہ لگانے لگے تھے۔ یونین میں فعال تھے اور یونین کے عہدے دار اُنھیں بہت بڑا مفکّر اور ادیب مانتے تھے۔ رام سجیون تیسری دنیا کی سب سے ماڈرن یونیورسٹی میں رہتے ہوئے اودھ کی کسان تحریک پر پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔

رام سجیون کا کمرہ بھی دیکھنے لائق تھا۔ اُس میں کبھی جھاڑو نہیں لگتی تھی، گرد اور مکڑی کے جالوں کے

Scanned with CamScanner

بیچ کچھ کتابیں اور اخبار بکھرے رہتے۔ رضائی پرانی تھی اور جب وہ سوتے تو اُس کی روئی اُن کی داڑھی اور بالوں میں اُلجھ جاتی۔ وہ بارہ بجے سو کر اُٹھتے، کمرے ہی میں زیادہ تر رہتے اور سماج کے بارے میں مضمون وغیرہ لکھا کرتے۔ فیلوشپ اس دوران میعاد پوری ہو جانے کی وجہ سے بند ہو گئی تھی، اس لیے مالی رکاوٹ پڑنے لگی تھی۔ جتنی زیادہ مالی دشواری ہوتی، رام سجیون خود کو جنتا کے اور نزدیک پاتے۔ اُن کے مضامین میں نابرابری کے خلاف آگ اور تیز ہو اُٹھتی۔ اُنھوں نے ہوسٹل کے کمرے میں رہتے ہوئے جنتا سے جُڑنے، تجربے اور آفاقیت کی سطح پر محنت کش طبقے میں خود کو جذب کرنے کے لیے ڈی کلاس ہونے کی ضرورت کے بارے میں لکھا۔

لیکن وہ محنت نہیں کرتے تھے، محنت کرنے والوں کے بارے میں لکھتے ضرور تھے۔ مہینوں تک کپڑے نہیں دھوتے تھے۔ نہاتے نہیں تھے۔ داڑھی پر تو خیر مزدور طبقے کا عوامی پن لاگو ہو ہی چکا تھا۔ اپنے کمرے کی صفائی ستھرائی پر اُن کا دھیان نہیں جاتا تھا۔ اُنھیں دیکھ کر یہ ضرور لگتا کہ وہ ڈی کلاس ہو چکے ہیں۔

اور تبھی تیسری دنیا کی اُس سب سے بڑی یونیورسٹی کی انتظامیہ نے طلبا کے مطالبے کو دھیان میں رکھتے ہوئے، دوسری یونیورسٹیوں کے سامنے ایک آئیڈیل مثال پیش کی۔ کو ایجوکیشن کے ساتھ ساتھ "کوڈوِیلنگ" (co-dwelling) کی مثال۔

جس ہوسٹل میں رام سجیون رہتے تھے اُس کا آدھا مغربی حصّہ لڑکیوں کے رہنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ ہوسٹل انگریزی کے ایچ کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ جنوب کی طرف کی ڈنڈی میں لڑکوں کی تین منزلہ عمارت تھی جس کی ہر منزل پر سو کمرے تھے، شمال والی ڈنڈی کے کمروں میں لڑکیاں رہتی تھیں اور دونوں کو جوڑنے والے بیچ کے ڈنڈے میں میس تھا جہاں لڑکے لڑکیاں بریک فاسٹ، لنچ اور ڈنر لیتے تھے۔ اس طرح بیل گاڑیوں اور اسی فیصد بھکڑوں کے دیش میں وہ یونیورسٹی سکیس کے کسی تعلیمی ادارے کی طرح ساتھ پڑھنے، ساتھ رہنے اور ساتھ کھانے کے ہوائی راستے پر اُڑ چلی۔

یونیورسٹی کے زیادہ تر لڑکے لڑکیاں ہیلو ہائے والے طبقے سے آتے تھے، یعنی ایسے اونچے طبقے سے جہاں کانونٹ کے پس منظر کے علاوہ ناچ گانا اور ہنسنا رونا بھی اُسی طرح کا ہوتا ہے۔ رام سجیون نے بڑی محنت، مشق اور لگن سے انگریزی کا علم حاصل کیا تھا لیکن وہ سمجھتے تو خوب تھے، بولنے میں اُن کا خاص بہاری لہجہ آڑے آ جاتا تھا۔ "اے بھیری گڈ ایوننگ" (a very good evening) جیسے فقرے تو وہ بچا لے جاتے، لیکن بچپن سے "و" کی جگہ "بھ" کی رٹائی اُن کی جیبھوا کی تہذیب کی جڑوں تک بیٹھ چکی تھی۔ اُنھیں کبھی کبھی لگتا کہ تہذیب کچھ خاص معنوں میں شعور سے زیادہ جسم کو پکڑتی ہے۔ ان کا شعور سلائس کا تقاضا کرتا لیکن جیبھ کڑھی مانگ بیٹھتی۔

ایچ کی جنوبی ڈنڈی کی سب سے اوپری منزل کے کمرہ نمبر تین سو آٹھ کی بالکنی میں رام سجیون کھڑے تھے۔ ایچ کی شمالی ڈنڈی کی سب سے اوپری منزل کے کمرہ نمبر تین سو سولہ کی بالکنی میں وہ لڑکی

Scanned with CamScanner

نکل آئی تھی جو اُدھر رہتی تھی۔ دونوں بالکنیاں آمنے سامنے تھیں۔ رام سجیون نے آخر اُدھر دیکھا۔ وہ لڑکی اُنھیں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں بڑے جسمانی انداز سے لگ بھگ ایک دوسرے کا بدن سہلاتے ہوئے ملیں اور اس جسمانی لمس سے نکلتی حرارت سے رام سجیون پر کپکپی چھا گئی۔ ماتھے اور ناک کی نوک پر پسینے کی بوندیں جھلملا اُٹھیں۔ یہ کلاسیکی شاعری کے شرنگار رس کے آثار تھے۔ اب غش کھانے کی باری تھی، جس سے رام سجیون بچے۔ انھوں نے خود کو بے نیاز، سنجیدہ اور کچھ کچھ لاابالی سا بنایا۔ لڑکی تھوڑی دیر تک بالکنی میں رہنے کے بعد اندر چلی گئی۔ اس بیچ رام سجیون اپنی بالکنی سے ہٹے تو نہیں، لیکن اُنھوں نے پھر اُس لڑکی کی سمت نہیں دیکھا۔ ہاں، اُس کی موجودگی کو وہ کبھی اپنی پیٹھ پر اور کبھی اپنی کنپٹی پر محسوس کرتے رہے۔ وہ لڑکی اُنھیں ایک اُجلی ہری پرچھائیں کی طرح لگ رہی تھی جو اچانک بہت مانوس، گھریلو اور گہری ہو اُٹھی تھی۔

دوپہر کو میس میں کھانا کھاتے ہوئے انھوں نے چاروں طرف محتاط اور مشتاق آنکھیں دوڑائیں، لیکن کہیں کچھ نہیں۔ بہت سی لڑکیاں کھا رہی تھیں لیکن معاملہ جادوئی بن گیا تھا۔ ایک نظر میں اُنھیں ساری لڑکیاں بالکنی کی لڑکی لگنے لگتیں اور دوسرے ہی پل ہر لڑکی کوئی اَور ثابت ہو جاتی۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ یہ کھیل محو ہو کر کھیلتے رہے۔

رام سجیون کمرے ہی میں تھے جب اُن کے من میں ایک سنگیت بھرے، میٹھے شُبھ نے آنکھیں کھولیں۔ وہ لڑکی اپنی بالکنی پر تھی اور یقینی طور پر رام سجیون کی بالکنی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں اندھیرا کر کے کھڑکی سے اُسے پوری اپنائیت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ رنگ خوب گورا، آٹے اور مہاور والا بھی نہیں، مکھن اور گلاب والا۔ بہت ہلکا سفید بنیان جیسا "ٹاپ"، کھلی باہیں، نیچے تک کھلا ہوا گلا، جانگھوں پر فیڈ ہوئی جینز کی امپورٹڈ نیلی پینٹ۔ عمر بیس کے اِدھر یا اُدھر۔ اُنھیں لگا کہ جیسے اجنتا کی کسی یکشنی کو ماڈرن کپڑے پہنا دیے گئے ہوں۔ اِس لڑکی کے گلے میں آواز کیسی ہو گی اور ہندی کتنی بدل کر، اُودُو میں ڈوب کر نکلے گی۔

وہ بالکنی میں نکلے۔ لڑکی غضب ہمت اور بے فکری سے اُن کی طرف تاک رہی تھی۔ تہذیب کا فرق ہے۔ محلّے گاؤں کی ہوتی تو آنکھ نہ اُٹھاتی یا نیچے والا پارک دیکھنے لگتی۔ آہ، یہ ایک لڑکی کی آنکھ تھی، بہت کچھ سمجھا دیا اس نگاہ نے، کتنے کتنے معنی اس میں تھے۔ یہ تعارف تھا -- پہلا۔ بابو رام سجیون کو بچپن میں دیکھی رام لیلا کا جنک واٹکا (۲) کا منظر یاد آ گیا اور پھر جے شنکر پرساد، میتھلی شرن گپت سے ہوتے ہوئے وہ شمشیر (۳) تک پہنچے:

---

(۲) جنک واٹکا: رام چندر جی کے باپ راجا جنک کا باغ۔

(۳) جے شنکر پرساد، میتھلی شرن گپت اور شمشیر (بہادر سنگھ): ہندی شاعروں کے نام۔

Scanned with CamScanner

ہاں تم مجھ سے پیار کرو
جیسے ہوائیں میرے سینے سے کرتی ہیں
جس کو وہ گہرائی تک دبا نہیں پاتیں
جیسے مچھلیاں لہروں سے کرتی ہیں---

تم مجھ سے پیار کرو
جیسے میں تم سے کرتا ہوں
آئینو، روشنائی میں گھُل جاؤ
اور آسمان میں مجھے لکھو اور مجھے پڑھو
آئینو، مسکراؤ اور مجھے مار ڈالو
آئینو، میں تمھاری زندگی ہوں

لڑکی جا چکی تھی اور اب وہ نیرودا میں کھوئے ہوئے تھے: Today I can write saddest lines

صبح کو انھوں نے ہوسٹل کے شمالی گیٹ کے چوکیدار کماؤنی دھیرج سنگھ نیگی سے پوچھا کہ کیا وہ کمرہ نمبر تین سو سولہ میں رہنے والی لڑکی کے بارے میں جانتا ہے، تو اُس نے کہا، "اُس کو کون نہیں جانتا- وہ تو لندن سے آئی ہوئی ٹھہری یہاں- پتا کینیا میں بہت بڑی فیکٹری چلانے والے ہوے، کہا- یہاں آنے کے پہلے بے بی لندن میں سات سال پڑھ کے آنے والی ہوئی- بڑا میٹھا سُبھاو پایا اُس نے، کہا- سی پی ایچ میں ریسرچ کرنے والی ہوئی-"

یہ تو "کپ" نام کے ناول سے نکلا آدمی معلوم ہوتا ہے، رام سجیون نے سوچا- "نام کیا ہے اُس کا؟" اُنھوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا-

"پنڈت جی، تمھارا ارادہ تو نیک ہی دیکھے مجھے- نام اُس کا ہوا انیتا چاندی والا- گجرات کی ہوئی- پر گجراتی نہ جاننے والی ٹھہری- ہندی بولنے میں بھی جگہ جگہ رکنے والی ہوئی-"

پھر چوکیدار دھیرج نے اُن کی طرف دیکھا- بیڑی کا گہرا سُٹا کھینچ کر دھواں نکالتے ہوے ہنسنے لگا- کھانسی اور ہنسی کے بیچ اُس نے بائیں آنکھ دبائی اور کہا، "مال لیکن اصلی پٹاخا ہوا ٹھہرا-"

لمپن (lumpen) ہے یہ، رام سجیون نے سوچا- مزدور طبقے کے ایسے لوگوں میں طبقاتی شعور پیدا کرنے کے لیے ابھی بہت گہری تعلیم کی ضرورت ہے- بھارت کی کمیونسٹ پارٹیاں یہی کام نہیں کر رہی ہیں، اسی لیے تو مزدوروں، کسانوں اور چھوٹے ملازمین میں ان کا اثر نہیں ہے- اب اس فورتھ کلاس کے ملازم چوکیدار ہی کو دیکھو، اُس کی یہ سخت عورت دشمنی روایتی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ سماج کے

Scanned with CamScanner

استحصالی نظام کی دین ہے۔

رام سجیون غصّے میں وہاں سے چلے گئے۔ اس پیچیدہ مسئلے پر سوچتے ہوئے کہ ایسے لوگوں کے طرزِ عمل کا ذمے دار اُن کے معاشی اور سماجی پس منظر کو ٹھہرایا جائے یا اُن کے ذاتی شعور، تہذیب، خیالات اور رویے کو۔

انیتا چاندی والا۔ اس پورے نام میں ایک سنگیت ہے۔ انیتا -- آنی، آنو، آنُو-- اس کے کئی روپ ہو سکتے ہیں۔ "چاندی والا" سَر نیم اس سپنے جیسے نام کو زمینی اور بھاری بھر کم بنا دیتا ہے۔ اب رام سجیون کے دن کا زیادہ تر وقت سامنے کی بالکنی کو دیکھنے اور اس نام کو اکیلے میں بول کر اسے اپنے اندر تک محسوس کرنے میں گزرتا۔ وہ کمرے میں رضائی اوڑھ کر لیٹے لیٹے دھیرے سے بولتے جیسے سامنے بیٹھے کسی کو مخاطب کر رہے ہوں: "آنی، تو اُولیسس (Ulysses) کیسی لگی؟" پھر وہ خاموش ہو کر جیمز جوئس کے بارے میں اُس کا جواب سنتے۔ جواب ہندی میں بھی ہوتا اور مشکل سے بنائی گئی انگریزی میں بھی۔

ایک دن اُنھوں نے کمرے میں رضائی کے اندر ہی اُس سے "ہیٹ اینڈ ڈسٹ" اور "جوئل اِن دَ کراؤن" فلموں کے بارے میں پوچھا۔ انیتا چاندی والا نے انگریزوں کے "برٹش راج نوسٹیلیا" کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ اُس نے بتایا کہ کس طرح انگلینڈ کے لوگ اپنے امپیریلسٹ ماضی سے بے تحاشا پیار کرتے ہیں، انگوٹھے کے برابر سکڑ جانے کے باوجود اپنے ملک کو "گریٹ" برٹن کہتے ہیں اور بھارت کی تاریخ کو کیسے اپنی مرضی کے مطابق بدلتے توڑتے ہیں۔ پھر اُس نے کہا، "فار ایگزامپل، دی لیٹسٹ فلم، اِن پروسس آف پروڈکشن، ٹرانسفر آف پاور، پُٹس دیٹ دی وِری کانسپٹ آف ڈومینین اسٹیٹس فار انڈین ری پبلک واز ناٹ ڈیمانڈڈ بائی نیشنلسٹس -- نہرُوز، پٹیلس، ایٹ سیٹ را، ایٹ سیٹ را-- بٹ اِٹ واز آ سجیشن بائی دی لاسٹ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن---"

اس لڑکی کے خیالات میں بیداری بھی ہے اور اپنی تاریخ کو دیکھنے کا ایک صحیح تناظر بھی۔ بس اگر اُسے سماج کے موجودہ حالات کے بارے میں علمی طریقے سے سمجھا دیا جائے اور جنتا سے جوڑ دیا جائے تو وہ یونین میں بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ رام سجیون اپنے پلنگ پر رضائی چھوڑ کر بیٹھ گئے اور بولے، "ابسولیوٹلی کریکٹ! ہھاٹ (what) دے ہیو ڈَن، یو سی، دے ہیو ٹرنڈ اَور نیتاجی، سبھاش بوس، اِنٹو اے پھَنی (funny) پولی ٹیکل جوکر---"

"واٹ" کی جگہ "ہھاٹ" نکل جانے پر اُنھیں گہری ندامت ہوئی۔ انھوں نے پکا ارادہ کیا کہ آئندہ اپنی انگریزی پر ٹاٹ پٹی اسکول کی پرچھائیں تک نہیں پڑنے دیں گے۔

انیتا چاندی والا اب بھی اپنی بالکنی میں نکلتی، کبھی کبھی نہا کر اپنے بال سکھانے وہیں کھلی ہوا میں کھڑی ہو جاتی۔ کھلی بانہیں، بے فکری میں اُٹھے ہوئے بازو، شیمپو کیے ہوئے سوکھتے اور الگ الگ اُڑتے بال--- رام سجیون اپنے کمرے میں اندھیرا کر کے چپ چاپ دیکھتے اور سرگوشیوں میں اُن کی لمبی خود کلامی شروع ہو جاتی۔

ایک دن، بڑی ہمت اور لمبے انتظار کے بعد، آخری فیصلہ کر کے انھوں نے کہا، "اَلو، آئی لَو یو!" پورا کمرہ دیر تک اِس جملے کے سنگیت میں بجتا رہا۔ مانڈینیا اور انٹی میٹ کی خوشبو کمرے میں تیرتی رہی۔ بچپن کی بڑی گہری اور تیز کلکاری نے رام سجیون کے دل میں جنم لیا اور وہ گلے سے نکلتی نکلتی رکی اور اس نے اُن کے پورے بدن کو کسی کمزور پیڑ کی طرح جھنجھوڑ دیا۔ وہ کانپ رہے تھے۔ بدن کا درجۂ حرارت بڑھ گیا تھا اور اس چھوٹے سے فقرے کو بولنے میں ہی اُنھیں اپنے بدن کی بہت ساری توانائی، سانس اور لہو داؤں پر لگانا پڑا تھا۔ لیکن ایک بار اسے بول جانے کے بعد وہ خود کو کافی آزاد اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔ وہ بے تحاشا خوش تھے۔ وہ ہیمنت کمار کا گیت گانے لگے۔

خوشی اُنھیں دوہری تھی، اس لیے کہ انھوں نے اس فیصلہ کن، اور لمبے انتظار کے بعد زبان پر آنے والے فقرے میں "لَبھ" کو "لَو" کہہ دیا تھا، بے اختیار، بغیر کسی کوشش کے، اور یہ ایک کمال تھا۔ دیہاتی، لوئر مڈل کلاس، پسماندہ احساسِ کمتری کو انھوں نے ایک زوردار پٹخنی دے دی تھی اور وہ کمرے کے فرش پر چاروں شانے چت پڑا کراہ رہا تھا۔

ایک بار رام سجیون نے یہ محسوس کیا کہ وہ لڑکی بڑی دیر سے اپنی بالکنی میں کھڑی ہے اور اُن کے انتظار میں ہے۔ وہ وہاں سے ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔ اُداس تھی اور شام کی ڈھلتی دھوپ کو دیکھ رہی تھی۔ رام سجیون کمرے سے نکل کر اپنی بالکنی میں آ گئے۔ وہ لڑکی وہیں کھڑی رہی جیسے اس نے پوری اپنائیت اور خاموش ممنونیت کے ساتھ اُن کے وجود کو قبول کر لیا ہو۔ اپنی بالکنی کی لوہے کی گنگنی ریلنگ پر انھوں نے کہنیاں ٹیکیں اور جھک کر ٹک گئے۔ لڑکی پھر بھی وہیں رہی۔ تعلق گہرا ہوتا چلا گیا۔ ہوا میں ایک بہت معنی خیز اپنائیت اور قبولیت تھی۔ کچھ اَور کہنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ یہ وہی لمحہ تھا جہاں زبان بے معنی ہوتی ہے۔ "مَون مدھو ہو جائے۔۔۔" (خاموشی شراب ہو جائے) یہ مصرعہ اُن کے دماغ میں تیرا۔ پھر سچدانند ہیرانند واتسیاین اَگیے کی لائن اُبھرنے لگی۔ "مَون ہی بھاشا ہے۔" (خاموشی ہی زبان ہے۔)

رام سجیون نے خود کو کوسا کہ کیسے کیسے امپریشنسٹ شاعروں کی تخلیقات اُن کے دماغ میں آرہی ہیں، لیکن بڑی کوششوں کے بعد بھی بابا ناگارجن اور آلوک دھنوا(۴) کی کوئی نظم یاد نہیں آرہی تھی۔ انھیں انقلابی محبت کی نظموں کے لیے یا تو غیر ملکی انقلابی شاعروں کا یا دیسی امپریشنسٹ شاعروں کا محتاج ہونا پڑ رہا تھا۔ انھوں نے یاد کیا کہ "سلیپنگ پرنس" کے بارے میں لینن کا کیا کہنا تھا۔ پریم اور خواب کو لینن نے بھی انقلابیوں کے لیے ضروری قرار دیا تھا اور اسی وقت رام سجیون نے فیصلہ کیا کہ وہ انقلابی محبت کی نظمیں لکھیں گے! ہندی میں اس کی کمی پوری ہونی چاہیے۔ آخر نیرودا، ناظم حکمت، لورکا، مایاکوفسکی وغیرہ بھی تو انقلابی تھے جنھوں نے اتنی اچھی لَو پوئمز لکھیں۔ ہماری ہندی میں یہ کام دھرم ویر

---

(۴) بابا ناگارجن اور آلوک دھنوا: ہندی کے دو ترقی پسند شاعر۔

Scanned with CamScanner

بھارتیوں، نوگیت کاروں اور نیرجوں کے کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے۔ بنگلہ کے جیبن آنند داس جیسے شاعر تو نایاب ہی ہیں ہندی میں۔

صرف یونین ہی نہیں، یونین سے باہر کے واقفکار لڑکے بھی جان چکے تھے کہ رام سجیون کو آج کل پریم ہو گیا ہے۔ انھوں نے خود یہ بات سب کو بتائی تھی۔ وہ بہت سرل، سیدھے اور جذباتی تھے۔ جو اُن کے خاص دوست تھے اُن کے پاس وہ اکثر رات میں پہنچ جاتے اور اس پریم کی تازہ ڈویلپمنٹس کے بارے میں بتلاتے۔ انھوں نے اپنے دوست نوین ڈھونڈھیال کو بتلایا تھا کہ "وہ لڑکی چاہتی ہے کہ میں کچھ بولوں، اُس سے کچھ کہوں۔ کل شام ہم لوگ آدھے گھنٹے تک آمنے سامنے کی بالکنیوں میں چپ چاپ کھڑے رہے۔ تم لوگ اِسے سمجھ نہیں سکتے۔ یہ ایک انوکھے قسم کا پریم ہے۔ دیکھو، ابھی تک ہم نے ایک جملہ بھی نہیں بولا ہے، ایک دوسرے سے بات نہیں کی ہے، لیکن ہم لوگ اُس اسٹیج تک پہنچ چکے ہیں جہاں تک معمولی، عام اور انا پرست لوگ مہینوں ساتھ ساتھ رہ کر، گھوم پھر کر پہنچتے ہیں۔ وہ وہاں کھڑی رہتی ہے چپ چاپ، میں یہاں کھڑا رہتا ہوں خاموش۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی موجودگی کو فیل کرتے ہیں۔"

ایک شام اُنھوں نے اپنے دوسرے دوست شریش مشر کو بتلایا، "آج کل میں ایک خاص تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ لگتا ہے انیتا اس نان کمیونی کیشن سے اُوب رہی ہے۔ پھر اُس کی عمر بھی تو میرے مقابلے میں کم از کم پانچ سات سال کم ہے۔ اتنی میچیورٹی کہاں سے آسکتی ہے اتنی جلدی؟ بہت دن ہو بھی گئے ہیں اس طرح۔ ایک طرح کی مونوٹنی، ایک طرح کی تکرار اور یکسانیت پیدا ہو گئی ہے ہمارے تعلقات میں۔ آخر ہے تو وہ لڑکی ہی۔ اس سیکنڈ سیکس کی نفسیات بالکل الگ ہوتی ہے۔ پہل تو وہ صرف بمبیا فلموں ہی میں کرتی ہے۔ اسی لیے ان کمرشل فلموں کو میں اینٹی فیمنسٹ سمجھتا ہوں۔ انھوں نے دیکھنے والوں کے دماغ میں صرف غیر حقیقی فینٹسی کی امیج ہی نہیں بٹھائی، بلکہ انھوں نے اتنے بڑے ماس میڈیم کے ذریعے ایک غیر حقیقی عورت کے کنسیپٹ کو بھی خوب پھیلایا ہے۔ نتیجہ دیکھ لو، ہر شہر اور قصبے کا مڈل کلاس چھوکرا خوب کنگھی وَنگھی کر کے، سج دھج کے کسی ہیرو کو ڈپلی کیٹ کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اُسے دیکھ کر کوئی بھی لڑکی اُس پر مرمٹے گی اور گانا گانے لگے گی۔"

رام سجیون نے نوین ڈھونڈھیال سے کہا، "اب سارا معاملہ بڑے کریٹیکل جنکچر تک پہنچ گیا ہے۔ میں نے مارک کیا ہے کہ میس میں کھانا کھاتے وقت کبھی کبھی وہ میری طرف جان بوجھ کر دیکھتی ہے۔ آج دوپہر لنچ میں اُس نے اپنا چمچ زور سے فرش پر گرا دیا تھا تاکہ میں اُس کی طرف دیکھنے لگوں۔ دراصل اُس وقت میں کہیں اَور دیکھ رہا تھا۔"

ایک بار وہ رات دس بجے پہنچے اور انھوں نے کسی گہرے راز کو پیاز کی طرح پرت پرت کھولتے ہوئے کہا، "تم نے انیتا کی ایک چیز پچھلے پانچ چھ دنوں میں نوٹ کی ہے؟ وہ آج کل اتنا زیادہ سلیولیس

پہنتی ہے کہ صرف بانہیں ہی نہیں بغلوں کے نیچے کا کافی حصہ کھلا رہتا ہے۔ اور آج اُس نے جو ٹاپ ہرے رنگ کا پہن رکھا تھا اُس کا گلا اتنا کھلا ہوا تھا، اتنا کھلا ہوا تھا کہ سمجھ لو ماڈل لڑکیاں بھی ایسی دلیری نہیں کر سکتیں۔ تم اسے انیتا کی بے شرمی کہو گے؟ لیکن بندھو پیارے، ایسا ہے نہیں! یہ اُس کا ایک اشارہ ہے۔ یہ اُس کی بے چینی اور رنج کا اظہار ہے۔ اتنے اشتعال انگیز کپڑے پہن کر، اپنے بدن کو اتنا کھول کر، وہ مجھ سے کہنا چاہتی ہے کہ میں اپنی موجودہ indecisiveness کو توڑوں۔ اُس سے صاف صاف بات کروں۔ آخر لڑکی اپنے بدن کے میڈیم ہی سے تو خاموشی کو زبان میں بدلتی ہے۔"

کلیان کمار داس نے کہا، "یار، تم لڑکی سے سیدھے بات کیوں نہیں کر لیتے؟ جا کر اُس سے کہہ دو کہ میں آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم خواہ مخواہ بیٹھے بیٹھے مکڑجال بُنتے رہتے ہو۔"

رام سجیون کو یہ سن کر چوٹ لگی۔ یہی بات انیتا نے کتنے انوکھے طریقے سے، اپنے سُندر جوان بدن سے خاموشی کو زبان میں بدلتے ہوئے، کتنے رمزیہ انداز سے کہی تھی، اور وہی بات کلیان کمار داس کتنے بھونڈے اور پھوہڑ طریقے سے کہہ رہا تھا۔ آخر اس سرمایہ دارانہ سماجی نظام نے جس بازاری انبوہ کو پیدا کیا ہے، وہ ہر چیز کو ایک جنس، ایک کموڈٹی ہی تو سمجھتا ہے۔ جیسے لڑکی بکنے کے لیے تیار بیٹھی ہو اور میں ایکسچینج کی بازاری زبان بول کر اس کا بھاؤتاؤ کر ڈالوں اور اسے پٹا لوں۔

لیکن اوپر سے رام سجیون چپ ہی رہے۔ اُنھوں نے چلتے ہوئے کہا، "ہاں، بس صحیح وقت کے انتظار میں ہوں یار۔ ویسے بائی دی وے، ہمارے اس پریم کو تم جیسا سمجھتے ہو، وہ ویسا ہے نہیں۔ گرو! یہ ایک الگ اور عجب طرح کا کھیل ہے۔ اس کا بھید پہلے دھن آنند بھی جانتے تھے۔ یہاں کوئی کپٹ نہیں، کوئی چھپاو نہیں، ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بالکل ٹرانسپیرنٹ ہیں۔ ایک دوسرے سے ہمارا کچھ بھی چھپا نہیں۔ رہی بات آمنے سامنے بیٹھ کر، یا کھڑے ہو کر، یا لیٹ کر، یا چلتے چلتے بات کرنے کی، تو وہ کوئی ایسی بڑی توپ چیز نہیں۔ بندھو پیارے، ویٹ کرو۔ دیکھتے جاؤ۔ وہ بھی ہو جائے گا۔ جو جو تم سوچتے ہو سب ہو جائے گا۔"

بیچ میں لڑکی دس دنوں کے لیے کہیں باہر چلی گئی تھی۔ اُس کے کمرے کی پچھلی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ رام سجیون چپ چاپ اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے یا بالکنی میں کھڑے ہو کر اُس طرف دیکھتے رہتے۔ لڑکی کی یہ غیر موجودگی اور اُس کی پچھلی کھڑکی کا کھلا رہ جانا بھی انھیں کئی کئی معنوں سے بھرا ہوا لگتا۔ آخر اپنے پریم کے لیے جیسی فارم انھوں نے چُن رکھی تھی اُس میں زبان کے علاوہ باقی ہر چیز زبان تھی، اشارہ تھی، اس میں کئی کئی معنی تھے۔

اُنھوں نے شام کو انیتا کی کھڑکی کھلی رہ جانے کی بابت شریش مشر کو بتلایا تو اُس نے کہا، "رام سجیون جی، ہم کا تو ای لگنے لگا ہے کی اب آپ پگلا جائیں گے۔ آپ کچھ کریں گے دھریں گے نہیں، کوٹھری میں دن رات گھُسے اہے سب سوچیں گے۔ روؤا ہم کا بتائی، اُو لڑکی آپ کا جانتی بوجھتی بھی ہے؟ جا کے پوچھ لیں اوسے کی کا آپ کو ہمار نامو معلوم ہے کی نہیں، جائیں۔"

رام سجیون کو پھر صدمہ ہوا۔ اندرونی چوٹ لگی۔ اتنی سیدھی اور بے حجاب باتیں اُنھیں وِلگر لگتی تھیں۔ انھیں اس روحانی سچ پر پچھلے دنوں اچھی طرح یقین ہو گیا تھا کہ پریم کبھی بھی اتنا گھرا اور شدید ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ دونوں طرف برابر نہ ہو۔ اُنھیں پورا بھروسا تھا کہ جس طرح اُنھوں نے چوکیدار دھیرج سنگھ نیگی سے انیتا کے بارے میں پوچھا تھا، ویسے ہی انیتا نے ضرور اُس سے اُن کے بارے میں پوچھا ہو گا۔ یہ یقین اتنا ٹھوس اور اتنا سچا لگتا تھا کہ کسی بھی طرح سے اس کی تصدیق کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر اُنھیں ایسا کرتے ہوئے ایک عجیب سا ڈر بھی لگتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہوا تو؟

سرمایہ داری فائن آرٹس کی سب سے بڑی اور سفّاک دشمن ہوتی ہے۔ اُنھوں نے چالُو دنیادار ڈھرے کا پریم نہ کر کے ایک آرٹ فارم بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہاں پریم ایک رشتہ نہیں ایک آرٹ تھا، ایک اعلیٰ آرٹسٹک تخلیق تھا۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کا یہ بھیانک ستم تھا کہ اپنے نزدیک سے نزدیک کے دوستوں سے بھی وہ کمیونی کیٹ نہیں کر پا رہے تھے۔ ایلینیشن تعلقات کے بیچ اجنبیت کے وِندھیاچل کھڑے کر رہا تھا۔ اُنھیں چیخوف کی کہانی "گریف" یاد آئی جس میں اپنے اندر کی پیڑا کو کہنے کے لیے ہیرو کو کوئی نہیں ملتا اور آخر میں وہ اپنے گھوڑے کے گلے سے لپٹ کر روتا ہے۔

رام سجیون کو کوئی گھوڑا تو نہیں ملا لیکن انھوں نے رات میں ایک نظم لکھی، "کھلی کھڑکی کے معنی"، جس کی شروع کی لائنیں تھیں:

---شریش مشر

تم نہیں جانتے کہ
تاریخ میں کھلی رہ گئی ایک اکیلی
کھڑکی کا کیا مطلب ہوتا ہے
لیکن میں جانتا ہوں
کھلی کھڑکی کا ایک مستقبل ہوتا ہے
جس میں سے قول و قرار اور تمناؤں کی
روشنی پھوٹتی ہے
وغیرہ وغیرہ---

ایک دن دوپہر کو رام سجیون دوڑتے دوڑتے کلیان کمار داس کے کمرے میں پہنچے۔ نوین ڈھونڈھیال بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔

رام سجیون کے چہرے سے خوشی کے مضبوط اور گدرائے پیڑ کی پھُننگیں باہر نکل کر ہل رہی تھیں۔ پھیپھڑوں میں ڈھیر سارے گلمہل اور کنیر کے پھول بھرے ہوئے لگ رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ خوشی کے کسی گیس کے غبارے کے ساتھ باندھ دیے گئے ہوں اور اُن کے پیر زمین پر پڑتے ہوئے کوئی

بار نہ ڈالتے ہوں، ہلکے سے دھرتی کو بس چھو لیتے ہوں اوپر اوپر سے۔

رام سجیون نے ایک ہی سانس میں کہا، "آج غضب ہو گیا۔ اب سب کچھ بدل چکا ہے۔ یہ ایک ایسا موڑ ہے جہاں ساری چیزیں نئے سرے سے شروع ہوتی ہیں۔"

"ہوا کیا؟ کیا بات چیت ہو گئی؟" ڈھونڈھیال نے پوچھا۔

"بات چیت کو تم لوگ اتنی اہمیت کیوں دیتے ہو؟ یہ سمجھ لو کہ میری اب تک کی ریڈنگ صحیح نکلی۔ آج میں بس اسٹاپ پر کھڑا تھا۔ اُس نے پوچھا: ایکسکیوز می پلیز، ویدر بس نمبر ٹرپل سکس از گان؟ میں نے کہا: اٹ از یٹ ٹو کم۔ وہ مسکرائی، تھینک یُو کہا اور پھر اسٹاپ پر ہی کھڑی ہو گئی۔"

کلیان کمار داس نے رام سجیون کو پوری ہم دردی سے دیکھا اور پوچھا، "تو مہودے، اِس میں آپ کا شعور کون سا اشارہ ڈھونڈتا ہے؟"

رام سجیون پھر دل برداشتہ ہوئے۔ اُن کا چہرہ تمتما آیا۔ "ویسے تو یہ ساری باتیں ہی تم لوگوں کے لیے فضول ہیں۔ لیکن اگر تم سب اپنی ہی دلیلوں کے ذریعے ساری باتوں کو سمجھنا چاہتے ہو تو یہ بتاؤ کہ اُس وقت بس اسٹاپ پر کم سے کم بیس اور لڑکے کھڑے تھے۔ انیتا نے یہ سوال مجھ سے، صرف مجھی سے کیوں کیا؟"

اس سوال کا جواب نہ کلیان کمار داس کے پاس تھا اور نہ نوین ڈھونڈھیال کے پاس۔

ایک دن شام چھ بجے کے لگ بھگ رام سجیون نے دیکھا کہ انیتا نے اپنی بالکنی سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نیچے گرایا، اُن کی طرف دیکھا، ذرا سا ٹھہری اور پھر اندر چلی گئی۔

سب سمجھ گئے رام سجیون۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے۔ ہوا چل رہی تھی۔ اور وہاں ہری گھاس پر ڈھیروں کاغذ کے ٹکڑے تھے۔ یہاں، وہاں، ہر طرف، دھیرے دھیرے کانپتے ہلتے۔ کچھ ایک دم چپ اور ساکت، جیسے مٹی میں جڑیں پکڑ چکے ہوں۔

کون سا ہے وہ کاغذ؟ کیسے اُسے پہچانیں؟ کیا لکھا ہو گا اُس میں؟ رات آٹھ بجے تک لوگوں نے دیکھا، بابو رام سجیون اپنے کُرتے کی اولی بنا کر وہاں کے سارے کاغذوں کو بین رہے ہیں۔ وہ چلنے کو تیار ہوتے اور تب ہی کہیں کوئی اور چھوٹی سی چندی گھاس کے نیچے ہلتی دکھائی دے جاتی۔ وہ جوش میں کانپتے ہوئے اُسے اٹھاتے۔

اُس رات دو بج گئے، انھوں نے اپنے کمرے کی بتی جلائے رکھ کر، سارے پُرزوں کو کھول کھول کر، اچھی طرح سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک بار سب کو دیکھ چکنے کے بعد اُن کے دل میں شک جاگا اور انھوں نے دوبارہ انھیں دیکھا۔ بیچ میں سونے کی کوشش کی لیکن پھر ایک تیز جوش و خروش، گہری اُمنگ اور سانس روک دینے والی بے قراری نے اُن کی نیند اُڑا دی اور وہ لگاتار کئی کئی بار انھیں ایک ایک کر کے

Scanned with CamScanner

دیکھتے رہے۔ اُن کے کمرے کے فرش پر، پلنگ پر چاروں طرف کاغذ کی ننھی ننھی تمام رنگوں کی چندیاں بکھری ہوئی تھیں اور رام سجیون اُن کے بیچ بیٹھے تھے۔

رام سجیون نے پوچھا، "اُنو، تمھیں پتا ہے، گاؤوں میں لوگ کس طرح سے رہتے ہیں؟ بنجر زمین اور سوکھے آسمان سے لڑتے جُوجھتے اُن لوگوں کی ہڈیاں کیسے نکل آتی ہیں؟ جاگیردارانہ جبر اور مہاجنی استحصال کا ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا سلسلہ کیسے اُن کے جیون کو کیڑے مکوڑوں سے بدتر بنا ڈالتا ہے۔۔۔"

انیتا کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ رام سجیون نے رضائی سے اپنا سر ڈھانپ لیا اور پھُوٹ پھُوٹ کر روتے رہے۔ لگ بھگ تین گھنٹے۔

رام سجیون کی آنکھیں پھٹی پھٹی اور لال رہتیں۔ لگتا کہ اُن کا لہو غالب کے مطابق صرف رگوں میں دوڑنے پھرنے کا قائل نہیں رہ گیا ہے بلکہ آنکھوں میں آ کر ٹھہر گیا ہے۔ منہ کھلا رہتا تو کھلا ہی رہ جاتا۔ داڑھی کسی افریقی جنگل کی طرح بے ترتیب اور منتشر ہو چکی تھی۔ پتلون کے پائنچوں میں مٹّی اور دھول لگی ہوتی۔

جب کوئی اُن سے کچھ کہتا تو سمجھنے میں اُنھیں کافی وقت لگتا اور اکثر وہ کچھ اَور سمجھ جاتے۔ پھر وہ بڑی اپنائیت، بے فکری اور ثابت قدمی سے اُسے اپنے پریم کے بارے میں بتانے لگتے۔

اُس دن بالکنی میں انیتا کے ساتھ ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ ٹھیٹھ بارڈر کی سفید ساڑی پہنے۔ بالکل بگلے کے پَر جیسے بال۔ پتلی سُنہری کمانی کا چشمہ۔ وہ دونوں اُن کی بالکنی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

رام سجیون نے ہفتوں بعد اپنا چہرہ دھویا۔ پانی کی ٹھنڈک سے اُن کا من کھِل اُٹھا۔ اُنھوں نے دوسرا کُرتا پہنا، بالکنی میں نکلے اور آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ پھر اُنھوں نے نیرودا یا اَور کسی بھی شاعر کی کوئی نظم یاد کرنی چاہی لیکن پتا نہیں کیوں بار بار اُن کے دماغ میں بنکم چندر کا یہی مصرعہ گونجنے لگتا تھا: "شاسیہ شیام لم، سجلم ماترم بندے ماترم!"

رام سجیون نے اِنھیں دنوں ایک مضمون لکھا: "سماج کی حالیہ اقتصادی اور سیاسی صورتِ حال اور طبقاتی کشمکش کا موجودہ مرحلہ"۔

یہ مضمون اُن کی یونین میں، رات کو خاص طور پر بُلائے گئے اجلاس میں پڑھا گیا۔ رام سجیون کی گہری نگاہ اور سماجی صورتِ حال کی بابت اُن کی عالمانہ سمجھ بوجھ کی تعریف کی گئی۔

اُس دن رام سجیون یونیورسٹی کے کینٹین ٹیریا میں دیر تک بیٹھے رہے۔ سامنے کچھ میزوں کو چھوڑ کر انیتا بیٹھی تھی۔ وہ اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہی تھی۔

رام سجیون اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ نوٹ بک میں کچھ لکھ نہیں رہی ہے، لکھنے کی صرف اداکاری کر رہی ہے، اور اگر وہ وہاں بیٹھی ہے تو صرف اس لیے کہ وہ وہاں بیٹھے ہیں۔

اِن دنوں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ کوئی اُن سے ان کے پریم کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اور اُن کے پاس اس کے سوا تسکین کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

انسانی تعلقات کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

ایک سبب یہ بھی تھا کہ رام سجیون اپنے پریم کے بارے میں جو کچھ بتلاتے، اس کی زبان اتنی الگ ہوتی تھی کہ اُسے سمجھنا اور کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔ اُن کے قریبی دوست بھی اُن سے کتراتے۔ نوین ڈھونڈھیال نے ایک دن بتایا کہ رات میں قریب دو بجے رام سجیون اُس کے کمرے میں آئے۔ اُن کی آنکھیں چوڑی اور لال تھیں۔ کرتا پھٹا ہوا اور میلا تھا۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے تک فرنچ جیسی کسی زبان میں بولتے رہے۔ بیچ بیچ میں ہکلاتے تھے، منہ سے رال بہنے لگتی تھی۔ پھر وہ دیر تک ہنستے رہے۔

نوین ڈھونڈھیال، اسلم اختر، شریش مشر، کلیان کمار داس، سب لوگ مل کر رام سجیون کے کمرے میں پہنچے۔ فیصلہ کیا گیا تھا کہ رام سجیون نے اپنے چاروں طرف جو کائنات بنالی ہے اُسے توڑ کر، اُسے تباہ و برباد کر کے ہی اُنھیں بچایا جا سکتا ہے۔ شریش نے کہا، اُنھیں شدید شیزوفرینیا ہے۔ اُن کے فریبِ نظر کو اصلیت سے ٹکرا کر توڑنا پڑے گا۔

"ہم بالکل رحم نہیں کریں گے۔ بی ویر آف پٹی!" اسلم نے نعرہ لگایا۔

رام سجیون اپنے کمرے ہی میں تھے۔ رضائی میں گھُسے ہوئے۔ شریش مشر نے بات شروع کی۔

"دیکھیے سجیون بابو، سچائی تو ای ہے کی اُو لڑکی ابھی آپ کا نامو نہیں جانتی اور نہ ہی اُسے پتا ہے کی آپ اُو سے پیار کرر ہے ہیں۔ مجنوں کی نائیں۔"

"اور یہ بھی سچ ہے کہ آپ بنا کچھ کیے، سوچتے ہی سوچتے پاگل ہوے، جا رہے ہیں۔ چلیے ہمارے ساتھ، ہم آپ کو انیتا چاندی والا سے ملوا دیتے ہیں۔"

"لیکن سجیون بابو، ای بات آپ اچھی طرح سے جان لیں کی جوَن کلاس کی اُو لڑکی ہے، اُو کا مقابلے میں روَوا کی حالت چپراسیوں سے گئی گزری ہے۔ روَوا کا پتا ہے کی نہیں، کی اُو لڑکی کا باپ کینیا میں فیکٹری چلا رہا ہے اور انیتا چاندی والا کیمبرج میں پڑھ کے اِہاں آئی ہے؟"

"آپ ہاتھ منھ دھوئیے۔ اچھے کپڑے لتے پہنیے۔ داڑھی دُوڑھی بنائیے اور قاعدے سے رہیے۔ جب ایسی لڑکی سے پیار کیا ہے تو ذرا اس کے موافق بنیے۔"

"اور نہیں بن سکتے تو فوراً اپنی دنیا میں لوٹ آئیے۔ آنکھیں کھولیے۔ دھوپ کو دیکھیے۔ وہ لڑکی کسی اَور سنسار کی ہے، آپ کسی اَور دنیا کے باسی ہیں گُرودیو! جو آپ کلاس کلاس کرتے رہتے ہیں وہ خیالی پلاؤ نہیں ایک ٹھوس سچائی ہے۔ اسے جانیے۔ کلاس اسٹرگل میں صرف جنگ ہی نہیں ہوتی، کویتائیں ہی نہیں لکھی جاتیں، جلوس اور نعرے ہی نہیں لگتے۔ پیار ویار جیسی کئی چیزیں بھی اُس کے ہاتھوں ماری جاتی ہیں۔"

"رام سجیون، ہوش میں آئیے۔"

"آپ ہوش میں نہیں آئیں گے تو پاگل ہو جائیں گے۔"

وہ سب باری باری سے بولتے رہے۔ یہ سب کچھ پہلے سے تیار کر لیا گیا تھا۔ یہ سفاک تھیٹر کا ایک

Scanned with CamScanner

کھیل تھا۔

رام سجیون ساکت پڑے تھے۔ اُسی طرح۔ پھر اُنھوں نے زور زور سے گانا شروع کیا۔ اُن کی آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔

لوگوں نے بعد میں جانا کہ یہ گیتا کا دوسرا اَدھیاے تھا۔ تعجب یہ تھا کہ وہ بابو رام سجیون کو یاد تھا -- پورا کا پورا۔

ایک دن ہوسٹل کے وارڈن نے نوین ڈھونڈھیال اور کلیان کمار داس کو اپنے آفس میں بلایا۔ وارڈن سد گوپال نے اُن کے سامنے ایک خط رکھا۔ "اسے پڑھیے آپ لوگ اور بتائیے کہ کیا کیا جائے۔"

وہ محبت نامہ تھا جسے بابو رام سجیون نے انیتا چاندی والا کو لکھا تھا اور اسے کمرہ نمبر ۳۱۶ کے پتے پر پوسٹ کر دیا تھا۔ خط دو زبانوں میں تھا، انگریزی میں بھی اور ہندی میں بھی۔ اُس میں جیبن آنند داس، لورکا، نیرودا اور ٹیگور کی لائنیں تھیں، اپنے دل کے گہرے پریم کا پیچیدہ اور مفصّل بیان تھا۔ کلیان کمار داس کو وہ خط ادبِ عالیہ کا ایک نمونہ معلوم ہوا۔

وارڈن سد گوپال نے کہا، "وہ لڑکی بہت ڈر گئی ہے۔ اُس نے سکیورٹی پروٹیکشن کا مطالبہ کیا ہے۔ آج صبح ہی اُسے خط ملا۔ پہلے تو اُسے پتا ہی نہیں لگا کہ کس نے لکھا ہے۔ پھر اُس نے چوکیدار دھیرج سنگھ سے پوچھا۔ رام سجیون نے اپنا نام پتا صاف لکھ رکھا ہے۔"

"اُس لڑکی نے کیا کہا ہے؟" ڈھونڈھیال نے پوچھا۔

"وہ بہت ڈر گئی ہے،" وارڈن نے بتلایا۔ "کہہ رہی تھی کہ پچھلے دنوں سے اُسے ایسا ضرور لگنے لگا تھا کہ ایک پاگل سا آدمی لگاتار اُسے گھورتا رہتا ہے، لیکن اس نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ اب بات دوسری ہے۔ آپ لوگ کچھ کیجیے۔ ویسے میں نے اُسے فی الحال سمجھا دیا ہے، لیکن اچھا ہو گا کہ آپ لوگ رام سجیون کو کچھ دن کے لیے اُن کے گاؤں بھیج دیں۔ یہاں سے باہر رہیں گے، ہوا بدل جائے گی تو شاید وہ ٹھیک ہو جائیں۔"

رات کی گاڑی سے رام سجیون کو جبراً ان کے گاؤں بھیج دیا گیا۔ سب لوگ اُن کے ساتھ اسٹیشن گئے۔ اسلم اختر کو تو ساتھ ساتھ گاؤں تک بھیجا گیا۔ وہ تیسرے دن اُنھیں پہنچا کر لوٹا۔ بابو رام سجیون کا کمرہ اُس ہوسٹل سے بدل کر ایک ایسے ہوسٹل میں کر دیا گیا جس میں صرف لڑکے رہتے تھے۔ اُن کی غیر موجودگی میں اُن کا سارا سامان پہلے والے کمرے سے نکال کر نئے کمرے میں پہنچایا گیا۔

کچھ دنوں بعد وارڈن نے پھر کلیان کمار داس اور نوین ڈھونڈھیال کو بلایا اور اُن کے سامنے خطوں کا ایک پلندا رکھ دیا۔ سب خط رام سجیون نے گاؤں سے انیتا چاندی والا کو بھیجے تھے۔ انیتا چاندی والا نے اُن خطوں کو کھولا بھی نہیں تھا اور چوکیدار دھیرج سنگھ نیگی کے ہاتھ وارڈن کے پاس بھیج دیا تھا۔

وہ خط میز پر رکھے تھے۔ ہوا میں دھیرے دھیرے کانپتے، بالکل بند۔ اُنھیں کسی نے بھی نہیں پڑھا تھا۔ کلیان کمار داس نے اُنھیں اٹھا کر اپنے جھولے میں ڈال لیا جس کے اندر گھرا اندھیرا تھا۔

Scanned with CamScanner

رام سجیون اب پھر لوٹ آئے ہیں، ایک سال تک گاؤں میں رہنے کے بعد۔ انیتا چاندی والا ریسرچ ختم کر کے کینیا جا چکی ہے۔ کلیان کمار داس کو گوہاٹی کے کسی چائے کے باغ میں اچھی نوکری مل گئی ہے۔

رام سجیون کو پورا یقین ہے کہ انیتا چاندی والا اب بھی یہیں یونیورسٹی میں ہے۔ وہ انھیں دیکھ رہی ہے اور پرکھ رہی ہے۔ وہ کسی ان دیکھے امتحان سے گزر رہے ہیں۔

رام سجیون اب بھی سماج کی مادّی صورتِ حال، فلسفے کی معروضی روایتوں اور طبقاتی کشمکش پر کبھی کبھی مضمون وغیرہ لکھا کرتے ہیں۔

**

اُدے پرکاش

ہندی سے ترجمہ: اجمل کمال

ترچھ

اس قصّے کا تعلق پِتاجی سے ہے۔ میرے خواب سے ہے۔ اور شہر سے بھی ہے۔ شہر کی بابت جو ایک پیدائشی ڈر ہوتا ہے، اُس سے بھی ہے۔

پِتاجی تب پچپن سال کے ہوئے تھے۔ دُبلا جسم، بال بالکل مکئی کے بھُوئے جیسے سفید، سر پر جیسے روئی رکھی ہو۔ وہ سوچتے زیادہ تھے، بولتے بہت کم۔ جب بولتے تو ہمیں تسلّی ہوتی، جیسے دیر سے رُکی ہوئی سانس نکل رہی ہو۔ ساتھ ساتھ ہمیں ڈر بھی لگتا۔ ہم بچّوں کے لیے وہ ایک بہت بڑا راز تھے۔ ہمیں پتا تھا کہ دنیا بھر کے سارے علم کی تجوری اُن کے پاس ہے۔ ہم جانتے تھے کہ دنیا کی ساری زبانیں وہ بول سکتے ہیں۔ دنیا اُن کو جانتی ہے اور ہماری ہی طرح اُن سے ڈرتی ہوئی، اُن کا ادب کرتی ہے۔

ہمیں اُن کی اولاد ہونے پر فخر تھا۔

کبھی کبھی، ویسے ایسا برسوں میں ایک آدھ بار ہی ہوتا، وہ شام کو ہمیں اپنے ساتھ ٹہلانے کہیں باہر لے جاتے۔ چلنے سے پہلے وہ منھ میں تمباکو بھر لیتے۔ تمباکو کی وجہ سے وہ کچھ بول نہیں پاتے تھے۔ وہ چپ رہتے۔ ان کی خاموشی ہمیں بہت گمبھیر، پُروقار، حیران کن اور بھاری بھر کم لگتی۔ چھوٹی بہن کبھی اُن سے راستے میں کچھ پوچھنا چاہتی تو فوراً میں اس کا جواب دینے کی کوشش کرتا تاکہ پتاجی کو نہ بولنا پڑے۔

ویسے یہ کام کافی مشکل اور جوکھم بھرا ہوتا۔ کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اگر میرا جواب غلط ہوا تو پتاجی کو بولنا پڑ جائے گا۔ بولنے میں اُنھیں پریشانی ہوتی تھی۔ ایک تو اُنھیں تمباکو کی پیک نکالنی پڑتی تھی، پھر

ترچھ: گرگٹ کی نسل کا ایک زہریلا جانور جسے وِش کھاپر بھی کہا جاتا ہے۔

جس دنیا میں وہ رہتے تھے وہاں سے نکل کر یہاں تک آنے میں اُنھیں ایک کٹھن دُوری طے کرنی پڑتی تھی۔ ویسے بہن کے سوالوں میں کوئی خاص بات ہوتی نہیں تھی۔ جیسے وہ یہی پوچھ لیتی کہ سامنے چھیولے کی سُوکھی ٹہنی پر بیٹھی اُس چڑیا کو کیا کہتے ہیں۔ میں چوں کہ ساری چڑیوں کو جانتا تھا اس لیے بتا سکتا تھا کہ وہ نیل کنٹھ ہے اور دسہرے کے دن اُسے ضرور دیکھنا چاہیے۔ میری پوری کوشش رہتی کہ پتاجی کو آرام رہے اور وہ سوچتے رہیں۔

میری اور ماں کی، دونوں کی پوری کوشش رہتی کہ پتاجی اپنی دنیا میں سُکھ چین سے رہیں۔ وہاں سے انھیں زبردستی باہر نہ نکالا جائے۔ وہ دنیا ہمارے لیے بہت پُراسرار تھی، لیکن ہمارے گھر کے اور ہماری زندگی کے بہت سے مسئلوں کو پتاجی وہیں رہتے ہوئے حل کرتے تھے۔ مثلاً جب میری فیس کی بات آئی اُس وقت ہمارے پاس کا آخری گلاس بھی گم گیا تھا اور سب لوگ لوٹے میں پانی پیتے تھے۔ پتاجی دو دن تک بالکل چپ رہے۔ ماں کو بھی شک ہوتا تھا کہ پتاجی فیس کی بات بالکل بھول گئے ہیں یا پھر اس کا حل اُن کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن تیسرے دن صبح صبح، پتاجی نے مجھے ایک چٹھی لفافے میں رکھ کر دی اور شہر کے ڈاکٹر پنت کے پاس بھیجا۔ مجھے بہت تعجب ہوا جب ڈاکٹر نے مجھے شربت پلایا، گھر کے اندر لے جا کر اپنے بیٹے سے ملوایا اور سو سو کے تین نوٹ مجھے دیے۔

ہم پتاجی پر فخر کرتے تھے، اُن سے پیار کرتے تھے، اُن سے ڈرتے تھے اور اُن کے ہونے کا احساس ایسا تھا جیسے ہم کسی قلعے میں رہ رہے ہوں۔ ایسا قلعہ جس کے چاروں طرف گہری نہریں کھُدی ہوئی ہوں، برجیاں بہت اونچی ہوں، دیواریں سخت لال چٹانوں کی بنی ہوئی ہوں اور ہر بیرونی حملے کے لیے ہمارا قلعہ ناقابلِ شکست ہو۔

پتاجی ایک خوب مضبوط قلعہ تھے، ان کی فصیل پر ہم سب کچھ بھول کر کھیلتے تھے اور رات میں مجھے خوب گہری نیند آتی تھی۔

لیکن اُس دن، شام کو، جب پتاجی باہر سے ٹہل کر آئے تو اُن کے ٹخنے میں پٹی بندھی تھی۔ تھوڑی دیر میں گاؤں کے کئی لوگ وہاں آ گئے۔ پتا چلا کہ پتاجی کو جنگل میں ایک ترچھ نے کاٹ لیا ہے۔

ہم سب جانتے تھے کہ ترچھ کے کاٹنے پر آدمی بچ ہی نہیں سکتا۔ رات میں، لالٹین کی دُھندلی مٹ میلی روشنی میں، گاؤں کے بہت سے لوگ ہمارے گھر کے آنگن میں جمع ہو گئے تھے۔ پتاجی اُن کے بیچ میں تھے، زمین پر بیٹھے ہوئے۔ پھر پاس کے گاؤں کا چُٹوا نائی بھی آیا۔ وہ اَرنڈ کے پتے اور کنڈے کی راکھ سے زہر اُتارتا تھا۔

ترچھ ایک بار میں نے دیکھا تھا۔

تالاب کے کنارے جو بڑی بڑی چٹانوں کے ڈھیر تھے، اور جو دوپہر میں خوب گرم ہو جاتے تھے، اُن میں سے کسی چٹان کی دراڑ سے نکل کر وہ پانی پینے تالاب کی طرف جا رہا تھا۔

میرے ساتھ تھانو تھا۔ اُس نے بتلایا کہ وہ ترچھ ہے۔ کالے ناگ سے سو گنا زیادہ اس میں زہر ہوتا

Scanned with CamScanner

ہے۔ اُسی نے بتایا کہ سانپ تو تب کاٹتا ہے جب اُس کے اوپر پیر پڑ جائے یا جب کوئی بلاوجہ اُسے تنگ کرے۔ لیکن ترچھ تو نظر ملتے ہی دوڑتا ہے۔ پیچھے پڑ جاتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے کبھی سیدھے نہیں بھاگنا چاہیے۔ ٹیڑھے میڑھے چکر کاٹتے ہوئے گول مول دوڑنا چاہیے۔

دراصل جب آدمی بھاگتا ہے تو زمین پر وہ صرف اپنے پیروں کے نشان ہی نہیں چھوڑتا، بلکہ ہر نشان کے ساتھ وہاں کی دھُول میں اپنی بُو بھی چھوڑ جاتا ہے۔ ترچھ اسی بُو کے سہارے دوڑتا ہے۔ تھائو نے بتلایا کہ ترچھ کو چکما دینے کے لیے آدمی کو یہ کرنا چاہیے کہ پہلے تو وہ بالکل پاس پاس قدم رکھ کر جلدی جلدی کچھ دیر دوڑے، پھر چار پانچ بار خوب لمبی لمبی چھلانگیں لگائے۔ ترچھ سُونگھتا ہوا دوڑتا آئے گا۔ جہاں پاس پاس پیر کے نشان ہوں گے وہاں اُس کی رفتار خوب تیز ہو جائے گی، اور جہاں سے آدمی نے چھلانگ ماری ہو گی وہاں آ کر وہ اُلجھن میں پڑ جائے گا۔ وہ اِدھر اُدھر تب تک بھٹکتا رہے گا جب تک اُسے اگلے پیر کا نشان اور اُس میں بسی بُو نہیں مل جاتی۔

ہمیں ترچھ کے بارے میں دو باتیں اَور معلوم تھیں۔ ایک تو یہ کہ جیسے ہی وہ آدمی کو کاٹتا ہے، ویسے ہی وہ وہاں سے بھاگ کر کسی جگہ پیشاب کرتا ہے اور اُس پیشاب میں لوٹنے لگتا ہے۔ اگر ترچھ نے ایسا کر لیا تو آدمی بچ نہیں سکتا۔ اگر اُسے بچنا ہے تو ترچھ کے پیشاب میں لوٹنے سے پہلے ہی خود کسی ندی، کنویں یا تالاب میں ڈُبکی لگا لینی چاہیے یا پھر ترچھ کے ایسا کرنے سے پہلے ہی اُسے مار دینا چاہیے۔

دوسری بات یہ کہ ترچھ کاٹنے کے لیے تبھی دوڑتا ہے جب اُس سے نظر ٹکرا جائے۔ اگر ترچھ کو دیکھو تو کبھی اُس سے آنکھ مت ملاؤ۔ آنکھ ملتے ہی وہ آدمی کی بُو پہچان لیتا ہے اور پیچھے لگ جاتا ہے۔ پھر چاہے آدمی پوری زمین کا چکر لگا لے، ترچھ پیچھے پیچھے آتا ہے۔

میں بھی تمام بچوں کی طرح اُس وقت ترچھ سے بہت ڈرتا تھا۔ میرے ڈراونے خوابوں کے سب سے خطرناک کردار دو ہی تھے: ایک ہاتھی اور دوسرا ترچھ۔ ہاتھی تو پھر بھی دوڑتا دوڑتا تھک جاتا تھا اور میں پیڑ پر چڑھ کر بچ جاتا تھا، یا پھر اُڑنے لگتا تھا، لیکن ترچھ۔۔ اُس کے سامنے تو مَیں جیسے کسی اندرجال میں پھنس جاتا تھا۔ میں خواب میں کہیں جا رہا ہوتا تو اچانک ہی کسی جگہ وہ مل جاتا، اُس کی جگہ طے نہیں ہوتی تھی۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ چٹانوں کی دراروں میں، پرانی عمارتوں کے پچھواڑے یا کسی جھاڑی کے پیچھے دِکھے۔۔ وہ مجھے بازار میں، سنیما ہال میں، کسی دکان یا میرے کمرے ہی میں دکھ سکتا تھا۔

میں خواب میں کوشش کرتا کہ اُس سے نظر نہ ملنے پائے لیکن وہ اتنی مانوس آنکھوں سے مجھے دیکھتا کہ میں اپنے آپ کو روک نہیں پاتا تھا اور بس، آنکھ ملتے ہی اُس کی نظر بدل جاتی تھی۔ وہ دوڑتا تھا اور میں بھاگتا تھا۔

میں گول گول چکر لگاتا، جلدی جلدی پاس پاس ڈگ بھر کر اچانک خوب لمبی لمبی چھلانگیں لگانے لگتا، اُڑنے کی کوشش کرتا، کسی اونچی جگہ پر چڑھ جاتا، لیکن میری ہزار کوششوں کے باوجود وہ چکما نہیں کھاتا تھا۔ وہ مجھے بہت گھاگ، سمجھدار، چالاک اور خطرناک لگتا۔ مجھے لگتا کہ وہ مجھے خوب اچھی طرح سے جانتا ہے۔ اُس کی

Scanned with CamScanner

آنکھوں میں میرے لیے پہچان کی جو چمک تھی، اُس سے مجھے لگتا کہ وہ میرا ایسا دشمن ہے جسے میرے دماغ میں آنے والے ہر خیال کے بارے میں پتا ہے۔

میرا سب سے خوف ناک، تکلیف دہ، بھیانک اور بے چین کر دینے والا خواب یہی تھا۔ بھاگتے بھاگتے میرا پورا جسم تھک جاتا، پھیپھڑے پھُول جاتے۔ میں پسینے میں لت پت ہو کر بے دم ہونے لگتا اور ایک بہت ہی ڈراونی، سُن کر دینے والی موت میرے بالکل قریب آنے لگتی۔ میں زور زور سے چیختا، رونے لگتا، پتاجی کو، تھانُو کو یا ماں کو پکارتا اور پھر میں جان جاتا کہ یہ خواب ہے۔ لیکن یہ پتا چل جانے کے باوجود میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ تب بھی میں اپنی اس موت سے نہیں بچ سکتا۔۔ موت نہیں، ترچھ کے ہاتھوں ہونے والے اپنے قتل سے۔۔ اور ایسے میں مَیں خواب ہی میں کوشش کرتا کہ کسی طرح جاگ جاؤں۔ میں پوری طاقت لگاتا، خواب کے اندر آنکھیں کھول کر پھاڑتا، روشنی کو دیکھنے کی کوشش کرتا اور زور سے کچھ بولتا۔ کئی بار بالکل عین موقعے پر میں جاگنے میں کامیاب ہو جاتا۔

ماں بتلاتیں کہ مجھے خواب میں بولنے اور چیخنے کی عادت ہے۔ کئی بار اُنھوں نے مجھے نیند میں روتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ ایسے میں اُنھیں مجھ کو جگا دینا چاہیے، لیکن وہ میرے ماتھے کو سہلا کر مجھے رضائی سے ڈھک دیتی تھیں اور میں اُسی خوف ناک دنیا میں اکیلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اپنی موت، بلکہ اپنے قتل سے بچنے کی کمزور کوشش میں بھاگتا، دوڑتا، چیختا۔

ویسے، دھیرے دھیرے تجربے سے میں نے یہ جان لیا تھا کہ آواز ہی ایسے موقعے پر میرا سب سے بڑا ہتھیار ہے جس سے میں ترچھ سے بچ سکتا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے ہر بار اس ہتھیار کی یاد مجھے بالکل آخری وقت میں آتی تھی، تب جب وہ مجھے بالکل پا لینے والا ہوتا۔ اپنی موت کی سانسیں مجھے چھُونے لگتیں، موت کے نشے سے بھرے ایک سنسناں لیکن ڈراونے اندھیرے سے میں گھِر جاتا، لگتا میرے نیچے کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے۔۔ میں ہوا میں ہوں، اور وہ پَل آ جاتا جب میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہوتا۔ تبھی، بالکل اسی ایک بہت ہی چھوٹے اور نازک پَل میں مجھے اپنے اِس ہتھیار کی یاد آتی اور میں زور زور سے بولنے لگتا۔ اور اس آواز کے سہارے میں خواب سے باہر نکل آتا۔ میں جاگ جاتا۔

کئی بار ماں مجھ سے پوچھتیں بھی کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ تب میرے پاس اتنی زبان نہیں تھی کہ میں اُنھیں سب کچھ، ایک ایک چیز اُسی طرح بتا پاتا۔ اپنی اس بے بسی کے بارے میں مجھے خوب پتا تھا اور اسی وجہ سے میں ایک عجیب سے تناؤ، بے چینی اور بے چارگی سے بھر جاتا۔ آخر میں ہار کر مَیں اتنا ہی کہہ پاتا تھا کہ "بہت ڈراونا خواب تھا۔"

جانے کیوں مجھے شک تھا کہ پتاجی کو اُسی ترچھ نے کاٹا ہے جسے میں پہچانتا تھا اور جو میرے خوابوں میں آتا تھا۔

لیکن ایک اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ جیسے ہی وہ ترچھ پتاجی کو کاٹ کر بھاگا، پتاجی نے اُس کا پیچھا کر

کے اُسے مار ڈالا تھا۔ طے تھا کہ اگر وہ فوراً اُسے نہ مار پاتے تو وہ پیشاب کر کے ضرور اس میں لوٹنے لگتا۔ پھر پتاجی کسی حال میں نہ بچتے۔ یہی وجہ تھی کہ پتاجی کے بارے میں مجھے اتنی فکر نہیں رہ گئی تھی۔ بلکہ ایک طرح کی تسکین اور آزادی کا احساس میرے اندر دھیرے دھیرے پیدا ہو رہا تھا۔ وجہ، ایک تو یہی کہ پتاجی نے ترچھ کو تُرنت مار ڈالا تھا، اور دوسرے یہ کہ میرا سب سے خطرناک، پرانا، جانا پہچانا دشمن آخر کار مر چکا تھا۔ اُس کا خاتمہ ہو گیا تھا اور اَب میں اپنے خواب کے اندر کہیں بھی، بنا کسی ڈر کے، سیٹی بجاتا گھوم سکتا تھا۔

اُس رات دیر تک ہمارے آنگن میں بھیڑ لگی رہی۔ پتاجی کی جھاڑ پھونک چلتی رہی۔ کاٹے کے زخم کو چیر کر خون بھی باہر نکالا گیا اور کنویں میں ڈالنے والی لال دوا (پوٹاشیم پرمیگنیٹ) زخم میں بھری گئی۔ میں مطمئن تھا۔

اگلی صبح پتاجی کو شہر جانا تھا۔ عدالت میں پیشی تھی۔ اُن کے نام سمن آیا تھا۔ ہمارے گاؤں سے لگ بھگ دو کلومیٹر دور سے نکلنے والی سڑک سے شہر کے لیے بسیں گزرتی تھیں۔ ان کی تعداد مشکل سے دن بھر میں دو یا تین تھی۔ غنیمت ہوا کہ پتاجی جیسے ہی سڑک تک پہنچے، شہر جانے والا پاس کے گاؤں کا ایک ٹریکٹر اُنھیں مل گیا۔ ٹریکٹر میں بیٹھے ہوئے لوگ پہچان کے تھے۔ ٹریکٹر دو ڈھائی گھنٹوں میں شہر پہنچ جانے والا تھا، یعنی عدالت کھلنے سے کافی پہلے۔

راستے میں ترچھ والی بات چلی۔ پتاجی نے اپنا ٹخنا اُن لوگوں کو دکھایا۔ ٹریکٹر میں پنڈت رام اَوتار بھی تھے۔ انھوں نے بتلایا کہ ترچھ کے زہر کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی یہ چوبیس گھنٹے بعد، ٹھیک اُسی وقت جس وقت پچھلے دن ترچھ نے کاٹا ہو، اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اس لیے ابھی پتاجی کو مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ ٹریکٹر کے لوگوں نے پتاجی کا دھیان ایک اَور بڑی غلطی کی طرف دلایا۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ تو پتاجی نے بہت ٹھیک کیا کہ ترچھ کو فوراً مار ڈالا لیکن اس کے بعد بھی ترچھ کو یوں ہی نہیں چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ اُسے کم سے کم جلا ضرور دینا چاہیے تھا۔

اُن لوگوں کا کہنا تھا کہ بہت سے کیڑے مکوڑے اور دوسرے جاندار راپٹ میں، چاند کی روشنی میں، دوبارہ جی اُٹھتے ہیں۔ چاندنی میں جو اوس اور ٹھنڈک ہوتی ہے اُس میں اَمرت ہوتا ہے، اور کئی بار ایسا دیکھا گیا ہے کہ جس سانپ کو مرا ہوا سمجھ کر رات میں یوں ہی پھینک دیا جاتا ہے، اس کا جسم چاند کی ٹھنڈک میں بھیگ کر دوبارہ جی اُٹھتا ہے اور وہ بھاگ جاتا ہے۔ پھر وہ ہمیشہ بدلہ لینے کی تاک میں رہتا ہے۔

ٹریکٹر کے لوگوں کو شک تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات میں جی اُٹھنے کے بعد ترچھ پیشاب کر کے اس میں لوٹ لگا لے۔ ایسا ہوا تو چوبیس گھنٹے بیتتے بیتتے، ٹھیک اُسی گھڑی کے آنے پر، ترچھ کا جان لیوا زہر پتاجی پر چڑھنا شروع ہو جائے گا۔ اُن لوگوں نے صلاح بھی دی کہ پتاجی کو یہیں سے واپس لوٹ جانا چاہیے اور اگر اتفاق سے ترچھ کی لاش اُسی جگہ پڑی ہوئی ہو تو اُسے اچھی طرح جلا کر راکھ کر دینا چاہیے۔ لیکن پتاجی نے اُنھیں بتایا کہ پیشی کتنی ضروری ہے۔ یہ تیسرا سمن تھا اور اگر اِس بار بھی وہ عدالت میں حاضر نہ

Scanned with CamScanner

ہوے تو غیر ضمانتی وارنٹ نکلنے کا ڈر تھا۔ پیشی بھی ہمارے اُسی مکان کے سلسلے میں تھی جس میں ہمارا کنبہ رہ رہا تھا۔ وکیل کو پچھلی دو پیشیوں میں فیس بھی نہیں دی جا سکی تھی اور کہیں اگر اُس نے لاپروائی دکھلا دی اور جج سنک گیا تو وہ ہماری قُرقی ڈگری بھی کروا سکتا تھا۔

عجیب حالت تھی کہ اگر پتاجی اُس ترچھ کی لاش کو جلانے کے لیے ٹریکٹر سے اُتر کر وہیں سے گاؤں لوٹ آتے تو غیر ضمانتی وارنٹ کے تحت گرفتار کر لیے جاتے اور ہمارا گھر ہم سے چھن جاتا، عدالت ہمارے خلاف ہو جاتی۔

لیکن پنڈت رام اوتار ایک وَید بھی تھے۔ جیوتش، پنچ انگ کے علاوہ اُنھیں جڑی بُوٹیوں کی بھی بڑی گہری جانکاری تھی۔ اُنھوں نے سجھایا کہ ایک طریقہ ایسا ہے جس سے پتاجی پیشی میں حاضر بھی ہو سکتے ہیں اور ترچھ کے زہر سے چوبیس گھنٹے کے بعد بچ بھی سکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ چرک کا نچوڑ اس اصول میں ہے کہ زہر ہی زہر کی کاٹ کرتا ہے۔ اگر دھتُورے کے بیج کہیں سے مل جائیں تو وہ ترچھ کے زہر کی کاٹ تیار کر سکتے ہیں۔

اگلے گاؤں سامت پور میں ٹریکٹر روک دیا گیا اور ایک تیلی کے کھیت میں دھتُورے کے پودے آخر کار کھوج نکالے گئے۔ دھتورے کے بیجوں کو پیس کر، تانبے کے پرانے سکّے کے ساتھ اُبال کر کاڑھا تیار کیا گیا۔ کاڑھا بہت کڑوا تھا اس لیے اسے چائے میں ملایا گیا اور پتاجی کو وہ چائے پلا دی گئی۔ اس کے بعد سب مطمئن ہو گئے۔ ایک بہت بڑے خطرے سے پتاجی کو نکالنے کی کوشش ہو رہی تھی۔

ویسے مجھے ترچھ کے بارے میں تیسری بات بھی معلوم تھی، جو پتاجی کے جانے کے کئی گھنٹے بعد یاد آئی۔ یہ بات سانپ کی اُس بات سے ملتی جلتی تھی جس کے نمونے پر آگے چل کر کیمرے کی ایجاد ہوئی تھی۔

مانا جاتا تھا کہ اگر کوئی آدمی سانپ کو مار رہا ہو تو اپنے مرنے سے پہلے وہ سانپ آخری بار اپنے قاتل کے چہرے کو پوری طرح سے، بہت غور سے دیکھتا ہے۔ آدمی اُسے قتل کر رہا ہوتا ہے اور سانپ ٹکٹکی باندھ کر اُس آدمی کے چہرے کی ایک ایک باریکی کو اپنی آنکھ کے اندرونی پردے پر درج کر رہا ہوتا ہے۔ سانپ کی موت کے بعد سانپ کی آنکھوں کے اندرونی پردے پر اس آدمی کی تصویر ہو بہو محفوظ ہو جاتی ہے۔

بعد میں، آدمی کے جانے کے بعد، اُس سانپ کا دوسرا جوڑا آ کر اُس مرے ہوے سانپ کی آنکھوں کے اندر جھانکتا ہے اور اس طرح وہ قاتل پہچان لیا جاتا ہے۔ سارے سانپ اُسے پہچاننے لگتے ہیں۔ پھر وہ کہیں بھی چلا جائے، وہ اُس سے بدلہ لینے کے فراق میں رہتے ہیں۔ ہر سانپ اُس کا دشمن ہوتا ہے۔

مجھے شک تھا کہ مرے ہوے ترچھ کی آنکھ کے اندرونی پردے پر پتاجی کا چہرہ درج ہو گا، کوئی دوسرا ترچھ آ کر اُس لاش کی آنکھ میں جھانکے گا اور پتاجی وہیں پہچان لیے جائیں گے۔ میرے اندر اس

Scanned with CamScanner

بات پر بے چینی پیدا ہوئی کہ پتاجی نے یہ احتیاط کیوں نہیں برتی۔ اُنھیں ترچھ کو مارنے کے ساتھ ہی کسی پتھر سے اُس کی دونوں آنکھوں کو کچل کر پھوڑ دینا چاہیے تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ پتاجی شہر جا چکے تھے اور میرے سامنے اُلجھن اور یہ چیلنج تھا کہ گاؤں کے پاس پھیلے اتنے بڑے جنگل میں جس جگہ ترچھ کو مار کر چھوڑا تھا، وہ جگہ مَیں کھوج نکالوں۔

میں تھانُو کے ساتھ بوتل میں مٹی کا تیل، دیاسلائی اور ڈنڈا لے کر جنگل میں ترچھ کی کھوج میں بھٹکتا رہا۔ میں اُسے اچھی طرح سے پہچانتا تھا، بہت اچھی طرح۔ تھانُو مایوس تھا۔

پھر مجھے اچانک ہی لگنے لگا کہ اس جنگل کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک ایک پیڑ میرا جانا پہچانا نکلنے لگا۔ اسی جگہ سے کئی بار خواب میں مَیں ترچھ سے بچنے کے لیے بھاگا تھا۔ میں نے غور سے ہر طرف دیکھا: بالکل، یہی وہ جگہ تھی۔ میں نے تھانُو کو بتایا کہ ایک تنگ سا نالا اس جگہ سے کتنی دور دکھن کی طرف بہتا ہے۔ نالے کے اوپر جہاں بڑی بڑی چٹانیں ہیں، وہاں کیکر کا ایک بہت پرانا پیڑ ہے جس پر بڑے بڑے شہد کے چھتّے ہیں۔ اُنھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ کئی صدیوں پرانے ہیں۔ میں اُس بھُورے رنگ کی چٹان کو جانتا تھا جو برسات بھر نالے کے پانی میں آدھی ڈوبی رہتی تھی اور بارش کے بیتنے کے بعد جب باہر نکلتی تھی تو اُس کی کھُوہوں میں کیچڑ بھر جاتی تھی اور عجیب عجیب وَنس پتیاں (نباتات) وہاں سے اُگ آتی تھیں۔ چٹان کے اوپر ہری کائی کی ایک پرَت سی جم جاتی تھی۔ اسی چٹان کی سب سے اوپر والی درار میں ترچھ رہتا تھا۔ تھانُو اس بات کو میرا وہم سمجھ رہا تھا۔

لیکن بہت جلد ہمیں وہ نالا مل گیا۔ کیکر کا وہ بوڑھا پیڑ بھی جس پر شہد کے چھتّے تھے، اور وہ چٹان بھی۔ ترچھ کی لاش چٹان سے ذرا ہٹ کر زمین پر گھاس کے اوپر چت، پڑی ہوئی تھی۔ بالکل، یہ وہی ترچھ تھا۔ میرے اندر وحشت، جوش اور خوشی کی ایک سنسنی دوڑ رہی تھی۔

تھانُو نے اور میں نے سُوکھے پتّے اور لکڑیاں اکٹھی کیں، خوب سارا مٹّی کا تیل اس میں ڈالا اور آگ لگا دی۔ ترچھ اُس میں جل رہا تھا۔ اُس کے جلنے کی چراندھ ہوا میں پھیل رہی تھی۔ میرا من زور سے چلّانے کو ہوا لیکن میں ڈرا کہ کہیں میں جاگ نہ جاؤں اور یہ سب کچھ خواب نہ ثابت ہو جائے۔ میں نے تھانُو کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہا تھا۔ وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔

میرے خواب میں اِسی جگہ سے نکل کر اُس ترچھ نے کئی بار میرا پیچھا کرنا شروع کیا تھا۔ تعجب تھا کہ اتنے لمبے عرصے سے اس کے اڈّے کو اتنی اچھی طرح سے جاننے کے باوجود میں نے کبھی دن میں آ کر اُسے مارنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

میں آج بے تحاشا خوش تھا۔

پنڈت رام اَوتار نے بتلایا تھا کہ ٹریکٹر نے پونے دس بجے کے لگ بھگ شہر کا چُنگی ناکا پار کیا تھا۔ وہاں اُنھیں ناکے کا ٹول ٹیکس چکانے کے لیے کچھ دیر رکنا بھی پڑا تھا۔ وہاں پر پتاجی ٹریکٹر سے اُتر کر

Scanned with CamScanner

پیشاب کرنے گئے تھے۔ لوٹنے پر اُنھوں نے بتایا تھا کہ ان کا سر کچھ گھوم سا رہا ہے۔ تب تک پتاجی کو دھتورے کا کاڑھا پیے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ ٹریکٹر نے پتاجی کو شہر میں دس بج کر پانچ سات منٹ کے آس پاس چھوڑ دیا تھا۔ ٹریکٹر ہی میں بیٹھے پلڑا گاؤں کے ماسٹر نندلال کا کہنا تھا کہ جب شہر میں منروا ٹاکیز کے پاس والے چوراہے پر پتاجی کو ٹریکٹر سے اُتارا گیا تب انھوں نے شکایت کی تھی کہ اُن کا گلا کچھ سُوکھ سا رہا ہے۔ وہ تھوڑا پریشان بھی تھے کیوں کہ عدالت جانے کا راستا اُنھیں معلوم نہیں تھا اور شہر کے لوگوں سے پوچھ پوچھ کر کہیں جانے میں اُنھیں بہت تکلیف ہوتی تھی۔

پتاجی کے ساتھ ایک دقت یہ بھی تھی کہ گاؤں یا جنگل کی پگڈنڈی تو اُنھیں یاد رہتی تھی، شہر کی سڑکوں کو وہ بھول جاتے تھے۔ شہر وہ بہت کم جاتے تھے۔ جانا ہی پڑ جائے تو آخر وقت تک اسے ٹالتے رہتے تھے، تب تک جب تک جانا بالکل ہی ضروری نہ ہو جائے۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ پتاجی سارا سامان لے کر شہر کے لیے روانہ ہوئے اور بس اڈے سے لوٹ آئے۔ بہانہ یہ کہ بس چھوٹ گئی۔ جب کہ ہم سب جانتے تھے کہ ایسا نہیں ہوا ہو گا۔ پتاجی نے بس کو دیکھا ہو گا، پھر وہ کہیں بیٹھ گئے ہوں گے، پیشاب کرنے یا پان کھانے۔ پھر اُنھوں نے دیکھا ہو گا کہ بس چھوٹ رہی ہے۔ اُنھوں نے ذرا سا اور انتظار کیا ہو گا۔ جب بس نے رفتار پکڑلی ہو گی تب وہ کچھ دور تک دوڑے ہوں گے، پھر اُن کے قدم دھیمے پڑ گئے ہوں گے اور وہ افسوس اور غصہ ظاہر کرتے لوٹ آئے ہوں گے۔ ایسا کرتے ہوئے اُنھیں خود بھی لگا ہو گا کہ بس سچ مچ چھوٹ گئی ہے۔ ایسے میں جب کہ ہم مان چکے ہوتے کہ وہ شہر جا چکے ہیں، وہ لوٹ کر ہمیں حیران کر دیتے۔

ٹریکٹر سے منروا ٹاکیز کے پاس والے چوراہے پر، سندھ واچ کمپنی کے ٹھیک سامنے، لگ بھگ دس بج کر سات منٹ پر اُترنے کے بعد سے شام چھ بجے تک پتاجی کے ساتھ شہر میں جو کچھ بھی ہوا، اُس کا صرف ایک دھُندلا سا اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ معلومات بھی کچھ لوگوں سے بات چیت اور پوچھ تاچھ کے بعد ملی ہیں۔ کسی کی موت کے بعد، اگر وہ موت حادثاتی اور دردناک ڈھنگ سے ہوئی ہو، ایسی معلومات مل ہی جاتی ہیں۔ اُس دن، بدھ ۱۷ مئی ۱۹۷۲ کو، صبح دس دس سے لے کر شام چھ بجے تک، لگ بھگ پونے آٹھ گھنٹے میں، پتاجی کہاں کہاں گئے، کہاں کہاں اُن کے ساتھ کیا کیا ہوا، اس کا بہت صحیح اور بہت درست احوال ملنا تو مشکل ہے؛ جو اطلاعیں یا معلومات بعد میں ملیں، ان کے ذریعے ان واقعات کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ پلڑا گاؤں کے ماسٹر نندلال کا کہنا تھا، جب پتاجی ٹریکٹر سے اترے تبھی اُنھوں نے گلا سُوکھنے کی شکایت کی تھی۔ اس سے پہلے چنگی ناکے کے پاس جب پتاجی پیشاب کر کے لوٹے تھے تو انھوں نے سر گھومنے کی بات کی تھی۔ یعنی پتاجی پر دھتورے کے بیجوں کے کاڑھے کا اثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ویسے بھی شہر پہنچنے تک پتاجی کو کاڑھا پیے ہوئے لگ بھگ دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ اُس وقت پتاجی کو پیاس بہت لگی ہو گی۔ گلا بھگونے کے لیے وہ کسی ہوٹل یا ڈھابے کی طرف گئے بھی ہوں گے

Scanned with CamScanner

لیکن، جیسا کہ مجھے اُن کے سُبھاو کے بارے میں پتا ہے، وہ وہاں کچھ دیر کھڑے رہے ہوں گے اور پھر ایک گلاس پانی مانگنے کا فیصلہ نہ کر سکے ہوں گے۔ ایک بار اُنھوں نے بتایا بھی تھا کہ کچھ سال پہلے گرمیوں کے دنوں میں جب انھوں نے کسی ہوٹل میں پانی مانگا تھا تو وہاں کام کرنے والے کسی نوکر نے اُنھیں گالی دی تھی۔ پتاجی بہت خوددار تھے، اس لیے اُنھوں نے اپنی پیاس کو دبایا ہو گا اور وہاں سے چل پڑے ہوں گے۔

سوا دس سے لے کر لگ بھگ گیارہ بجے تک کے عرصے میں، پینتالیس منٹ تک، پتاجی کہاں کہاں گئے، اس کی کوئی اطلاع کہیں سے نہیں ملتی۔ اس دوران کوئی ایسا خاص واقعہ بھی نہیں ہوا جس سے کوئی کچھ کہہ سکے۔ پھر شہر میں سڑک پر آتے جاتے لوگوں میں سے کسی نے اُن پر دھیان دیا ہو، اُنھیں دیکھا ہو، اس کا پتا لگانا بھی مشکل ہے۔ ویسے میرا اپنا اندازہ ہے کہ اس دوران پتاجی نے کچھ لوگوں سے عدالت جانے کا راستا پوچھا ہو گا اور اُن کے دماغ میں یہ بات بھی رہی ہو گی کہ وہ اپنے وکیل ایس این اگروال سے پانی مانگ لیں گے۔ لیکن اُن کے پوچھنے پر یا تو لوگ چپ رہ کر تیزی سے آگے بڑھ گئے ہوں گے یا کسی نے اتنی بوکھلاہٹ اور جلد بازی میں اُنھیں کچھ بتایا ہو گا کہ پتاجی ٹھیک سے سمجھ نہیں سکے ہوں گے اور صرف خجل، دکھی اور پریشان ہو کر رہ گئے ہوں گے۔ شہر میں ایسا ہوتا ہی ہے۔

پتاجی گیارہ بجے شہر میں دیش بندھو مارگ پر واقع اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی عمارت میں گھُسے تھے۔ وہ وہاں کیوں گئے، اس کی وجہ ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آتی۔ ویسے ہمارے گاؤں کا رمیش دت شہر میں بھومی وِکاس سہکاری (لینڈ ڈویلپمنٹ کوآپریٹو) بینک میں کلرک ہے۔ ہو سکتا ہے پتاجی کے دماغ میں صرف بینک رہا ہو اور وہاں سے گزرتے ہوئے اچانک اُنھوں نے اسٹیٹ بینک لکھا دیکھا ہو اور اُدھر گھُوم گئے ہوں۔ اُنھوں نے اب تک پانی نہیں پیا تھا اس لیے انھوں نے سوچا ہو گا کہ وہ رمیش دت سے پانی بھی مانگ لیں گے، عدالت کا پتا بھی پوچھ لیں گے اور اُسے بتا بھی سکیں گے کہ اُن کا سر گھُوم رہا ہے؛ یہ بھی کہ اُنھیں کل شام ترچھ نے کاٹا تھا۔ اسٹیٹ بینک کے کیشیئر اگنی ہوتری کے مطابق وہ اُس وقت کیش رجسٹر چیک کر رہا تھا۔ اُس کی میز پر لگ بھگ اٹھائیس ہزار روپوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اُس وقت گیارہ سے دو تین منٹ اوپر رہے ہوں گے، تب ہی پتاجی وہاں آئے۔ اُن کے ماتھے پر دھُول لگی ہوئی تھی، چہرہ ڈراونا تھا اور اچانک ہی انھوں نے زور سے کچھ کہا تھا۔ اگنی ہوتری کا کہنا تھا کہ میں اچانک ڈر گیا۔ عموماً ایسے لوگ بینک کے اتنے اندر، کیشیئر کی ٹیبل تک نہیں پہنچ پاتے۔ اگنی ہوتری کا کہنا یہ بھی تھا کہ اگر وہ پتاجی کو ایک آدھ منٹ پہلے سے اپنی طرف آتا ہوا دیکھ لیتا تب شاید اِتنا نہ ڈرتا۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ پوری طرح سے کیش رجسٹر کے حساب کتاب میں ڈوبا ہوا تھا، تبھی اچانک پتاجی نے آواز نکالی اور سر اُٹھاتے ہی اُنھیں دیکھ کر وہ ڈر گیا اور چونک پڑا۔ اُس نے گھنٹی بھی بجا دی۔

بینک کے چپراسیوں، دو چوکیداروں اور دوسرے ملازموں کے مطابق، اچانک ہی کیشیئر کی چیخ اور گھنٹی کی آواز سے وہ سب لوگ چونک گئے اور اُس طرف دوڑے۔ تب تک نیپالی چوکیدار تھاپا نے

پتاجی کو دبوچ لیا تھا اور مارتا ہوا کامن روم کی طرف لے جا رہا تھا۔ ایک چپراسی رام کشور نے، جس کی عمر پینتالیس کے آس پاس تھی، کہا کہ اس نے سمجھا کوئی شرابی دفتر میں گھس آیا ہے یا پاگل، اور چوں کہ اُس کی ڈیوٹی بینک کے صدر دروازے پر تھی اس لیے برانچ مینیجر اُسے چارج شیٹ کر سکتا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ جب پتاجی کو مارا جا رہا تھا، تب ہی اُنھوں نے انگریزی میں کچھ بولنا شروع کر دیا۔ اسی وجہ سے چپراسیوں کا شک بڑھ گیا۔ اس دوران شاید اسسٹنٹ برانچ مینیجر مہتا نے یہ کہہ دیا کہ اس آدمی کی اچھی طرح سے تلاشی لینا، تبھی باہر نکلنے دینا۔ ویسے چپراسی رام کشور کا کہنا تھا کہ پتاجی کا چہرہ عجیب طرح سے ڈراونا ہو گیا تھا، اس پر دھُول جمع ہو گئی تھی اور اُلٹی کی باس آ رہی تھی۔ بینک کے چپراسیوں نے پتاجی کو زیادہ مارنے پیٹنے کی بات سے انکار کیا، لیکن بینک کے باہر ٹھیک دروازے پر جو پان کی دکان ہے، اُس پر بیٹھنے والے بنّو کا کہنا تھا کہ جب ساڑھے گیارہ بجے کے آس پاس پتاجی بینک سے باہر آئے تو اُن کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور نچلا ہونٹ کٹ گیا تھا جہاں سے خون نکل رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سُوجن اور کتھئی چکتے تھے۔ ایسے چکتے بعد میں بینگنی یا نیلے پڑ جاتے ہیں۔

اس کے بعد، یعنی ساڑھے گیارہ بجے سے لے کر ایک بجے تک کے عرصے میں، پتاجی کہاں کہاں گئے، اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔ ہاں، اسٹیٹ بینک کے باہر پان کی دکان لگانے والے بنّو نے ایک بات اَور بتائی تھی، حالاں کہ اس بارے میں اسے پوری طرح یقین نہیں تھا، یا ہو سکتا ہے کہ اسٹیٹ بینک کے ملازموں کے ڈر سے وہ صاف صاف بتانے سے کترا رہا ہو۔ بنّو نے بتلایا تھا کہ اسٹیٹ بینک سے باہر نکلنے پر شاید (وہ "شاید" پر بہت زور دے رہا تھا) پتاجی نے کہا تھا کہ اُن کے روپے اور کاغذات بینک کے چپراسیوں نے چھین لیے ہیں۔ لیکن بنّو کا کہنا تھا کہ ہو سکتا ہے پتاجی نے کوئی اَور بات کہی ہو کیوں کہ وہ ٹھیک سے بول نہیں پا رہے تھے۔ اُن کا نچلا ہونٹ کافی کٹ گیا تھا، منھ سے رال بہہ رہی تھی اور اُن کا دماغ ٹھکانے نہیں تھا۔

میرا اپنا اندازہ ہے کہ اُس وقت تک پتاجی پر کاڑھے کا اثر بہت زیادہ ہو چکا تھا۔ حالاں کہ پنڈت رام اَوتار اس بات سے انکار کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ دھتورے کے بیج تو ہولی کے دنوں میں بھنگ کے ساتھ بھی گھوٹے جاتے ہیں لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آدمی بالکل پاگل ہو جائے۔ پنڈت رام اوتار کا خیال ہے کہ یا تو ترچھ کا زہر اُس وقت پتاجی کے جسم میں چڑھنا شروع ہو گیا تھا اور اس کا نشہ ان کے دماغ تک پہنچنے لگا تھا، یا پھر بہت ممکن ہے کہ جب اسٹیٹ بینک میں پتاجی کو تھانیدار اور چپراسیوں نے مارا پیٹا تھا تب اُن کے سر کے پیچھے کی طرف کوئی چوٹ لگ گئی ہو اور اس دھکے سے اُن کا دماغ سنک گیا ہو۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ اُس وقت تک پتاجی کو تھوڑا بہت ہوش تھا اور وہ پوری کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح شہر سے باہر نکل جائیں۔ شاید روپے اور عدالت کے کاغذات بینک میں چھن جانے کی وجہ سے اُنھوں نے سوچا ہو کہ اب یہاں رہنے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ اُنھوں نے شاید ایک آدھ بار سوچا بھی ہو گا کہ واپس اسٹیٹ بینک جا کر اپنے کاغذات تو کم سے کم مانگ لائیں، پھر ایسا کرنے کی اُن کی ہمت نہیں

پڑی ہو گی۔ وہ ڈر گئے ہوں گے۔ اُنھیں اُن کی زندگی میں پہلی بار اس طرح سے مارا گیا تھا، اس لیے وہ ٹھیک سے سوچنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہوں گے۔ اُن کا جسم بہت دُبلا تھا اور بچپن ہی سے اُنھیں اپنڈی سائٹس کی شکایت تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس وقت تک اُن پر کاڑھے کا اثر اتنا زیادہ ہو چکا ہو کہ وہ ایک چیز پر دیر تک سوچ ہی نہ پا رہے ہوں اور دماغ میں ہر پل پیدا ہونے والے چھوٹے چھوٹے بُلبلوں جیسے خیالوں یا نئے نئے جھٹکوں کے بس میں آ کر اِدھر سے اُدھر چل پڑتے رہے ہوں۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں، مجھے پورا یقین ہے، کہ اُن کے دماغ میں گھر لوٹ آنے اور شہر سے نکل جانے کی بات --ایک یقینی، بار بار اندھیرے سے اُبھرنے والی، بھلے ہی بہت موہوم اور بہت دھُندلی بات-- ضرور رہی ہو گی۔

پتاجی لگ بھگ سوا بجے شہر کے پولیس تھانے پہنچے تھے۔ تھانا شہر کے باہری گھیر پر سرکٹ ہاؤس کے پاس بنے وجے استمب (مینارِ فتح) کے پاس ہے۔ تعجب یہ ہے کہ تھانے سے بہ مشکل ایک کلومیٹر دور عدالت بھی ہے۔ اگر پتاجی چاہتے تو یہاں سے پیدل ہی دس منٹ میں عدالت پہنچ سکتے تھے۔ سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ پتاجی اگر یہاں تک پہنچے تھے، کیا تب تک اُن کے دماغ میں عدالت جانے کی بات رہ بھی گئی تھی۔ ان کے پاس کاغذات تو رہ نہیں گئے تھے۔

تھانے کے ایس ایچ او راگھویندر پرتاپ سنگھ نے کہا کہ اُس وقت ایک بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ وہ گھر سے لائے ہوئے ٹفن کو کھول کر لنچ کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ آج ٹفن میں پراٹھوں کے ساتھ کریلے رکھے ہوئے تھے۔ کریلے وہ کھا نہیں پاتے اور اسی اُلجھن میں تھے کہ اب کیا کریں۔ تبھی پتاجی وہاں آئے تھے۔ اُن کے جسم پر قمیص نہیں تھی۔ پینٹ پھٹی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ کہیں گرے ہوں گے یا کسی گاڑی نے انھیں ٹکر ماری ہو گی۔ تھانے میں اُس وقت ایک ہی سپاہی گجادھر پرساد شرما موجود تھا۔ سپاہی کا کہنا تھا کہ اُس نے سوچا کہ شاید کوئی بھک منگا تھانے میں گھُس آیا ہے۔ اُس نے آواز بھی دی لیکن پتاجی تب تک ایس ایچ او راگھویندر پرتاپ سنگھ کی ٹیبل تک پہنچ چکے تھے۔ ایس ایچ او نے کہا کہ کریلوں کی وجہ سے ویسے بھی اُن کا موڈ آف تھا۔ تیرہ سال کی شادی شدہ زندگی کے باوجود بیوی یہ نہیں جان پائی تھی کہ اُنھیں کون سی چیزیں بالکل ناپسند ہیں، اتنی ناپسند کہ وہ ان چیزوں سے نفرت کرتے ہیں۔ انھوں نے جیسے ہی نوالہ منہ میں رکھا، پتاجی بالکل اُن کے قریب پہنچ گئے۔ پتاجی کے چہرے پر اور کندھوں کے نیچے اُلٹی لگی ہوئی تھی اور اُس کی بہت تیز بُو اٹھ رہی تھی۔ ایس ایچ او نے پوچھا کہ کیا بات ہے تو جواب میں پتاجی نے جو کچھ کہا اسے سمجھنا بہت مشکل تھا۔ ایس ایچ او راگھویندر سنگھ بعد میں پچھتا رہے تھے کہ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ یہ آدمی بکیلی گاؤں کا پردھان اور ریٹائرڈ ہیڈماسٹر ہے تو وہ اسے تھانے ہی میں دو چار گھنٹے بٹھا لیتے، باہر نہ جانے دیتے، لیکن اُس وقت اُنھیں لگا کہ یہ کوئی پاگل ہے اور انھیں کھاتے ہوئے دیکھ کر یہاں تک گھُس آیا ہے، اس لیے انھوں نے سپاہی گجادھر شرما کو غصّے میں آواز دی۔ سپاہی پتاجی کو گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ گجادھر شرما کا کہنا تھا کہ اُس نے پتاجی کے ساتھ کوئی مارپیٹ نہیں کی اور اس نے دیکھا تھا کہ جب وہ تھانے آئے تھے تب اُن کا نچلا ہونٹ کٹا ہوا تھا، ہڈی پر کہیں رگڑا کھا کر

گرنے سے کھرونچ کے نشان تھے اور کہنیاں چھلی ہوئی تھیں۔ وہ کہیں نہ کہیں گرے ضرور تھے۔
یہ کوئی نہیں جانتا کہ تھانے سے نکل کر لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے پتاجی کہاں کہاں بھٹکتے رہے۔ صبح دس بج کر سات منٹ پر، جب وہ شہر آئے تھے اور منروا ٹاکیز کے پاس والے چوراہے پر ٹریکٹر سے اترے تھے، تب سے لے کر اب تک انھوں نے کہیں پانی پیا تھا یا نہیں، یہ جاننا مشکل ہے۔ اس کا امکان بھی کم ہی ہے۔ ہو سکتا ہے اُس وقت تک ان کا دماغ اس قابل نہ رہ گیا ہو کہ وہ پیاس کو بھی یاد رکھ سکیں۔ لیکن اگر وہ پولیس تھانے تک پہنچے تو ان کے ذہن میں، نشے کے باوجود، کہیں بہت کم زور سا، اندھیرے میں ڈوبا یہ خیال رہا ہوگا کہ کسی طرح وہ اپنے گاؤں جانے کا راستا وہاں پوچھ لیں، یا اُس ٹریکٹر کا پتا پوچھیں یا پھر اپنے روپے اور عدالتی کاغذات چھن جانے کی رپورٹ وہاں لکھا دیں۔ یہ سوچنے کے قریب پہنچنا ہی بُری طرح سے بے چین کر ڈالنے والا ہے کہ اُس وقت پتاجی صرف ترچھے کے زہر اور دھتورے کے نشے ہی کے خلاف نہیں لڑ رہے تھے بلکہ ہمارے مکان کو بچانے کی فکر بھی کہیں نہ کہیں اُن کے نشے کی نیند میں سے بار بار سر اُٹھا رہی تھی۔ شاید انھیں اب تک یہ لگنے لگا ہوگا کہ یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، صرف ایک خواب ہے۔ پتاجی اس سے جاگنے اور باہر نکلنے کی کوشش بھی کرتے رہے ہوں گے۔

سوا دو بجے کے آس پاس پتاجی کو شہر کے سب سے اُتری چھور پر بسی سب سے خوشحال کالونی، اتواری کالونی، میں گھسٹتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ یہ کالونی صرّاف کے جوہریوں، پی ڈبلیو ڈی کے بڑے ٹھیکے داروں اور ریٹائرڈ افسروں کی کالونی تھی۔ کچھ آسودہ حال صحافی شاعر بھی وہاں رہتے تھے۔ یہ کالونی ہمیشہ پُرسکون اور ہنگامے سے محفوظ رہتی تھی۔ جن لوگوں نے یہاں پتاجی کو دیکھا تھا، انھوں نے بتایا کہ اُس وقت تک ان کے جسم پر صرف ایک پٹے دار جانگیا بچا تھا جس کا ناڑا شاید ٹوٹ گیا تھا اور وہ اسے اپنے بائیں ہاتھ سے بار بار سنبھال رہے تھے۔ جس نے بھی اُنھیں وہاں دیکھا اُس نے یہی سمجھا کہ کوئی پاگل ہے۔ کچھ نے کہا کہ وہ بیچ بیچ میں کھڑے ہو کر زور زور سے گالیاں بکنے لگتے تھے۔ بعد میں اسی کالونی میں رہنے والے ایک ریٹائرڈ تحصیل دار سونی صاحب اور شہر کے سب سے بڑے اخبار کے چیف رپورٹر ستیندر تھپلیال نے بتایا کہ انھوں نے پتاجی کے بولنے کو ٹھیک سے سنا تھا اور دراصل وہ گالیاں نہیں بک رہے تھے بلکہ بار بار کہہ رہے تھے: "میں رام سوارتھ پرساد، ایکس اسکول ہیڈماسٹر --- اور ویلج ہیڈ آف --- گرام بکیلی ---" شاعر اور صحافی تھپلیال صاحب نے دکھ ظاہر کیا۔ دراصل اُسی وقت وہ امریکی سفیر کی کسی خاص پارٹی میں سنگیت سننے دلّی جا رہے تھے اس لیے جلد بازی میں وہ چلے گئے۔ ہاں تحصیل دار سونی صاحب کا کہنا تھا کہ "مجھے اُس آدمی پر بہت ترس آیا اور میں نے لڑکوں کو ڈانٹا بھی۔ لیکن دو تین لڑکوں نے کہا کہ یہ آدمی رام رتن صرّاف کی بیوی اور سالی پر حملہ کرنے والا تھا۔" تحصیل دار نے کہا کہ ایسا سننے کے بعد اُنھیں بھی لگا کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی بدمعاش ہو اور ناٹک کر رہا ہو۔ لڑکے انھیں تنگ کرنے لگے تھے اور پتاجی بیچ بیچ میں زور زور سے بولتے تھے: "میں رام سوارتھ پرساد --- ایکس اسکول

ہیڈ ماسٹر۔۔۔"

اگر حساب لگایا جائے تو منروا ٹاکیز کے پاس والا چوراہا، جہاں پتاجی ٹریکٹر سے صبح دس بج کر سات منٹ پر اُترے تھے، وہاں سے لے کر دیش بندھو مارگ کا اسٹیٹ بینک، پھر وجے استمب کے پاس کا تھانا، اور شہر کے باہری اُتری چھور پر بسی اتواری کالونی کو ملا کر وہ اب تک تیس بتیس کلومیٹر کی دوری تک بھٹک چکے تھے۔ یہ جگہیں ایسی ہیں جو ایک ہی سمت میں نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پتاجی کی دماغی حالت یہ تھی کہ انہیں ٹھیک ٹھیک کچھ سُوجھ نہیں رہا تھا اور وہ اچانک ہی کسی بھی طرف چل پڑتے تھے۔ جہاں تک صرّاف کی بیوی اور سالی پر ان کے حملہ کرنے کی بات ہے، جسے تھپلیال صاحب سچ مانتے ہیں، میرا اپنا اندازہ ہے کہ پتاجی اُن کے پاس یا تو پانی مانگنے گئے ہوں گے یا بکیلی جانے والی سڑک کے بارے میں پوچھنے۔ اُس ایک پل کے لیے پتاجی کو ہوش ضرور رہا ہوگا۔ لیکن اس حلیے کے آدمی کو اپنے اتنا قریب دیکھ کر وہ عورتیں ڈر کر چیخنے لگی ہوں گی۔ ویسے پتاجی کی داہنی آنکھ کے اوپر ماتھے پر جو چوٹ تھی اور جس کا خون رِس کر ان کی آنکھ پر آنے لگا تھا، وہ چوٹ ان کو اتواری کالونی ہی میں لگی تھی، کیوں کہ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ لڑکے بیچ بیچ میں اُنہیں ڈھیلے مار رہے تھے۔

وہ جگہ اتواری کالونی سے بہت دور نہیں ہے جس جگہ پتاجی کو سب سے زیادہ چوٹیں لگیں۔ نیشنل ریسٹورنٹ نام کے ایک سستے سے ڈھابے کے سامنے کی خالی جگہ پر پتاجی گھر گئے تھے۔ اتواری کالونی سے لڑکوں کا جو جھُنڈ اُن کے پیچھے پڑ گیا تھا، اس میں کچھ بڑی عمر کے لڑکے بھی شامل ہو گئے تھے۔ نیشنل ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے نوکر سستے کا کہنا تھا کہ پتاجی نے غلطی یہ کی تھی کہ ایک بار انھوں نے غصّے میں آکر بھیڑ پر ڈھیلے مارنے شروع کر دیے تھے۔ شاید انہیں میں کا ایک ڈھیلا سات آٹھ سال کے لڑکے وکی اگروال کو لگ گیا تھا، جسے بعد میں کئی ٹانکے لگے تھے۔ سستے کا کہنا تھا کہ اس کے بعد جھُنڈ زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ وہ ہلّا مچا رہے تھے اور چاروں طرف سے پتاجی پر پتھر مار رہے تھے۔ ڈھابے کے مالک سردار ستنام سنگھ نے بتایا کہ اُس وقت پتاجی کے جسم پر صرف پٹّے والی ایک چڈی تھی۔ دُبلے بدن کی ہڈیاں اور چھاتی کے سفید بال دِکھ رہے تھے۔ پیٹ پچکا ہوا تھا، وہ دھُول اور مٹّی میں لتھڑے ہوئے تھے، سر کے سفید بال بکھر گئے تھے، داہنی آنکھ کے اوپر سے اور نچلے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ ستنام سنگھ نے دکھ اور افسوس کے ساتھ کہا، "میرے کو کیا معلوم تھا کہ یہ آدمی سیدھا سادا، عزّت دار، ساکھ رسوخ کا انسان ہے اور نصیب کے پھیر میں اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔" ویسے ڈھابے میں کپ پلیٹ دھونے والے نوکر ہَری کا کہنا تھا کہ بیچ بیچ میں پتاجی بھیڑ کو انٹ شنٹ گالیاں دے دے کر ڈھیلے مارنے لگتے تھے۔ "آؤ سسرو، آؤ۔۔۔ ایک ایک کو مار ڈالوں گا بھوسڑی والو۔۔۔ تمہاری ماں کی۔۔۔" لیکن مجھے شک ہے کہ پتاجی نے ایسی کوئی گالی دی ہوگی۔ ہم نے کبھی بھی انہیں گالی دیتے نہیں سُنا تھا۔

میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، کیوں کہ پتاجی کو میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں، کہ اِس وقت تک اُنہیں کئی بار لگا ہوگا کہ اُن کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حقیقت نہیں ہے، ایک خواب

ہے۔ پتاجی کو وہ سارے واقعات اُول جلول، اُوٹ پٹانگ اور بے مطلب لگے ہوں گے۔ وہ اس سب پر اعتبار نہیں کر رہے ہوں گے۔ انھوں نے سوچا ہو گا کہ یہ سب کیا بکواس ہے۔ وہ تو گاؤں سے شہر آئے ہی نہیں ہیں، اُنھیں کسی ترچھ نے نہیں کاٹا ہے۔ بلکہ ترچھ تو ہوتا ہی نہیں ہے، ایک من گھڑت اور اندھا اعتقاد ہے۔۔۔ اور دھتورے کا کاڑھا پینے کی بات تو مضحکہ خیز ہے، وہ بھی ایک تیلی کے کھیت میں اس کا پودا کھوج کر۔ انھوں نے سوچا ہو گا اور پایا ہو گا کہ بھلا اُن پر کوئی مقدمہ کیوں چلے گا۔ اُنھیں عدالت جانے کی کیا ضرورت ہے۔

میں جانتا ہوں کہ سُرنگ جیسا لمبا، حیران کن لیکن ڈراونا خواب جیسا مجھے آتا تھا، پتاجی کو بھی آتا رہا ہو گا۔ میری اور اُن کی بہت سی باتیں بالکل ملتی جلتی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس وقت تک پتاجی پوری طرح سے مان چکے ہوں گے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، سب جھوٹ اور ناقابلِ یقین ہے۔ اس لیے وہ بار بار اس خواب سے جاگنے کی کوشش بھی کرتے رہے ہوں گے۔ اگر وہ بیچ بیچ میں زور زور سے کچھ بولنے لگتے تھے، یا شاید گالیاں بکنے لگتے تھے تو اسی کٹھن کوشش میں کہ وہ اس آواز کے سہارے اس ڈراونے خواب سے باہر نکل آئیں۔ نیشنل ریسٹورنٹ کے نوکروں اور مالک سردار ستنام سنگھ نے جو کچھ بتایا تھا اس کے مطابق اُس جگہ پتاجی کو بہت چوٹیں آئی تھیں۔ اُن کی کنپٹی، ماتھے، پیٹھ اور بدن کے دوسرے حصّوں پر کئی اینٹیں اور ڈھیلے آ کر لگے تھے۔ سڑک کا ٹھیکا لینے والے ٹھیکے دار اَروڑا کے بیس پچیس سال کے لڑکے مٹھو نے اُنھیں دو تین بار لوہے کی راڈ سے بھی مارا تھا۔ سچّے کا تو کہنا تھا کہ اتنی چوٹوں سے کوئی بھی آدمی مر سکتا ہے۔

مجھے یہ سوچ کر ایک عجیب سی راحت ملتی ہے اور میری پھنستی ہوئی سانس پھر سے ٹھیک ہو جاتی ہے کہ اُس وقت پتاجی کو کوئی درد محسوس نہیں ہوتا رہا ہو گا۔ کیوں کہ وہ اچھی طرح سے، پوری منطقیت اور گہرائی کے ساتھ، یقین کرنے لگ گئے ہوں گے کہ یہ سب خواب ہے اور جیسے ہی وہ جاگیں گے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آنکھ کھلتے ہی آنگن بُہارتی ماں نظر آ جائے گی یا نیچے فرش پر سوتے ہوئے مَیں اور چھوٹی بہن دِکھ جائیں گے۔۔۔ ہو سکتا ہے اُنھیں بیچ بیچ میں اپنے اِس عجیب و غریب خواب پر ہنسی بھی آئی ہو۔

اگر پتاجی نے غصّے میں لڑکوں کی طرف خود بھی ڈھیلے مارنے شروع کر دیے تو اس کے پیچھے پہلی وجہ تو یہی تھی کہ اُنھیں یہ بہت اچھی طرح سے پتا تھا کہ یہ ڈھیلے خواب کے اندر جا رہے ہیں اور ان سے کسی کو کوئی چوٹ نہیں آئے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پوری طاقت سے ڈھیلا مار کر وہ بے تابی اور بے چینی سے یہ انتظار کرتے رہے ہوں کہ جیسے ہی وہ جا کر کسی لڑکے کے سر سے ٹکرائے گا، اُس کا ماتھا پھٹ ہو گا اور ایک ہی جھٹکے میں اس ڈراونے خواب کے ٹکڑے بکھر جائیں گے اور چاروں طرف سے حقیقی دنیا کی بے تحاشا روشنی اندر آنے لگے گی۔ اُن کا زور زور سے چیخنا بھی دراصل غصّے کی وجہ سے نہیں تھا، وہ اصل میں مجھے، چھوٹی بہن کو، ماں کو یا کسی کو بھی پکار رہے تھے کہ اگر وہ اپنے آپ اس خواب سے جاگ پانے میں کامیاب نہ ہو پائیں تب بھی، کوئی آ کر اُنھیں جگا دے۔

ایک سب سے بڑی بد قسمتی بھی اسی بیچ ہوئی۔ ہمارے گاؤں کی گرام پنچایت کے سرپنچ اور پتاجی کے بچپن کے پُرانے دوست پنڈت کندھی رام تیواری لگ بھگ ساڑھے تین بجے نیشنل ریسٹورنٹ کے سامنے، سڑک سے گزرے تھے۔ وہ رکشے پر تھے۔ اُنھیں اگلے چوراہے پر سے بس لے کر گاؤں لوٹنا تھا۔ انھوں نے اُس ڈھابے کے سامنے اکٹھی بھیڑ کو بھی دیکھا اور اُنھیں یہ پتا بھی چل گیا کہ وہاں پر کسی آدمی کو مارا جا رہا ہے۔ ان کی یہ خواہش بھی ہوئی کہ وہاں جا کر دیکھیں کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ اُنھوں نے رکشار کوا بھی لیا۔ لیکن اُن کے پوچھنے پر کسی نے کہا کہ کوئی پاکستانی جاسوس پکڑا گیا ہے جو پانی کی ٹنکی میں زہر ڈالنے جا رہا تھا، اُسی کو لوگ مار رہے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت پنڈت کندھی رام کو گاؤں جانے والی بس آتی ہوئی دکھی اور انھوں نے رکشے والے سے اگلے چوراہے تک جلدی جلدی رکشا بڑھانے کے لیے کہا۔ گاؤں جانے والی یہ آخری بس تھی۔ اگر اس بس کے آنے میں تین چار منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ یقیناً وہاں جا کر پتاجی کو دیکھتے اور اُنھیں پہچان لیتے۔ صوبائی ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی وہ بس آدھا پون گھنٹا لیٹ رہا کرتی تھی لیکن اُس دن، اتفاق سے، وہ بالکل صحیح وقت پر آ رہی تھی۔

ستنام سنگھ کا کہنا تھا کہ وہ بھیڑ نیشنل ریسٹورنٹ کے سامنے سے تب ہٹی اور لوگ تتر بتر ہوئے جب بڑی دیر تک پتاجی زمین سے اُٹھے ہی نہیں۔ اینٹ کا ایک بڑا سا ڈھیلا اُن کی کنپٹی پر آ کر لگا تھا۔ اُن کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا تھا۔ سر میں بھی چوٹیں تھیں۔ ستنام سنگھ نے بتایا کہ جب پتاجی بہت دیر تک نہیں ہلے جُلے تو لڑکوں کے جھُنڈ میں سے کسی نے کہا کہ لگتا ہے یہ مر گیا۔ جب بھیڑ چھٹنے کے دس پندرہ منٹ بعد بھی پتاجی نہیں ہلے جُلے تو ستنام سنگھ نے ستّے سے کہا تھا کہ وہ ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر دیکھے کہ اگر وہ صرف بے ہوش ہیں تو ہو سکتا ہے کہ اُٹھ جائیں۔ لیکن ستّا پولیس کی وجہ سے ڈر رہا تھا۔ بعد میں ستنام سنگھ نے خود ہی ایک بالٹی پانی اُن کے اوپر ڈالا تھا۔ دور سے پانی ڈالنے کی وجہ سے زمین کی مٹی گیلی ہو کر پتاجی کے بدن سے لتھڑ گئی تھی۔

سردار ستنام سنگھ اور ستّے دونوں کا کہنا تھا کہ لگ بھگ پانچ بجے تک پتاجی اُسی جگہ پڑے ہوئے تھے۔ تب تک پولیس نہیں آئی تھی۔ پھر ستنام سنگھ نے سوچا کہ کہیں اُسے پنچ نامہ اور گواہی وغیرہ میں نہ پھنسنا پڑ جائے، اس لیے اُس نے ڈھابا بند کر دیا تھا اور ڈیلائٹ ٹاکیز میں "آن ملو سجنا" فلم دیکھنے چلا گیا تھا۔

اُس وقت لگ بھگ چھ بجے تھے جب سول لائنز کی سڑک کی پٹریوں پر ایک قطار میں بنی موچیوں کی دکانوں میں سے ایک موچی گنیشوا کی گمٹی میں پتاجی نے اپنا سر گھسیڑا۔ اس وقت تک ان کے جسم میں چڈی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل کسی چوپائے کی طرح رینگ رہے تھے۔ بدن پر کالک اور کیچڑ لگی ہوئی تھی اور جگہ جگہ چوٹیں تھیں۔

گنیشوا ہمارے گاؤں کے تالاب کے پار والے ٹیلے کا موچی ہے۔ اس نے بتایا کہ میں بہت ڈر گیا

اور ماسٹر صاحب کو پہچان ہی نہیں پایا۔ اُن کا چہرہ ڈراونا ہو گیا تھا اور چہنائی میں نہیں آتا تھا۔ میں ڈر کر گمٹی سے باہر نکل آیا اور شور مچانے لگا۔ دوسرے موچیوں کے علاوہ وہاں کچھ اَور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ لوگوں نے جب گنیشوا کی گمٹی میں آ کر جھانکا تو گمٹی کے اندر، اس کے سب سے اندر کے کونے میں، ٹوٹے پھوٹے جوتوں، چمڑے کے ٹکڑوں، ربڑ اور چیتھڑوں کے بیچ پتاجی دبکے ہوئے تھے۔ اُن کی سانس تھوڑی بہت چل رہی تھی۔ اُنھیں وہاں سے کھینچ کر باہر، پٹری پر نکالا گیا۔ تبھی گنیشوا نے اُنھیں پہچان لیا۔ گنیشوا کا کہنا تھا کہ اُس نے پتاجی کے کان میں کچھ آوازیں بھی لگائیں لیکن وہ کچھ بول نہیں پا رہے تھے۔ بہت دیر بعد انھوں نے "رام سوارتھ پرساد۔۔۔" اور "بکیلی" جیسا کچھ کہا تھا۔ پھر چپ ہو گئے تھے۔

پتاجی کی موت سوا چھ بجے کے آس پاس ہوئی تھی۔ تاریخ تھی ۱۷ مئی ۱۹۷۲۔ چوبیس گھنٹے پہلے لگ بھگ اسی وقت اُنھیں جنگل میں ترچھ نے کاٹا تھا۔ چوبیس گھنٹے پہلے کیا پتاجی ان واقعات اور اس موت کا اندازہ کر سکتے تھے؟

پولیس نے پتاجی کی لاش شہر کے مردہ گھر میں رکھوا دی تھی۔ پوسٹ مارٹم میں پتا چلا تھا کہ اُن کی ہڈیوں میں کئی جگہ فریکچر تھا، دائیں آنکھ پوری طرح پھوٹ چکی تھی، کالر بون ٹوٹی ہوئی تھی۔ اُن کی موت دماغی صدمے اور زیادہ خون بہہ جانے کے سبب سے ہوئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق اُن کا معدہ خالی تھا، پیٹ میں کچھ نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ دھتورے کے بیجوں کا کاڑھا اُلٹیوں کے ذریعے پہلے ہی نکل چکا تھا۔

حالاں کہ تھانو کہتا ہے کہ اب تو یہ طے ہو گیا کہ ترچھ کے زہر سے کوئی نہیں بچ سکتا؛ ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد اُس نے اپنا کرشمہ دکھایا اور پتاجی کی موت ہوئی۔ پنڈت رام اوتار بھی یہی کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پنڈت رام اوتار اس لیے ایسا کہتے ہوں کہ وہ خود کو یقین دلانا چاہتے ہوں کہ دھتورے کے بیجوں کا پتاجی کی موت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں سوچتا ہوں، اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں کہ شاید آخر میں، جب گنیشوا نے اپنی گمٹی کے باہر پتاجی کے کان میں آواز دی ہو گی تو پتاجی خواب سے جاگ گئے ہوں گے۔ اُنھوں نے مجھے، ماں کو اور چھوٹی بہن کو دیکھا ہو گا، پھر وہ دانتن لے کر ندی کی طرف چلے گئے ہوں گے۔ ندی کے ٹھنڈے پانی سے اُنھوں نے اپنا چہرہ دھویا ہو گا، کلّا کیا ہو گا، اور اس لمبے ڈراونے خواب کو بھول گئے ہوں گے۔ اُنھوں نے عدالت جانے کے بارے میں سوچا ہو گا۔ ہم لوگوں کے مکان کی فکر نے اُنھیں پریشان کیا ہو گا۔

لیکن میں اپنے خواب کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو مجھے اکثر آتا ہے۔ وہ یوں ہے کہ میں کھیتوں کی پگڈنڈی، گاؤں کی پگڈنڈی سے ہوتا ہوا جنگل پہنچ گیا ہوں۔ میں رکسا نالے، کیکر کے پیڑ کو دیکھتا ہوں۔ وہ بھوری چٹان وہاں، اُسی جگہ ہے جو ساری بارش نالے کے پانی میں ڈوبی رہتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ترچھ کی لاش اُس کے اوپر پڑی ہوئی ہے۔ مجھے ایک بے تحاشا خوشی اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے۔ آخر وہ مارا گیا۔ میں پتھر لے کر ترچھ کو کچلنے لگتا ہوں، زور زور سے اُسے مارتا ہوں۔ میرے پاس تھانو

مٹی کا تیل اور ماچس لیے کھڑا ہے۔ تبھی، اچانک ہی میں پاتا ہوں کہ مَیں اُس چٹان پر نہیں ہوں۔ تھائو بھی وہاں نہیں ہے۔ وہاں کوئی جنگل نہیں ہے بلکہ میں دراصل شہر میں ہوں۔ میرے کپڑے بہت ہی میلے، پھٹے اور چیتھڑوں جیسے ہو گئے ہیں۔ میرے گالوں کی ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں، بال بکھرے ہیں۔ مجھے پیاس لگی ہے اور میں بولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاید میں بکبکی، اپنے گھر جانے کا راستا پوچھنا چاہتا ہوں اور تبھی اچانک چاروں طرف شور اُٹھتا ہے۔۔۔ گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔۔۔ ہزاروں ہزاروں گھنٹیاں۔۔۔ میں بھاگتا ہوں۔

میں بھاگتا ہوں۔۔۔ میرا جسم بے دَم ہونے لگتا ہے، پھیپھڑے پھُول جاتے ہیں۔ میں پاس پاس قدم رکھ کر اچانک لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا ہوں۔ اُڑنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن لگتا ہے بھیڑ میرے پاس پہنچنے والی ہوتی ہے۔ ایک عجیب سی، گرم اور بھاری ہَوا مجھے سُن کر دیتی ہے۔ اپنے قتل کی سانسیں مجھے چھُونے لگتی ہیں۔۔۔ اور آخر کار وہ پل آجاتا ہے جب میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہوتا ہے۔۔۔

میں روتا ہوں۔۔۔ بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا پورا بدن نیند میں ہی پسینے میں ڈوب جاتا ہے۔ میں زور زور سے بول کر جاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔۔۔ میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ یہ خواب ہے۔۔۔ اور ابھی آنکھ کھولتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ میں خواب کے اندر اپنی آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا ہوں۔۔۔ دور تک۔۔۔ لیکن وہ پل آخر آ ہی جاتا ہے۔۔۔

ماں باہر سے مجھے دیکھتی ہیں۔ میرا ماتھا سہلا کر وہ مجھے رضائی سے ڈھانپ دیتی ہیں اور میں وہاں اکیلا چھوڑ دیا جاتا ہوں۔ اپنی موت سے بچنے کی کوشش میں جُوجھتا، بے دَم ہوتا، روتا، چیختا اور بھاگتا۔

ماں کہتی ہیں مجھے اب بھی نیند میں بڑبڑانے اور چیخنے کی عادت ہے۔ لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں، اور یہی سوال مجھے ہمیشہ پریشان کرتا ہے، کہ مجھے آخر اَب ترچھ کا خواب کیوں نہیں آتا۔

**

لکھنے والوں کا تعارف

امر کانت

جولائی ۱۹۲۵ میں گاؤں نگرا، ضلع بلیا، اُتر پردیش، میں پیدا ہوئے۔ بلیا اور گورکھپور میں تعلیم پائی لیکن ۱۹۴۲ میں آزادی کی تحریک میں شامل ہونے سے تعلیم کا سلسلہ ادھورا رہ گیا۔ آخر ۱۹۴۷ میں الہ آباد کالج سے بی اے کیا اور اس کے بعد آگرہ کے روزنامہ "سینک" کے ادارتی شعبے میں ملازم ہوئے۔ وہیں کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا اور ترقی پسند ادیبوں کی انجمن میں شامل ہوئے۔ بعد میں الہ آباد کے کئی اخباروں اور ایک ماہانہ رسالے "کہانی" کی ادارت سے وابستہ رہے۔ اُن کی کہانی "ڈپٹی کلکٹری" کو ایک مقابلے میں اعزاز کا مستحق قرار دیا گیا۔ کہانیوں کے مجموعے: "زندگی اور جونک"، "دیش کے لوگ"، "موت کا نگر"، "مترملن" اور "کُہاسا"۔ ناول: "سوکھا پتا"، "آکاش پکشی"، "کالے اُجلے دن"، "سکھ جیوی"، "بیچ کی دیوار" اور "گرام سیوکا"۔

رام کمار

۱۹۲۴ میں شملہ میں پیدا ہوئے۔ کئی ناول، کہانیوں کے مجموعے اور سفرنامے شائع ہو چکے ہیں۔ رام کمار کی ایک حیثیت مصوّر کی بھی ہے۔ انھوں نے دو برس پیرس میں آرٹ کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گزارے۔ ان کی تصویروں کی نمائشیں ہندوستان، یوروپ اور امریکا میں ہو چکی ہیں۔

اُشا پریم ودا

اُشا پریم ودا نے الہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم کیا اور بعد میں اسی یونیورسٹی میں پڑھایا بھی۔ اس کے علاوہ وہ لیڈی شری رام کالج، دلّی، سے بھی کئی سال وابستہ رہیں۔ اب کئی برس سے یونیورسٹی آف وسکانسن، میڈیسن، میں پڑھاتی ہیں۔ ان کے دو ناول اور کہانیوں کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے میرابائی کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

راجیندر یادو

اگست ۱۹۲۹ میں آگرہ، اُتر پردیش، میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم مکمل کی اور ۱۹۵۱ میں ایم اے کیا۔ پہلی تحریر "پرتی ہنسا" (کہانی) ۱۹۴۷ میں چھپی۔ تب سے لکھنا ہی کل وقتی مشغلہ ہے۔ نوکری کبھی نہیں کی۔ دس برس کلکتے میں رہے۔ ۱۹۶۴ سے دلّی میں رہ رہے ہیں۔ ۱۹۶۹ میں کتابوں کی اشاعت شروع کی اور اپنا ادارہ "اکشر

پرکاشن" قائم کیا۔ ان کے ناول "سارا آکاش" پر اسی نام سے فلم بھی بن چکی ہے۔ ۱۹۸۶ سے الہ آباد سے شائع ہونے والے ماہنامہ "ہنس" کے مدیر ہیں۔ ترگنیف، چیخوف اور کامیو کی تحریروں کے ہندی ترجمے بھی کر چکے ہیں۔ کہانیوں کے مجموعے: "دیوتاؤں کی مرتیو"، "کھیل کھلونے"، "جہاں لکشمی قید ہے"، "ابھیمنیو کی آتم ہتیا"، "چھوٹے چھوٹے تاج محل"، "کنارے سے کنارے تک"، "ٹوٹنا"، "ڈھول"، "اپنے پار"، "وہاں تک پہنچنے کی دوڑ"، "چوکھٹے توڑتے ترکون"۔ ناول: "سارا آکاش"، "اکھڑے ہوئے لوگ"، "شہ اور مات"، "کلٹا"، "ایک انچ مسکان" (منو بھنڈاری کے ساتھ)، "ان دیکھے ان جان پل"، "منتر ودھ"۔ شاعری کا مجموعہ: "آواز تیری ہے"۔ خود نوشت سوانح: "اوروں کے بہانے"۔ اس کے علاوہ تنقید اور متفرق مضامین پر مشتمل کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

موہن راکیش

۱۹۲۵ میں امرتسر، پنجاب، میں پیدا ہوئے۔ ہندو کالج، امرتسر، اور اورینٹل کالج، لاہور، میں تعلیم پائی۔ انھوں نے ہندی اور سنسکرت میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد الفنسٹن کالج، بمبئی، اور ڈی اے وی کالج، جالندھر، کے ہندی شعبے میں استاد رہے۔ بارہ سال تدریس کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے کر کل وقتی ادیب کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ جالندھر اور دلّی میں ادارتی سرگرمیوں میں مشغول رہے اور ایک برس تک "ساریکا"، بمبئی، کے ایڈیٹر رہے۔ موہن راکیش کی تحریر کا آغاز ۱۹۴۴ میں ہوا۔ انھیں "نئی کہانی" کی تحریک کی نمایاں شخصیات میں شامل کیا جاتا ہے۔ ان کے کئی ناول اور کہانیوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہندی تھیئٹر کے بھی بہت اہم رکن رہے۔ ان کا کھیل "آدھے ادھورے" کئی زبانوں میں کھیلا جا چکا ہے۔

بھیشم ساہنی

۱۹۱۵ میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ اسکول کی تعلیم وہیں مکمل کی۔ گورنمنٹ کالج، لاہور، سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ پھر راولپنڈی واپس آ کر وہاں کے ایک کالج میں پڑھانا شروع کیا اور انڈین نیشنل کانگریس کی سرگرمیوں میں شامل رہے۔ ۱۹۴۷ میں ہندوستان ہجرت کر کے دلّی میں قیام اختیار کیا اور کالج میں پڑھانے لگے۔ ۱۹۵۳ میں ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "بھاگیہ ریکھا" شائع ہوا۔ ۱۹۵۷ میں بھیشم ساہنی غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر سے وابستہ ہو کر ماسکو چلے گئے۔ سات سالہ قیامِ روس کے دوران انھوں نے بیس روسی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ ۱۹۶۳ میں ہندوستان لوٹ کر تدریس کا پیشہ دوبارہ اختیار کیا۔ ۱۹۶۵ سے ۱۹۶۷ تک بھیشم ساہنی ایک ہندی رسالے "نئی کہانیاں" کے مدیر رہے۔ ۱۹۷۵ میں انھیں ناول "تمس" پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ (گووند نہلانی نے اس ناول پر ایک ٹی وی سیریل تیار کیا۔) اس کے علاوہ بھیشم ساہنی کو افروایشیائی ادیبوں کی انجمن کا لوٹس ایوارڈ اور سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ ناول: "تمس"، "بسنتی"، "جھروکے"، "میّاداس کی ماڑی"۔ اس کے علاوہ بھیشم ساہنی کی کہانیوں کے آٹھ مجموعے، اور تین ڈرامے اور ان کی لکھی ہوئی ان کے بھائی اور مشہور اداکار بلراج ساہنی کی سوانح شائع ہو چکی ہے۔

نرمل ورما

۱۹۲۹ میں شملہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن پہاڑوں پر گزرا۔ سینٹ اسٹیفنز کالج، دلی، سے تاریخ میں ایم اے کیا۔ کچھ عرصے کے لیے استاد رہے۔ ۱۹۵۹ میں انھیں چیکوسلووا کیا کی ادیبوں کی انجمن کی دعوت پر پراگ جانے کا موقع ملا۔ وہ چیکوسلواکیا میں سات برس رہے اور اس دوران انھوں نے کئی چیک تحریروں کے ہندی ترجمے کیے۔ پھر کچھ برس لندن میں گزرے۔ بیرونِ ملک قیام کے عرصے میں "ٹائمز آف انڈیا" کے لیے اُن ملکوں کے ثقافتی اور سیاسی مسائل پر مضمون اور رپورتاژ لکھے۔ ۱۹۷۲ میں ہندوستان واپس آئے اور انڈین انسٹیٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز، شملہ، کے فیلو رہے۔ ۱۹۷۷ میں انٹرنیشنل رائٹرز پروگرام، آیووا، امریکا، میں حصہ لیا۔ ان کی کہانی "مایا درپن" پر فلم بنی جسے بہترین ہندی فلم کا اعزاز ملا۔ آج کل دلی سے نکلنے والے انگریزی سہ ماہی جریدے "یاترا" کی ادارت میں شامل ہیں۔ نرمل ورما کی تحریروں کے ترجمے بہت سی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ان کے منتخب افسانوں کے اردو ترجموں پر مشتمل کتاب ساہتیہ اکادمی، دلی، سے شائع ہونے والی ہے۔ افسانوں کے مجموعے: "پرندے"، "جلتی جھاڑی"، "پچھلی گرمیوں میں"، "بیچ بحث میں"، "کوّے اور کالا پانی"۔ ناول: "وے دن"، "لال ٹین کی چھت"، "ایک چیتھڑا سکھ"، "رات کا رپورٹر"۔ ڈرامے: "تین ایکانت"۔ مضامین: "چیڑوں پر چاندنی"، "شبد اور سرتی"، "ہر بارش میں"، "کلا کا جوکھم"۔

شانی

اصل نام گلشیر خاں۔ مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے۔ ہندی کے ایک اہم فکشن نگار ہونے کے علاوہ ساہتیہ اکادمی، دلی، کے ماہانہ رسالے "سمکالین بھارتیہ ساہتیہ" (معاصر ہندوستانی ادب) کے مدیر ہیں۔

اصغر وجاہت

ہندی کے افسانہ نگار اور ڈراما نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہندی شعبے سے وابستہ ہیں۔

منّو بھنڈاری

اپریل ۱۹۳۱ میں بھان پورہ، مدھیہ پردیش، میں پیدا ہوئیں۔ بچپن اجمیر میں گزرا۔ بنارس یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ عملی زندگی کلکتے اور دلی میں بسر ہوئی۔ انھوں نے اپنے شوہر راجیندر یادو کے ساتھ مل کر ایک ناول "ایک انچ مسکان" بھی لکھا۔ منّو بھنڈاری کی کئی کہانیوں پر ڈرامے اور فلمیں بھی بن چکی ہیں جن میں کہانی "ترشنکو" بھی شامل ہے۔ کئی ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں ان کی تحریروں کے ترجمے ہوئے ہیں۔ کہانیوں کے مجموعے: "میں ہار گئی"، "تین نگاہوں کی ایک تصویر"، "ایک پلیٹ سیلاب"، "یہی سچ ہے" اور "ترشنکو"۔ ناول: "ایک انچ مسکان"، "آپ کا بنٹی"، "سوامی"، "مہابھوج"، "آس ماترا"۔ ڈرامے: "بنا دیواروں کے گھر"، "مہابھوج"۔

Scanned with CamScanner

راجی سیٹھ

اکتوبر ۱۹۳۵ میں نوشہرہ، صوبہ سرحد، میں پیدا ہوئیں۔ اب دلی میں رہتی ہیں۔ لکھنے کا آغاز ۱۹۷۵ میں کیا۔ کہانیوں کے مجموعے: "اندھے موڑ سے آگے"، "تیسری ہتھیلی"۔

سوَدیش دیپک

اگست ۱۹۴۲ میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۷۰ سے گاندھی میموریل کالج، انبالہ چھاؤنی، میں پڑھا رہے ہیں۔ لکھنے کی ابتدا ۱۹۶۰ کی دہائی میں کی۔ کہانیوں کے مجموعے: "آشوارو ہی"، "ماتم"، "تماشا"۔ ناول: "نمبر ستاون اسکواڈرن"، "مایا پوت"۔

گووِند مِشر

اگست ۱۹۳۹ میں باندا، اتر پردیش، میں پیدا ہوئے۔ انگریزی میں ایم اے کیا۔ کہانیوں کے مجموعے: "رگڑ کھاتی آتم بتیائیں"، "نئے پرانے ماں باپ"، "انت پور"، "دھانتو"، "خود کے خلاف"، "خاک اتہاس"، "اپاہج"۔ ناول: "وہ اپنا چہرہ"، "اترتی ہوئی دھوپ"، "لال پیلی زمین"، "حضور دربار"، "تمہاری روشنی میں"۔ سفرنامے: "دھند بھری سُرخی"، "دروازوں کے پار شام"۔

عبدل بسم اللہ

جولائی ۱۹۴۹ میں بلاپور، الہ آباد، میں پیدا ہوئے۔ ہندی ادب میں ایم اے اور ڈی لٹ کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دلی، کے ہندی شعبے میں استاد ہیں۔ کہانیوں کا مجموعہ: "دو چھوٹے بُتوں کا بیان"۔ ناول: "جھینی جھینی بینی چدریا"، "سر شیش ہے"، "زہر باد"، "دنت کتھا"۔ نظموں کے مجموعے: "ٹوٹا ہوا پنکھ"، "کتنے کتنے سوال"۔

شری لال شُکل

۱۹۲۵ میں لکھنؤ، اتر پردیش، کے ایک قریبی گاؤں آتروَلی میں پیدا ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد سول سروس میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۵۷ میں ان کا پہلا ناول شائع ہوا اور کچھ ہی عرصے بعد طنزیہ کہانیوں کا ایک مجموعہ۔ ان کا شاہکار ناول "راگ درباری" ۱۹۶۸ میں شائع ہوا اور ۱۹۷۰ میں اسے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ اس کے بعد سے ان کے کئی ناول، کہانیوں، مضامین اور طنزیہ خاکوں کے مجموعے، بھگوتی چرن ورما کی سوانح وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔ شری لال شکل اب ریٹائر ہو چکے ہیں اور لکھنؤ میں رہتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

گیان رنجن

نومبر ۱۹۳۶ میں اکولا، مہاراشٹر، میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد رام ناتھ سُمن تحریکِ آزادی میں شریک ادیب، صحافی اور سماجی کارکن تھے۔ گیان رنجن استاد ہونے کے علاوہ ہندی کے ایک اہم ادبی رسالے "پہل" کے مدیر اور ناشر بھی رہے۔ انھیں معاصر ہندی ادب کی ساتویں دہائی میں اُبھرنے والی نسل کا ایک اہم کہانی کار سمجھا جاتا ہے اور ان کی کہانیوں کے ترجمے کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ کہانیوں کے مجموعے: "فینس کے اِدھر اُدھر"، "یاترا"، "سپنا نہیں" اور "کٹن جیوی"۔

اُدے پرکاش

جنوری ۱۹۵۲ میں چھتیس گڑھ آنچل کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دلی، میں تعلیم مکمل کی۔ شاعر اور کہانی کار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا پبلیکیشنز کے ہندی رسالے "دِنمان" کے ادارتی عملے میں شامل ہیں۔ ۱۹۸۱ میں نظم "تبت" پر بھارت بھوشن اگروال ایوارڈ اور ۱۹۸۳ میں کہانیوں کے مجموعے "دریائی گھوڑا" پر اوم پرکاش ایوارڈ پایا۔ کہانیوں کا مجموعہ: "دریائی گھوڑا"۔ نظموں کے مجموعے: "سنو کاریگر"، "ابو تر کبوتر"۔

**

آپ کی خوشحالی کے لیے ایک نیا منصوبہ
نیشنل بینک
ماہانہ آمدنی اسکیم
اس اسکیم میں کم از کم دس ہزار اور زیادہ سے
زیادہ جتنی رقم چاہیں جمع کرائیں اور متوقع
منافع بحساب ۱۲٫۹۶ فیصد سالانہ کے حساب سے حاصل کریں۔
جمع شدہ رقوم پر حکومت پاکستان کی ضمانت
تفصیلات کے لیے بینک کی کسی بھی شاخ سے رجوع کریں
آپ کی خدمت ہمارا مقصد
نیشنل بینک آف پاکستان
Telephones: 2417989 - 2416781 - 10 lines Ext. 405
Fax 2421236 - Telex 23732 NBP PK
UNITED

آج

سالانہ خریداری

پاکستان
چار شماروں کی قیمت: ۲۰۰ روپے
آٹھ شماروں کی قیمت: ۳۵۰ روپے

بینک ڈرافٹ کے ذریعے رقم بھیجنے کے لیے پتا
B-140, Sector 11-B,
North Karachi Township, Karachi 75850

امریکا، کینیڈا، یوروپ اور مشرقِ وسطیٰ
چار شماروں کی قیمت: ۲۵ امریکی ڈالر
آٹھ شماروں کی قیمت: ۴۵ امریکی ڈالر

رقم بھیجنے کے لیے پتا
Dr Muhammad Umar Memon
5417, Regent Street,
Madison, Wisconsin 53705, USA.

Scanned with CamScanner

لاطینی امریکا کے ملک کولومبیا سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتہ ادیب

گابریئل گارسیا مارکیز

کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب

دو مکمل ناول

"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد"

تیرہ منتخب کہانیاں

دو ناولوں "تنہائی کے سو سال" اور "وبا کے دنوں میں محبت" کے منتخب ابواب

مارکیز کی نوبیل انعام پیش کیے جانے کے موقعے کی تقریر اور ایک اہم مضمون

مارکیز کے فن پر دو مغربی نقادوں کے مضامین

اپنی زندگی، فن اور خیالات پر مارکیز کی ایک طویل گفتگو

مارکیز کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کے بارے میں

ان کے ایک ہم وطن دوست ادیب کی ایک طویل تحریر

قیمت: ۲۰۰ روپے

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

قیمت : [illegible] روپے

آج کی کتابیں
بی ۳۰۵، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

تقسیم کار
مکتبہ دانیال، صدر، کراچی
ٹامس اینڈ ٹامس بک سیلرز، صدر، کراچی
کلاسیک، شاہراہ قائد اعظم، لاہور
پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، نوسال، لاہور